بسلامت روی

کرنل محمد خاں

بسلامت روی

کرنل محمد خاں

شاعر کی نوا ہو کہ مُغنّی کا نفس ہو

جس سے چمن افسردہ ہو وُہ بادِ سَحر کیا

(اقبال)

فہرست

مقدمہ

من آنم

چند روز ہوئے ایک پروفیسر صاحب کا خط آیا۔ لکھا تھا۔

محترمی کسی نے آپ کی 'بجنگ آمد' کو بھی مدرسہ میں پہنچا دیا ہے۔ یعنی اس کا ایک باب انٹرمیڈیٹ کے نصابِ اُردُو میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن مرتبین مرقع نے آپ کا تعارف صرف دو سطروں میں کرایا ہے۔ جو طلبا کے لئے ناکافی ہے۔ پچھلے امتحان میں ایک سوال پوچھا گیا تھا۔ ''بجنگ آمد کے مصنّف کے حالاتِ زندگی دس سطروں میں بیان کرو۔'' ایک امیدوار کا جواب ملاحظہ ہو:

''محمدّ خان کے بچپن کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جب جوان ہوا تو دُوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اور یہ سکول سے بھاگ کر فوج میں بھرتی ہو گیا اور نیم لیفٹین ہو کر مصر جا پہنچا۔ وہاں اس نے کشتوں کے پُشتے لگا دیئے۔ پھر جنگ ختم ہو گئی تو اسے فوج سے نکال کر گھر بھیج دیا گیا۔ اس نے غصّے میں آکر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے مگر ڈاکو

شریف نکلا، یعنی امیروں کو لوٹا اور غریبوں میں بانٹ دیا۔ حکومت کو یہ بات اچھی نہ لگی اور اس کے پیچھے پولیس لگا دی گئی لیکن یہ اس کے ساتھ کئی سال آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ آخر ایک بھیدی نے اسے پکڑوا دیا اور صدر ایّوب نے اسے جیل میں ڈال دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ جیل سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تو تنگ آ کر بجنگ آمد لکھ ڈالی۔ مصنّف تو یہ جیسا ہے، سو ہے، مگر ڈاکو بارعب ہے۔ یہ لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔"

خط ختم کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب نے لکھا "مجھے شبہ ہے کہ آپ کے سوانح حیات میں کسی مقام پر آپ کا کوئی ہمنام 'شریک ہو گیا ہے۔ براہِ کرم ہمیں حالاتِ زندگی لکھ کر ممنون فرمائیں، ورنہ طلبا کو ۱۵ نمبروں کا گھاٹا رہے گا۔"

پروفیسر صاحب کو تو ہم نے ایک مناسب جواب دے دیا لیکن یہ حسرت دِل ہی میں رہے گی کہ کاش یہ افسانوی حالاتِ زندگی سچ مچ ہمارے ہی ہوتے، ورنہ کبھی ہماری ملاقات اپنے ہمنام سے جیل کے اندر یا باہر ہو گئی تو وُہ ہماری بے رنگ اور بنجر زندگی کو دیکھ کر ہمیں بجا طور پر طعنہ دے سکے گا کہ

---

۱ اشارہ ہے مشہور ڈاکو محمّد خان کی طرف جس نے ۶۹-۱۹۶۸ء میں کیمبل پور اور سرگودھا کے اضلاع میں رابن ہڈ کی یاد تازہ کر دی۔

کس مُنہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے جنگ باز [۲]

اے روسیاہ، مجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

کتابِ انیست

اما بعد پاکستان سے اڑ کر انگلستان جانا اور راہ میں آتے جاتے دو چار ملک دیکھ لینا کوئی ایسی کشور کشائی کی مہم نہیں کہ اس پر کتاب لکھ دی جائے۔ دُوسرے ہر سال سینکڑوں سوداگر، سمگلر اور سرکاری گماشتے ولایت جاتے ہیں اور واپسی پر کاروں اور ٹیلی ویژنوں کے علاوہ ایک سفر نامے کا مسودہ بھی ساتھ لے آتے ہیں۔ چنانچہ آج کل ہر دوسرا یا تیسرا قاری یا تو خود ایک سفر نامے کا مصنّف ہے اور یا مصنّف سے زیادہ دُنیا دیکھ چکا ہے۔ نتیجتاً اب سفر ناموں میں ان چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے مبالغوں اور دروغوں کی گنجائش نہیں جن کا علم صرف مصنّف اور خدا کو ہوتا تھا۔ اب آپ انگلستان کے باب میں ذرا سی رنگ آمیزی کریں تو تنہا میرپور سینکڑوں چشم دید گواہ پیش کر دے گا کہ مدعی کا بیان ضرورت سے زیادہ چست ہے یعنی وُہ رنگ جسے شوخ سُرخ دکھایا گیا

---

۲ سودا سے معذرت کے ساتھ

ہے، دراصل گدلا بھورا ہے۔ اب گواہوں کا ارشار بجا مگر گدلے بھورے رنگ کی سپاٹ سچائی سے زیادہ پھیکی جنس بھی تو کوئی نہیں۔ جو بات ٹیکنی کلر میں ہے وُہ بلیک اینڈ وائٹ میں کہاں؟ وُہ داستان کیا جسے زیبِ سے محروم کیا جائے؟ وُہ دلہن کیا جس نے سُرخ جوڑا نہ پہنا ہو؟

لیکن خوش قسمتی سے یہ کتاب سفر نامے سے زیادہ آدمی نامہ ہے۔ اس میں مقامات کا ذکر کم اور شخصیات کا زیادہ ہے۔۔۔ اور شخصیات کا رنگ وُہی ہوتا ہے جو مصنّف کو نظر آئے، نہ کہ جو میرپوریوں [۳] کو دکھائی دے۔۔۔ پھر شخصیات میں بھی اکثریت صنفِ لطیف کی ہے اور صنفِ لطیف میں تو یقیناً اکثریت حسینوں کی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ پیارے قاری ایسا اسلئے ہے کہ حسینوں سے ہمیں پیار ہے۔ حُسن کسی بشر میں ہو یا کسی منظر میں، کسی صورت میں ہو یا کسی سیرت میں، کسی رنگ میں ہو یا کسی آہنگ میں، حسن ہر روپ میں ہمارے دِل میں بلا روک اتر جاتا ہے۔

لیکن خفقان مرزا کی طرح آپ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ کیا سارے سفر میں تمہیں حسین ہی ملے؟ کیا کسی کج رو سے مڈھ بھیٹر نہ ہوئی؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ بے شک ایسا نہیں ہو

---

[۳] میرپور محض علامت ہے ورنہ مصنّف احبابِ میرپور کے لئے سراپا سپاس ہے۔

سکتا۔ میں حسینوں کے ساتھ ساتھ کئی ناگفتہ بہ خفقانی بھی ملے۔۔۔۔ لیکن بالعموم ہمارے حلقۂ سخن میں غلبہ حسینوں ہی کا رہا اور وُہ اس لئے کہ ہم نے چند گلہائے تر چن کر یادوں کا باقی کوڑا کرکٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس گل چینی میں ہم نے حسن کو معیار ٹھہرا کر کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس کے لئے معذرت کی ضرورت ہو۔ اگر کوئی صاحبِ حُسن سے الرجک ہوں تو ہم ان سے دوستانہ اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں اور شاید ایسوں کے ساتھ دوستی بھی زیادہ دیر نہ چل سکے۔

کسے کہ کشتہ شد از قبیلہ مانیست

داناؤں کا کہنا ہے کہ صیغہ واحد متکلّم میں لکھتے ہوئے خاکساری کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے کہ خودستائی شرفا کا شیوہ نہیں۔ ہمیں یہاں تک تو داناؤں سے اتفاق ہے۔ لیکن خاکساری سے آگے ایک اور منزل بھی ہے۔ ضرورت سے زیادہ خاکساری، نمائشی خاکساری۔ یہ خاکساری نہیں، مکاری ہے۔ یہ منافقت بیگم ہے، جو سٹیج پر آنے سے پہلے اپنی ریشمی ساڑی پر ملیشیا کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہر چند کہ ہمارا شیوہ عجز و انکسار ہے تاہم ہم نے اپنے لارنس پور کے سوٹ پر کوئی گریس آلودہ ڈانگری

نہیں پہنی۔ بلکہ اگر ہمارے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہو گیا ہے کہ مرداں چنیں کنند تو ہم نے تھوڑا سا فخر بھی کر لیا ہے۔ ضمیر واحد متکلّم کا مسلسل مار کھاتے رہنا بھی کوئی کمال نہیں:

قلم میں حلم بھی ہے ناز بھی وقار بھی ہے

ایک کتاب لکھنے سے پہلے ہمیں بارہا اپنے سفر کی ہلکی پھلکی روداد اپنے بے تکلّف دوستوں کی مجلس میں بیان کرنے کا اتفاق ہوا۔ پھر ایک دن یہی روداد تقریباً انہی الفاظ میں لکھنا شروع کر دی۔ بدیگر الفاظ یہ کتاب ہم نے دوستوں کی خاطر لکھی ہے۔ اگر آپ بھی اسے دوستانہ نگاہ سے دیکھیں تو ممکن ہے کُچھ محظوظ ہوں لیکن اگر آپ نے اسے ناقدانہ ہی دیکھنا ہے۔۔۔ اور آپ کو اس طرح دیکھنے کا پورا حق ہے۔۔۔ تو ہمیں خوف ہے کہ آپ شاید محظوظ تو ہوں یا نہ ہوں، آپ اپنا تنقیدی طیش ایک غلط کتاب پر ضائع کر دیں گے اور بے سبب ضائع کریں گے کیونکہ اس کتاب کو کسی دانائی یا یکتائی کا دعوی نہیں۔ یہ محض حلقۂ یاراں میں ایک یار کی داستان طرازی ہے اور اس خامی کے لئے ہم اہلِ دانش سے پیشگی معذرت خواہ ہیں۔ ویسے زندگی میں اہلِ دانش سے ہمارا اجتناب کلی بھی نہیں رہا۔ کبھی ہم مکتب جا نکلے، کبھی وُہ میخانے آ بیٹھے۔ سو ہو سکتا ہے کہ بے ارادہ کوئی

حکمت کی بات ہمارے قلم سے بھی نکل گئی ہو۔ اس پختگی کے لئے ہم اہلِ جنوں سے پیشگی شرمسار ہیں۔

کتاب کے غیر ملکی کرداروں سے ہماری باتیں زیادہ تر انگریزی زبان میں ہوئیں۔ لیکن کتاب اُردُو میں ہے لہٰذا ان کے مُنہ میں بھی اُردُو زبان رکھنا پڑی یعنی ہماری اپنی زبان۔ ان حالات میں اگر انہیں بھی کہیں میر و غالب کے حوالے سے بات کرتا پائیں تو ازراہِ کرم بہت زیادہ چراغ پا نہ ہوں۔ آخر آپ بھی حسبِ ضرورت شیکسپیر اور ورڈزورتھ پر دست درازی کر لیتے ہیں۔ ویسے ان لوگوں کی انگریزی ہماری اُردُو سے کم بلیغ نہ تھی۔ اس کے برعکس بعض مقامات پر انگریزی الفاظ یا جملوں کو دہرانے بغیر چارہ نہ تھا۔ امید ہے یہ زیادتی بھی آپ برداشت کریں گے۔

اکثر کرداروں کے نام اصلی ہیں لیکن چند ایک کو مصلحتاً فرضی نام دیئے گئے ہیں۔ اس عمل سے آپ کا کُچھ نہیں بگڑے گا لیکن کرداروں کا بھلا ہو جائے گا۔ فرنگی ناموں میں تو یُوں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ٹام نہ ہوا، ٹونی ہوا۔ روبی نہ ہوئی روزی ہوئی۔

نشیب و فراز

سفر میں مسافر کو لامحالہ نشیب و فراز پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن خدا جانے یہ اتفاق تھا یا قضاو قدر کا منصوبہ کہ ہمیں جملہ نشیب سفر کی تیاری یعنی پاکستان ہی میں پیش آ گئے اور اس تسلسل کے ساتھ کہ پہلے تین باب ان کی نذر کرنا پڑے۔ لیکن جونہی ہمارے طیارے نے کراچی سے پرواز کی ہمارے فرازوں کی ابتدا ہو گئی اور پھر چھ طویل بابوں میں ہمیں شاذ ہی کوئی نشیب نظر آیا۔ بے شک بابا باہو کا فرمودہ ہے کہ۔

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنہاں تھیں بھارے ہو

لیکن شاید بابا جی کے زمانے میں پردیس میں آغوش کھولے، شریں دہن، شعلہ بدن میزبان بھی نہیں ہوتے تھے ورنہ آج کے پردیسی سے پوچھیں تو بابا باہو سے ہزار معذرت کے بعد گنگنانے لگے گا۔

شالا مسافر ہر کوئی تھیوے لیندا پھرے ہلارے ہو

اور آخر میں چند شکریئے:

سب سے پہلا شکریہ ہے شفیق محترم جناب فضل حسین تبسّم کا جو صرف و نحو کے عالم ہیں اور جنہوں نے مسودہ پڑھ کر زبان و املا کے چند دقیق نکات کی نشان دہی فرمائی۔ ان میں سے کُچھ میری سمجھ میں بھی آ گئے اور میں نے ان سے حسبِ توفیق استفادہ کیا۔

دوسرا شکریہ ہے رفیق عزیز اسمٰعیل صدیقی کا جو فوجی افسر ہیں۔ انہوں نے مسودے پر ایک فرنٹل اٹیک FRONTAL ATTACK کے دوران کئی پیرے اور فٹ نوٹ ناپسندیدہ قرار دے کر تہ تیغ کر ڈالے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب تمام اغلاط و عیوب کا قلع قمع ہو گیا ہے۔ بہت کُچھ باقی ہیں اور وُہ اس لئے کہ مصنّف نے جابجا اپنا ویٹو کا حق استعمال کیا ہے۔ درستی اغلاط کے بارے میں مصنّف کے علاوہ پانچ بڑوں کی بھی یہی پالیسی ہے۔

اور آخری شکریہ ہے جناب عبد الستار خوش نویس کا۔ ممکن ہے ہماری کتاب سے آپ کسی مقام پر اُکتا جائیں لیکن ان کی کتابت آپ کو آخری لفظ تک لُبھائے گی۔ بے شک یہ ہمارے شکریئے اور آپ کی شاباش کے مستحق ہیں۔

محمد خان

راولپنڈی کلب راولپنڈی

۲۰مارچ۱۹۷۵

رخصت اے جی ایچ کیو

وُہ آئیں گھر میں ہمارے

ملکہ وکٹوریہ یا اس کی اولاد سے نیکی کی توقع اور وُہ بھی ایک پاکستانی کے حق میں سراسر عبث ہے مگر اللہ چاہے تو سب سے بڑی نیکی کی توفیق سب سے بڑے گنگار کو دے سکتا ہے۔ چنانچہ ایک روز یہ توفیق خُدا نے وکٹوریہ کی پڑپوتی کو بخش دی اور ہمیں یُوں پتہ چلا کہ اچانک ملکہ الزبتھ کا نمائندہ دست بستہ حاضری خدمت ہوا اور پچھلے گناہوں کی معافی مانگنے کے بعد عرض پرداز ہوا کہ اگر ہم تین ماہ کے لئے حکومت برطانیہ کو شرفِ میزبانی بخش کر ان کے ملک کا دورہ کریں تو موصوفہ بڑی ممنون ہوں گی۔ ہمیں اس دعوت سے سرور تو فوری طور پر آیا لیکن دعوت کے جاری ہوتے ہی اس پر جھپٹ پڑنا

ایک آزاد پاکستانی کے شایانِ شان نہ تھا۔ چنانچہ ایک باوقار شکریہ ادا کیا اور دعوت بھی۔ اصولاً۔۔۔ قبول کر لی لیکن جیسا کہ باقی سربراہانِ مملکت کا دستور ہے کہ اپنے ہمعصروں کی دعوت قبول تو کر لیتے ہیں مگر تاریخ کا تعین بعد میں ہوتا رہتا ہے، ہم نے بھی تاریخی دورہ کو مستقبل کی کسی شُبھ گھڑی تک اُٹھا رکھا اور ملکہ کا نمائندہ دُعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔

پھر جلد ہی یعنی ستمبر ۱۹٦۵ء میں ہماری مشرقی سرحد پر واہگہ کے قریب ہمارے ہمسائے نے اچانک ایک اور تقریب کا اہتمام کر دیا جس میں باقی فوج کے ساتھ ہم بھی مدعو تھے۔ اصل تقریب تو فقط سترہ دن جاری رہی لیکن تقریب کے پوسٹ مارٹم میں تاشقند کی فنّی امداد کے باوجود کم و بیش تین سال گزر گئے اور اس مصروف بیکاری میں ہم بتدریج ایک ذہنی تھکن محسوس کرنے لگے۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو بولا۔

"تھکن اس لئے ہے کہ تم نے تین سال سے چھٹی نہیں لی اور جو شخص سال میں ایک مہینہ چھٹی نہیں لیتا اس کی صحت ہی نہیں، شرافت بھی مشکوک ہے؟"

ہم نے ڈاکٹر سے سرگوشی میں کہا کہ اگر یہ بات ہے تو بتانا کسی کو نہیں۔ لیکن ڈاکٹر کی بات ہمارے اپنے دِل میں اُتر گئی اور ہم نے چھٹی لینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اگلی ہی صُبح

چائے [1] کے وقفے میں دانایانِ مجلس کے سامنے سوال پیش کیا کہ تین ماہ کی رخصت جو سہ سالہ غیر حاضر دماغی کی وجہ سے جمع ہو گئی ہے، کیسے گزاری جائے؟

نذیر [2] بولے: چھٹی خود بخود جمع نہیں ہوتی، جمع کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ غیر حاضر دماغی نہیں، ذخیرہ اندوزی ہے اور اس گناہ کا واحد کفارہ یہ ہے کہ پوری چھٹی ولایت میں گزاری جائے۔ ولائت کا نام سُن کر ہماری پیشانی پر دو تین سوالیہ شکنیں اُبھریں۔ زبیری [3] صاحب نے فوراً آرمی انسٹرکشن کا حوالہ دے کر فرمایا کہ رخصت بیرونِ پاکستان سرکاری طور پر جائز بلکہ مستحب ہے۔ پیشانی کی ایک شکن مٹ گئی۔ انور خان [4] نے حسبِ معمول مدھم لہجے میں پیالی کو مخاطب کرتے ہوئے لقمہ دیا کہ اگر فارن

---

[1] جی ایچ کیو راولپنڈی میں دس بجے ڈائرکٹریٹ کے تمام افسر چائے پر جمع ہوتے تھے جہاں جملہ مسائلِ عالم کے حل دریافت کئے جاتے تھے۔ چائے کے اس مختصر وقفے کی گپ باقی سارے وقت کی نسبت زیادہ نتیجہ خیز ہوتی تھی

[2] لیفٹیننٹ کرنل نذیر احمد۔ ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کے ذہین جی ون۔ آج کل برگیڈیر اور شعبہ تعلیم کے سربراہ ہیں

[3] انیس مرتضیٰ زبیری۔ ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کے ہر دِلعزیز سولین افسر

[4] کیپٹن انور خان جی تھری۔ کم گو مگر نغز گو۔ اب میجر ہیں

ایکسچینج کا پرابلم ہو تو لندن میں ایک ایسی "درک" موجود ہے جو تین چار سو پونڈ کا انتظام کر سکتی ہے۔ دُوسری شکن ہموار ہو گئی۔ پھر اچانک ملکہ برطانیہ کی دعوت یاد آ گئی جو تین چار سال سے بے استعمال پڑی تھی۔ سوچا کہ اگر ہنوز اس دعوت میں جان باقی ہو تو ہِز میجسٹی کو بھی اس کارِ ثواب میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ چائے پیتے پیتے ہی برطانوی نمائندے کو فون کیا تو ادھر سے جواب ملا:

"مہمانِ گرامی، ہم کئی سال سے دیدہ و دِل فرش راہ کئے بیٹھے ہیں۔ تم آؤ گھر میں ہمارے۔۔۔۔"

تیسری اور آخری شکن معدوم ہو گئی اور ہماری پیشانی ایک ولائتی روشنی سے جگمگا اُٹھی۔ گھڑی دیکھی تو معلُوم ہوا کہ سیر ولایت جیسے پیچیدہ مسئلے کا حل چائے کی مجلس میں فقط دو منٹ تیس سیکنڈ میں ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ انور خان بولے:

"اگر اسرائیل کا مسئلہ سلامتی کونسل کی بجائے ہمارے حوالے کیا جاتا تو مڈل ایسٹ میں کب کا امن قائم ہو چکا ہوتا۔"

مانگ کیا مانگتا ہے: پونڈ یا ڈالر؟

چائے کے بعد جملہ کار جہاں کو طاقِ نسیاں پر رکھتے ہوئے قواعدِ رخصت کے صحیفے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دورانِ تلاوت غنچۂ دِل بتدریج وا ہونے لگا اور جب پڑھ چکے تو سینہ ایک سدا بہار گلشن تھا کیونکہ مطالعہ سے ایسی ایسی سرکاری نوازشات کا انکشاف ہوا کہ سرکار دولت مدار سے۔۔ جس کے خلاف ہم دِل ہی دِل میں دائمی ہڑتال پر تھے۔ عشق ہونے لگا۔ آپ بھی سنئے اور سر دھنیے۔ لیکن ہم انسٹرکشن کے سوکھے سڑے دفتری الفاظ سے آپ کی ساعت کو ریگ مال نہیں کریں گے۔ اگر وُہ انسٹرکشن شریفانہ اُردُو میں لکھی ہوتی تو کُچھ یوں ہوتی:

"اے فرزندِ دولتِ پاکستان۔ تمہاری شبانہ روز محنت اور دکھتے ہوئے اعصاب کے پیشِ نظر سرکارِ عالی بہ صد مسرت اعلان کرتی ہے کہ تم ایک سے تین ماہ تک کی رخصت دُنیا کے حِصّے میں بعیش تمام گزار سکتے ہو۔ صرف بھارت اور اسرائیل سے پرہیز لازم ہے کہ ان کے ساتھ ہماری کُٹی ہے۔ اور ہاں، دیارِ غیر کو جانے کے لئے روپے پیسے کی فکر مت کیجو کہ رخصت سے پہلے تین ماہ کی تنخواہ مُنہ مانگے سکے میں ملے گی۔ جی چاہے تو پونڈ لے لو جی چاہے تو ڈالر۔"

آگے پڑھنے سے پہلے ہم نے دِل ہی دِل میں تیزی سے اپنی ماہوار تنخواہ کو تین سے ضرب دی اور اپنا دامن پونڈوں سے بھر لیا۔ پھر لطفِ مزید کے لئے انسٹرکشن کو ایک بار اور پڑھا۔ جب یقین ہو گیا کہ یہ جہاں نُما صحیفہ ہماری خاطر ہی نازل ہوا ہے تو ہم نے اپنے آپ کو ایک خفیف سی ملامت کرتے ہوئے کہا:

"اے پنڈی اور گوجر خان کے مابین چھٹی گزارنے کے خوگر، ذرا اپنی سرکار کی فیاضی کا تماشا کر جس کے گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے۔ اور اے وُہ کہ کل تک چک لالہ کے ہوائی اڈّے پر وزیروں اور سیکرٹریوں کو عالمی دوروں پر جاتے ہوئے مُنہ لٹکائے اور رال ٹپکائے دیکھا کرتا تھا، آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ۔"

ہم نے رال روک کر ادا دیکھی تو ہلکا ہلکا نشہ آنے لگا۔ ہمارے حالات اتنے سازگار کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے چاروں طرف غور سے دیکھا، آسماں گھات میں تھا، نہ صیاد کمیں میں۔ فوج مہرباں تھی، قانون موافق اور انگریز قدرداں۔ ہم نے فوراً رخصت کی درخواست کا فارم منگوایا اور پُر کرنا شروع کیا۔

بوُ ہے وچ کیوں کھلی ایں؟

رخصت کا فارم ایک سوالنامے کی شکل میں تھا۔ پہلا سوال تھا "رخصت کِن کِن ملکوں میں گزارنے کا ارادہ ہے؟" اب جیسا کہ آپ کو علم ہے ہم اپنی رخصت کے پورے تین مہینوں کی میزبانی کا فخر ملکہ برطانیہ کو بخشنے کا وعدہ کر چکے تھے لہٰذا اس اعتبار سے ہماری منزلِ مقصور تو لندن ہی تھی لیکن ہم نے سوچا کہ ایک ہی پرواز میں لندن پہنچ جانا ڈاکیا پن ہے۔ جن درمیانی ملکوں کو ہم نے دعوت کا موقع نہیں دیا آخر ان کا کیا قصور ہے؟ اور بہر حال ہم جبر و اکراہ ڈیوٹی پر نہیں بھیجے جا رہے ہیں بلکہ برضا و رغبت رخصت پر جا رہے ہیں۔ یعنی مدُعائے سفر محنت و مشقت نہیں، عیش و عشرت ہے۔ اور عیش و عشرت کا تقاضا یہ ہے کہ چھ ہزار میل کی طویل مسافت دو تین چھوٹی چھوٹی ہلکی پھلکی پروازوں میں مکمل کی جائے۔ یعنی یہ وُہ مقام نہیں جہاں ایک ہی جست میں تمام قصّہ طے کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے علیٰحدہ سفید کاغذ پر سفر کا پروگرام بنایا کہ پہلے تو حدودِ وطن کے اندر ہی راولپنڈی سے کراچی پہنچ کر دو دن آرام کریں گے۔ پھر کراچی سے اُڑ کر بیروت اتریں گے اور دیکھیں گے کہ اس کے حُسن جہاں تاب میں ہمارا دِل لبھانے کو بھی کُچھ ہے یا نہیں۔ بیروت سے جینوا کو پرواز کریں گے اور سوئٹزر لینڈ کا گلزار ہست و بود دیکھیں گے کہ یہی فرمودہ اقبال ہے۔ پھر جینوا سے لندن پہنچ کر جزائر برطانیہ کو ذرا تفصیل سے روندیں گے کہ بعد میں خاکِ برطانیہ کو اُترانے میں آسانی ہو۔ اور واپسی پر پیرس اور فرینکفرٹ تو یوں بھی ہمارے لئے چشم براہ ہوں گے۔ ان کی آنکھیں چکا چوند کرتے ہوئے ترکی اور ایران میں حاضری دیں گے کہ بعد میں ہمارے آر سی ڈی کے اخوان ہم سے کمیٔ اخوّت کا گلہ نہ کریں۔ بلکہ ممکن ہے ترکی میں کوئی جوابی

اخوّت کا مارا یا ماری وفودِ محبّت سے مسافر کو گلے لگا لے اور مزید ممکن ہے کہ ایران میں کوئی ترک شیر ازی علاقائی تعاون کو ترقّی دینے کے لئے ہمارے انتظار میں اپنی حویلی کے دروازے پر کھڑا ہوا اور ہم اس سے زبانِ یار یعنی فارسی میں پوچھیں کہ جانِ من، بر در خانہ چرا الیستادہ ای؟[۵] اور خدا کی قدرت سے ترک شیر ازی بھی زبانِ یار یعنی پنجابی میں جواب دے کہ

بوہے وِچ تاں کھلی آں مت ماہیا آ نکلے[۶]

اور اس وصال آثار کلمے پر تکمیل رخصت کرتے ہوئے ہم کراچی پہنچ جائیں گے۔ جب ہمیں درخواست بھیجے دو تین روز گزر گئے اور جواب نہ آیا تو ہم نے صاحب بہادر کو یاد دہانی کا فیصلہ کیا اور ادب سے فون کیا۔ اُدھر سے آواز آئی "خونخوار سپیکنگ" ہم نے یہ نام سُنا تو ٹھٹھک سے گئے۔ ہر چند کہ موصوف کی شہرت کے پیشِ نظر یہ ایک موزوں تخلّص ہو سکتا تھا، تاہم شاعری سے انہیں اتنا ہی مس تھا جتنا ان کی بھینس کو، جس کے ساتھ وُہ اپنے بنگلے میں ڈٹ کر شعر و شاعری سے پاک زندگی بسر کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ موصوف کی بھینس ان کی بیگم کے علاوہ تھی۔ ہم ذرا خاموش رہے تو اُدھر سے آواز کی آئی:

"سپیک اَپ پلیز! فوجدار ہیر۔"

---

[۵] جان من، دروازے پر کیوں کھڑی ہو

[۶] دروازے پر اس لئے کھڑی ہوں کہ شاید میرا محبوب ادھر آ نکلے۔

معلُوم ہوا کہ صاحب نے تو پہلی مرتبہ بھی ٹھیک نام ہی لیا تھا۔ یہ ہمارے لاشعور کا حسنِ سماعت تھا کہ اسے خونخوار سمجھا۔ بہرحال ہم نے فوراً جواب میں اپنا نام عرض کیا۔ اُدھر سے صاحب بہادر نے بڑے سرپرستانہ انداز میں فرمایا:

"اچھا تو میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

عرض کیا: "آپ کی خدمت میں تین ماہ کی رخصت کی درخواست بھیجی تھی، آپ ازراہِ کرم اسے منظور فرما سکتے ہیں۔"

پورے دو گز کی با آواز انگڑائی لے کر فرمانے لگے:

"چھٹی تو شاید تین ماہ کی مل جائے گی لیکن پونڈ صرف ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ کے مل سکیں گے۔ زرمبادِلہ کی کمی ہے۔"

ہرچند کہ تین کی بجائے ڈیڑھ کی ضرب سے آدھی جھولی پونڈوں سے خالی ہو گئی تاہم بحث فضول تھی۔ عرض کیا:

"یہ بھی آپ کی نوازش ہے۔"

ذرا پگھلے اور بولے:

"چلو، زرِمبادِلہ بھی دو ماہ کا دے دیں گے۔ کس تاریخ سے چھٹّی چاہیئے؟"

"یکم جون سے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ تم یکم جولائی سے جاسکتے ہو۔"

آپ کو اچھے بھلے دودھ میں غیر متوقع مینگنیاں مِلانے کا خداداد ملکہ تھا۔ عرض کیا:

"لیکن جناب میں نے انگریزوں سے جون میں لندن پہنچنے کا وعدہ کرر کھا ہے۔"

"کرر کھا ہے تو تشریف لے جائیے لیکن تشریف زرمبادِلہ کے بغیر ہی لے جانا پڑے گی۔"

غلطی ہم سے یہ ہوئی تھی کہ وہ گنج بخش انسٹرکشن پڑھتے ہی ہم نے تیزی اور خوشی میں آکر برطانوی میزبانوں کو اپنا عبوری پروگرام بھیج دیا تھا۔ اب ہر چند کہ انگریزوں سے تاریخ مقرر کر کے پورا ایک مہینہ دیر سے پہنچنا مناسب نہ تھا تاہم زرمبادِلہ کے بغیر سفر بھی خارج از بحث تھا۔ زرمبادِلہ کے بغیر وعدے کی پابندی کی تو ایک ہی صورت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں افسری کی بجائے مولانا حسرت موُہانی کی طرح درویشی عطا کی ہوتی اور ہم ایک لوٹا، خالی جیب، عالیٰ ظرف اور اللہ کا نام لے کر مُنہ اندھیرے گھر سے چل نکلتے۔ لیکن قسام ازل نے ہمیں درویشی کی بجائے افسری کے قابل ہی سمجھا تھا اور افسری کا خاصہ ہے کہ عالیٰ ظرفی کے بغیر تو چل سکتی ہے لیکن زرمبادِلہ کے بغیر دھک سے رُک جاتی ہے۔ مجبوراً صاحب بہادر سے عرض کیا:

"جناب یہ بات ہے تو یکم جولائی سے سہی، میں انگریزوں سے معذرت کرلوں گا؟"

"اوکی ڈوک [۲]۔ کل تک انتظار کرو۔"

---

[۲] اوکے کا مزید بگاڑ

صاحب بہادر نے اوکی ڈوک جیسے کئی سکہ بند ٹوٹکے یاد کر رکھے تھے لیکن جہاں غیر سکہ بند یعنی گرامر والی انگریزی کا مقام ہوتا وہاں ڈھوک رتہ کی بولی کو ترجیح دیتے تھے۔

صاحب سے فارغ ہو کر ہم نے برطانوی میزبان سے اپنی مجبوری کا قصّہ بیان کیا۔ انگریز طے شدہ پروگرام کو توڑنے سے کُچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوتا۔ دمِ گفتگو ہم اپنے مخاطب کی جبیں کی شکنیں تو نہ دیکھ سکتے تھے لیکن آواز کی شکنیں واضح طور پر محسوس کر رہے تھے۔ بہر حال ہماری مجبوری کے آگے بے بس ہو گیا اور لندن کو خبر کرنے کی ہامی بھر لی کہ مہمان محترم کا پاؤں سُرخ فیتے میں الجھ گیا ہے۔ لہٰذا اس کا استقبال جون کی بجائے جولائی تک اُٹھا رکھا جائے۔

میر تقی میر انفنٹری میں

دوسرے روز حسبِ وعدہ ہمارے اپنے صاحب نے فون کیا اور چھوٹتے ہی بولے:

"ہیلو خان، تمہارے لئے خوشخبری ہے۔"

"شکریہ! ارشاد"

"تمہاری رخصت منظور ہو گئی ہے۔"

"کرم ہے آپ کا م کا"

"اور منظوری بھی یکم جون سے ہوئی ہے۔"

”لیکن جناب ایک دفعہ آپ ہی کے حکم سے جون کو جولائی میں بدل چکا ہوں اور یہ خبر تو اب لندن تک پہنچ چکی ہے۔“

”کوئی حرج نہیں ایک بار پھر جولائی کو جون میں بدل دو۔“

”جناب ایسا کرنے سے یہ غیر ملکی ہم پاکستانیوں کے متعلق کُچھ اچھا تاثر نہ لیں گے۔“

”کیا اچھا نہ لیں گے؟“

”تاثّر جناب تاثّر۔“۔ ہم نے ث کی شد کو اچھی طرح کھُرچ کر پیش کیا۔ لیکن لفظ تاثّر سے شاید آپ کی پہلی ملاقات ہو رہی تھی، کُچھ نہ سمجھے اور فوری جلال میں آکر بولے:

”انگریز جو جی چاہے لیتے رہیں، تمہاری چھٹّی یکم جون سے منظور کی جاتی ہے۔“

میں مزید تو کُچھ نہ کہتا تھا لیکن صاحب کی خوش کلامی نے متاثر کیا تو عرض کیا:

”جناب آپ کو معلُوم ہے میں نے کیا کہا ہے؟“

”کون سا میر؟ کرنل ارشد میر؟“

”نہیں صاحب میر تقی میر۔“

”میر تقی میر، کبھی نام نہیں سُنا۔ کس پلٹن کا ہے؟ کیا رینک ہے؟“

”جرنیل ہے جناب۔ شاعروں کی پلٹن کا جرنیل۔ اس نے کہا ہے:

صورت آئینے میں ٹک دیکھ تو کیا صورت ہے!

بدزبانی تجھے اس مُنہ پر سزاوار نہیں“

شعر فہمی آپ کی ذاتی بلکہ خاندانی کمزوری بھی نہ تھی۔ یہ شعر بھی آپ کو کسی مقام پر چھوئے بغیر کہیں بادلوں کی سمت میں نکل گیا۔ لیکن آپ نے جواب میں کُچھ کہنا تو تھا ارشاد فرمایا:

”جنرل میر اچھّا آدمی معلُوم ہوتا ہے۔“

ہمارے پاس تائید کے بغیر چارہ نہ تھا۔ عرض کیا:

”جی ہاں، سگریٹ تک نہ پیتا تھا۔“

اور خدا حافظ کہہ کر ٹیلی فون بند کر دیا۔

اگلے لمحے ہمارے ٹیلی فون کا روئے سخن اپنے انگریز میزبان کی طرف تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس مُنہ سے دوبارہ تاریخ بدلنے کو کہا جائے۔ آخر مزاج پرسی کے بعد کسی قدر معصومیت سے پوچھا۔

”ہماری چھٹّی کی نئی تاریخ کی اطلاع لندن بھیج دی گئی ہے؟“

بولا ”بس ابھی جا رہی ہے۔ کرسٹین چٹھّی ٹائپ کر رہی ہے۔“

”تو ابھی نہیں گئی؟۔۔۔ شکر ہے خدایا!“

آخری جملہ ہمارے مُنہ سے کسی قدر اضطرار کی حالت میں نکلا۔ اس پر انگریز بولا:

”یہ کس خوشی میں شکر ادا ہو رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک بار پھر تاریخ بدلنا چاہتے ہو؟“

”نہیں میاں، سچ تو یہ ہے کہ سرے سے کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں۔“

جواب میں آواز آئی۔

”کرسٹین، اس مردود کاغذ کو مشین سے نکال لو۔۔ گڈ بائی کرنل۔“

اس کے بعد ٹیلی فون بند ہو گیا اور ہم دن بھر سوچتے رہے کہ گڈ بائی کے بعد اس انگریز نے کُچھ زیرِ لب بھی کہا ہو گا جس کی ٹیلی فون نے پیامبری نہ کی۔

ٹکّر سُرخ فیتے اور وغیرہ وغیرہ سے

یہ نہ تھی ہماری قسمت

آپ نے محسوس فرمایا ہو گا کہ جس چھٹی کا ہمیں سرکار نے بکمالِ شفقت مستحق سمجھا تھا، دراصل بیچاری سرکار کی دین ہی نہ تھی بلکہ ہمارے یارِ نامدار حضرت خونخوار کی جاگیر تھی، جنہوں نے ازراہِ سخاوت اس کا کُچھ حصّہ ہمیں ذاتی خیرات کے طور پر بخش دیا تھا اور اپنے حُسنِ کارکردگی سے نہ صرف ہمیں اپنا گرویدہ بنالیا تھا بلکہ انگریزی میزبانوں کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات میں ایک غیر معمولی خوشگواری پیدا کر دی تھی۔

بہرحال چھٹی مل جانے اور استقبالِ لندن کی تفاصیل طے ہو جانے کے بعد غالباً آپ کا خیال ہو گا کہ دوسرے روز ہم پونڈوں سے لدے پھندے ہوائی ٹکٹ جیب میں ڈال

نمائشی بریف کیس اُٹھائے، مسکراتے گنگناتے اسلام آباد کے ہوائی اڈّے پر کسی برق پارہ ائیر ہوسٹس سے ہوائی سفر کے متعلق رہنمائی یا گمراہی حاصل کرتے پائے گئے ہوں گے۔ اگر سچ مچ آپ کا یہی خیال ہے تو اس خوش خیالی کے عوض آپ کے مُنہ میں شہد کا بڑا چمچہ لیکن کاش ایسا ہوتا کہ سرِ دست یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔ اور قسمت یہ تھی کہ دوسرے روز سٹیٹ بینک میں جا کر دو ماہ کی پیشگی تنخواہ پونڈوں میں پائی تو خداوندِ سیم وزر کہ شکل و صورت سے پیدائشی نادہند نظر آتا تھا، ہمارا منہ تکنے لگا اور جب ہماری سادگی سے لطف اندوز ہو چکا تو بولا:

"پہلے سی ایم اے[۸] کے دفتر سے اپنی تنخواہ کا تعین کرا لائیے، پھر آنا، کرنل صاحب۔"

"تعین؟" ہم نے حیرت سے کہا۔

"ہماری تنخواہ ایک مدّت سے مقرر ہے جو اتنے روپے اتنے پیسے ماہوار ہے۔ اس کو فقط دو سے ضرب دینے کی ضرورت ہے، جواب نکل آئے گا۔"

---

[۸] کنٹرولر آف ملٹری اکاونٹس یعنی فوجی ملازمین کی تنخواہ کا حساب رکھنے اور ماہ بماہ تقسیم کرنے والا ادارہ

ہماری دلیل سنکر خداوند نے ہمیں اور ہماری سادگی کو مزید غور سے دیکھا اور پھر مشفقانہ انداز میں نصیحت فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم پہلے فوجی افسر نہ تھے جو اپنی تنخواہ کے پونڈ بنوانے آئے تھے۔ کئی کرنل، جرنیل اور اسی قبیل کے دوسرے سوالی ان کی کھڑکی کے سامنے سے گزر چکے تھے اور وُہ تمام براہ سی ایم اے ہی اس منزل پر پہنچے تھے۔ لہٰذا اگر ہمیں پونڈوں سے حقیقی دلچسپی تھی تو راہ راست سے انحراف فضول تھا اور تاخیر مضر۔ اور آخر میں آپ نے اشارتاً یہ بھی فرما دیا کہ آپ تو ماشاء اللہ خاصے دانشمند نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ آسان نتیجہ نکالنا ہم پر چھوڑ دیا کہ براہِ راست پونڈ مانگ کر ہم نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ ہم نے اس بابو نما افسر پر کڑی غیر دوستانہ نگاہ ڈالی اور بینک سے نکل کر سی ایم اے کی راہ لی۔

اب جہاں تک سی ایم اے کا تعلق ہے، یہ واقعہ ہے کہ تمام فوجی ملازمت کے دوران اس محکمہ سے نہ صرف ہمارے بلکہ جملہ فوجیوں کے تعلّقات مستقل طور پر کشیدہ رہے ہیں اور اس کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بابو لوگ فقط اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ باادب باملاحظہ ماہ بماہ ہمیں تنخواہ پیش کر دیا کریں۔ مگر ان بابوؤں کا عقیدہ ہے کہ ان کا مدعائے آفرنیش تنخواہ بانٹنا نہیں، تنخواہ کاٹنا ہے۔ نتیجتاً ان کے متعلق ہمارے جذبات تقریباً وہی ہیں جو سرحد پار والوں کے لئے ہیں اور اگر ہم اپنی توپوں کا

رُخ کبھی کلکتہ [9] دفتر کی طرف نہیں کر دیتے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمیں اپنے نشانے کی موزونیت میں کُچھ شُبہ ہے بلکہ اس لئے کہ ہماری مجاہدانہ شان کے منافی ہے۔ ہم نے انہیں ہمیشہ سے اسی انداز سے دیکھا ہے۔ لیکن آج ہمیں تاکید کی جا رہی تھی کہ بِلا تاخیر دشمن کے گھر جا کر نہ صرف اپنی حاجت پیش کرو بلکہ چار و ناچار اسے پیار کی نگاہ سے بھی دیکھو۔ خیر چل تو ہم پڑے کہ یہی جنونِ رخصت کا تقاضا تھا لیکن نظرِ حقارت کا حق ہم نے علیحدہ محفوظ رکھا۔

دفتر میں پہنچے تو وہ حضرت جو کنٹرولر کی کرسی پر بیٹھے تھے خلافِ توقع انسان نظر آئے۔ ہم نے حقارت کو روک کر ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا، سعید احمد ہیں۔ ایک ادیب، موسیقار اور رقاص کو کنٹرولر کی کرسی پر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ لیکن حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی کہ دشمن کی صفوں میں ایک آشنا صورت نظر آئی۔

ہم نے اپنی شانِ نزول بیان کی تو سعید احمد نے فوراً گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جواب میں ایک بابو نمودار ہوا۔ سوکھا سڑا چہرہ، چیرتی چمکتی آنکھیں، سونگھتے سرسراتے نتھنے اور تیز باریک دانت۔ یہ نہیں کہ بابو مجموعی طور پر انسان نظر نہیں آیا تھا لیکن یُوں جیسے اس کی

---

[9] کلکتہ دفتر راولپنڈی میں اس مشہور عمارت کا نام ہے جہاں سال ہا سال سی ایم اے کے دفاتر نے کام کیا۔ آج کل ان لوگوں کو وزارتِ دفاع نے دھکیل کر دُوسری جگہ ڈال دیا ہے۔

انسانیت میں ایک نامعلوم سی درندگی کی آمیزش ہو۔ بے شک اس کے مُنہ میں ران وغیرہ قسم کی کوئی شے نہ تھی تاہم اس کی باچھیں تر بھی تھیں اور لال بھی، جیسے تازہ تازہ تنخواہ کاٹ کر آیا ہو۔ سعید احمد نے ہمارے ہاتھ سے کاغذ لے کر اس کے حوالے کیا اور اپنی بنگلہ اُردو میں اسے کہا:

"کرنل صاحب ولایت جاتا ہے۔ حساب کر لاؤ کہ یہ زیادہ سے زیادہ کتنی تنخواہ پیشگی ساتھ لے جاسکتا ہے؟"

پھر باہر کو یہ بتانے کے لئے کہ ہماری کُچھ خاطر بھی منظور ہے، تاکیداً کہا:

"دیکھو، حساب اچھا اچھا کرو۔"

بابو کوئی دس منٹ بعد آدھی تنخواہ کاٹ لایا اور کاغذ سعید احمد کے سامنے دستخطوں کے لئے رکھ دیا۔ سعید احمد نے اپنی تاکید اور ہماری تنخواہ کا یہ حشر دیکھا تو چکرا سا گیا۔ ذرا سنبھلا تو کلرک سے کہنے لگا:

"یہ تو آدھی تنخواہ ہے۔ باقی کدھر گئی؟"

"وُہ ادھر پاکستان میں رہے گی۔"

"پاکستان میں رہ کر کیا کرے گی؟"

”سرکاری واجبات ہیں۔ کرایہ ہے، بجلی ہے، پانی ہے وغیرہ وغیرہ ہے۔“

”مگر یہ سب تو تنخواہ کا کوئی بیسواں حصّہ بنتے ہیں۔ باقی کٹوتی کس لئے ہے؟“

”دیکھئے نا حضور کرنل صاحب آخر پردیس جا رہے ہیں؟“

”پھر۔“

”پھر خدا نہ کرے۔ لیکن فرض کریں کہ آپ ہوائی حادثے میں اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں سب پیشگی تنخواہ ضائع ہو جائے گی۔ یہ کٹوتی وغیرہ کے تحت آتی ہے۔“

ہم گفتگو میں حصّہ نہیں لے رہے تھے لیکن انتقاماً یہ سوچ کر دِل کو تسلی دی کہ پنڈی میں ہر روز ایک دو آدمی موٹروں کی زد میں آ جاتے ہیں۔ شاید اس بابو کی گزرگاہ پر بھی کوئی برق رفتار ٹیکسی چلتی ہو۔

سعید احمد بولے: ”وغیرہ وغیرہ کا مطلب ہے اللہ کو پیارا ہو جانا؟“

”جی ہاں۔ ان خاص حالات میں اس سے بہتر مطلب نہیں نکل سکتا۔“

سعید احمد نے ذرا مسکرا کر ”وغیرہ وغیرہ“ پر ایک گہری سُرخ لکیر کھینچی اور بولا:

”نکل تو سکتا ہے۔“

اور پھر دستخط کرنے کے بعد کاغذ ہمارے حوالے کر دیا۔

غریب ناتواں بابو سعید احمد کے لب اور قلم کی جنبش کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور کمرے سے یوں نکلا جیسے اپنی لاش اُٹھائے لئے جا رہا ہو۔ وُہ خاموش دُعا جو چند لمحے پیشتر ہم نے اس کے حق میں مانگی تھی قبول ہو چکی تھی کیونکہ اگر بابو سچ مچ کسی ٹیکسی کے نیچے آ جاتا تو اس سے زیادہ مضمحل، مجروح یا مقتول نظر نہ آتا۔ سعید احمد کے قلم کا فولادی نب: وغیرہ وغیرہ ---پر نہیں، بابو کے جگر پر چلا تھا۔ ہم نے سعید احمد کو تو ازراہِ تشکّر دُعا دی کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، لیکن سچّی بات ہے بابو بے چارے کی حالتِ زار پر بھی رحم آنے لگا کہ ہر چند کہ عقیدتاً گمراہ تھا یعنی دشمنِ تنخواہ تھا تاہم عقیدہ استوار رکھتا تھا، یعنی اصل ایماں سے محروم نہ تھا اور اگر اسی کوالیفیکیشن پر غالب ایک برہمن کو بت خانے سے اکھاڑ کر کعبے میں گاڑنے پر مصر تھے تو ہمارے خیال میں بابو بھی اس رعایت کا مستحق تھا کم از کم ہمارا ووٹ بابو کے ساتھ تھا، ہر چند کہ اس میں اسد اللہ خاں کا سازورنہ تھا۔

ہماری تنخواہ کا تسلّی بخش تعین ہو گیا تو ہم معمول سے زیادہ چھاتی اُبھار کر سٹیٹ بینک گئے اور آخر کار ہماری روپہلی تنخواہ سنہری پونڈوں میں بدل گئی۔۔جی ہاں بدل تو گی لیکن بعد از خرابی بسیار۔ بہرحال یہ خرابی عارضی تھی۔ فتح کے نشے اور بارہ گھنٹے کی نیند نے ایک

ولولہ تازہ دیا مردہ دِلوں کو اور دُوسری صبح جاگے تو ہماری جیب میں پونڈ تھے، دِل میں اُمنگیں اور زبان پر نغمے۔ نتیجہ یہ کہ ہم دن بھر فلمی دھنیں الاپتے رہے۔

رات ہمارے اعزاز میں الوداعی ضیافت تھی۔ بعض ضیافتوں کے مزاج میں طرب ہوتا ہے۔ یہ اسی قسم کا کھانا تھا۔ آج ہم مجسم مطرب بنے بیٹھے تھے۔ لیکن کھانا کم اور گانا زیادہ۔ ایک تان کے درمیان کسی نے اطلاع دی کہ کوئی فون پر بُلا رہا ہے۔ ہم نے اسی تان کے زیرِ اثر ریسیور میں پہلے ایک پلٹا بلند کیا اور پھر ایک ہیلو ہنس دی۔ اُدھر سے برطانیہ کا نمائندہ بولا اور چھوٹتے ہی کہنے لگا۔

"تھینک گاڈ۔ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"برطانیہ۔"

"لیکن یہ تو کب کا طے ہو چکا تھا؟"

"تھا بھی اور نہیں بھی۔ وزارتِ تعلیم[10] کی منظوری باقی تھی وُہ بھی راضی ہو گئی ہے۔"

---

[10] مارشل لاء کے زمانے میں وزارتِ تعلیم کا مزاج بھی کسی قدر مارشل لائی ہو گیا تھا۔

”یعنی اسی وقت رات کو کھاتے کھاتے راضی ہوئی ہے؟“

”جی ہاں۔ ابھی ابھی ایک سیکشن آفیسر نے فون کیا ہے۔“

”اور اگر فون نہ آتا تو اس آخری وقت پر بھی ہمیں اپنا بستر اور امام ضامن کھولنا پڑتا؟“

”کُچھ گڑبڑ تو ضرور ہوتی۔“

”مگر آپ کو یقین ہے کہ کل صبح تک محترمہ وزارت اپنا ارادہ بدل نہ لے گی؟“

”اس کا امکان نہیں۔ ہم نے تمہارے لئے بڑا لاجواب مشن چُنا ہے۔“

”مشن؟ وُہ کس لئے؟؟“

”وزارتِ تعلیم کی تسلّی کے لئے۔ یہ کسی علمی بہانے کے بغیر برطانیہ نہیں جانے دیتی۔“

”اور ہمارا مشن کیا ہے؟“

”برطانوی نظامِ کتب خانہ جدید و قدیم کا مطالعہ۔“

”مشن تو اچھا ہے مگر اس کا حدود اربعہ ہماری قابلیت سے کُچھ زیادہ معلُوم ہوتا ہے۔“

”وہاں جا کر تم ایسا حدود اربعہ مقرر کر لینا جو تمہیں موافق آئے۔“

اس گفتگو کے بعد ہم پھر گانے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔ ویسے سچ پوچھیں تو ہمارے کھانے اور گانے میں کُچھ کپکپانے کا شائبہ بھی تھا۔ ہمیں ہر لحظہ خوف تھا کہ کوئی مانع رخصت پیام آتا ہے و لے بخیر گزشت۔ آخر بستر پر دراز ہوئے تو شب بھر خواب میں سی ایم اے کے کلرکوں، سٹیٹ بینک کے بابوؤں اور وزارتِ تعلیم کے سیکشن افسروں کے سامنے صفائیاں پیش کرتے رہے کہ حضور یقین کریں میں ایک امن پسند شہری ہوں۔ رزقِ حلال کا قائل ہوں۔ کسی بین الاقوامی مافیا کے گرُوہ سے تعلق نہیں۔ جیکی کینیڈی کی قدر کرتا ہوں مگر اوینسنر سے بیزار ہوں۔ نیکوں کی مجلس میں بیٹھتا ہوں اور جب تک بور نہ ہو جاؤں نہیں اُٹھتا۔ پھر کُچھ جائز سی تفریح کرتا ہوں کہ دِل ہی تو ہے مگر پھر نماز پڑھ لیتا ہوں کہ خدا بھی تو ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

غالباً یہ اس مقدس جملے کا فیض تھا کہ ہمارے دِل آزار خواب یکلخت تھم گئے اور ہم گہری نیند سو گئے۔ صُبح جاگے تو طبیعت میں تازگی تھی اور دِل میں ولولے۔ آخر ولایت جا رہے تھے جہاں سے واپس آکر بھی لوگوں کا نشہ نہیں اترتا۔

پہلی پرواز۔۔۔ منزل کراچی

بن یاراں کس کاری

ساڑھے تین بجے سہ پہر ہمارا جہاز کراچی روانہ ہونا تھا۔ ہم پورے تین بجے چک لالہ ائیرپورٹ پر پہنچ گئے۔ پنڈی سے ہمیں پیار ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس کے نام میں نسائیت ہے۔۔۔ لاہور اور پشاور بہت مذکّر کاٹھ کے شہر ہیں۔ لیکن پنڈی کی ادائے دِلبری محض تانیث تک ہی محدود نہیں۔ نام کے لحاظ سے کراچی بھی اتنی ہی مونّث ہے بلکہ ایک شادی شدہ کنیت بھی رکھتی ہے یعنی عروس البلاد کہلاتی ہے۔ لیکن جو شیوہ تر کانہ دوشیزہ پنڈی کا ہے وُہ اس عروس ہزار داماد کا نہیں۔ لیکن آج ولایت روانہ ہوتے ہوئے ہمیں پنڈی سے شکوہ ہونے لگا۔

وہ اس لئے کہ پنڈی کا پنڈا جو عام حالات میں ہاتھ کے نیچے حریر و پرنیاں کی طرح ملائم و معتدِل محسوس ہوتا تھا، آج خلافِ معمول ریگ آمو کی مانند درشت اور گرم لگ رہا تھا اور یہ پنڈی کے روایتی مزاج پر ناقابلِ تلافی تہمت تھی۔ پنڈی کی دِلربائی کا تو یہ تقاضا تھا کہ آج۔۔ اور خصوصاً آج کہ ہم رخصت ہو رہے تھے۔۔ مری سے خاص طور پر بادِل آتے، بوندا باندی ہوتی، باغوں میں جھولے پڑتے، فضاؤں میں رومان رچتا اور پنڈی چھوڑنے پر ہمارے ارمانوں میں ہلچل مچی۔ کوئی دستِ ناتواں بھی دامن گیر ہوتا تو ہمیں دامن جھٹکنے کا یارانہ ہوتا۔ اوّل تو ہم وہیں ہوائی ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیتے ورنہ جہاز کی طرف قدم نہ اُٹھا اور اُٹھتا بھی تو اس انداز سے کہ پہلے ان کا دامن تھام کر دِل کو تھامنے اور پھر یہ ہزار مشکل 'قدم بعد قدم' جہاز کے زینے تک پہنچنے اور سیڑھیاں چڑھنے کے لئے ائیر ہوسٹوں کا دوطرفہ سہارا درکار ہوتا۔۔ معاف فرمایئے گا رنگیلے پیا واجد علی شاہ سے زینے کا مضمون اتفاقیہ لڑ گیا ہے۔ یہ سرقہ نہیں توارد ہے۔۔ لیکن آج پنڈی کے مزاج میں شوخی کم تھی اور گرمی زیادہ۔ اس درجہ حرارت پر پہنچ کر ہمارے ارمان پروان چڑھنے سے پیشتر ہی پگھل گئے۔ اور جب ہم بے ارمان دِل لئے ائیرپورٹ پر پہنچے تو جی چاہا کہ بیرونی ہال کے جملہ رنگ و بو سے قطع نظر کرتے ہوئے انتظار گاہ کی خنکی میں جا پناہ لیں۔ لیکن اچانک ہال کے ایک کونے میں ہمیں الوداع کہنے والوں کی ایک ٹکڑی نظر آئی۔ یُوں تو شاید ہم دور ہی سے اپنے الوداع کنندگان کو ایک رسمی

مسکراہٹ ایک دستی لہراہٹ اور ایک زبانی ٹاٹاہٹ سے انگریزی جواب دے کر ہم سفروں کے ریلے میں اندر چلے جاتے لیکن ناگہان احساس سا ہوا کہ ہم طوعاً و کرہاً ٹکڑی کے مرکز کی طرف کھچے چلے جا رہے ہیں۔ یُوں جیسے چند اجرامِ فلکی کی کششِ ثقل میں آ گئے ہوں۔ اور دیکھا تو ٹکڑی کے درمیان [11]ضمیر کی بسیط تنومندی اور اس کے ساتھ [12] سالک کی بلیغ سربلندی نظر آئی۔ کشاں کشاں اور بے اختیار ان سے جا لپٹے۔ پھر شاید دوستوں کو ملتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے گرمی کی لہر بھی تھم گئی اور دم معانقہ صرف ایک خیال دامن گیر رہا، کیا ان دوستوں کے بغیر سیر فرنگ میں کُچھ مزا ہو گا؟ سیف الملوک کا مصرع یاد آیا:

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری؟

لیکن وُہ گرم و گراں نصف ساعت جو جہاز کے انتظار میں پہاڑ نظر آ رہی تھی، ضمیر اور سالک کے ساتھ اس قدر سُبک اور سویٹ گزری کہ ایک لمحۂ گریزاں معلُوم ہوئی اور پتہ اس وقت چلا جب ایک ائیر ہوسٹس نے کس قدر تلاش کے بعد ہمیں ڈھونڈ کر جھنجھوڑا: "پی آئی اے کی پرواز لاہور اور کراچی کے لئے تیار ہے اور آپ ہی کا انتظار

---

[11] میجر سیّد جعفری صاحب مافی الضمیر۔ ملک کے مایۂ ناز مزاح نگار

[12] میجر صدیق سالک "ہمہ یاراں دوزخ" کے مصنّف اور صاحبِ طرز نثر نگار۔

ہے۔" پھر اس پر بھی اصرار کیا کہ "ابھی بلا توقّف میرے ساتھ جہاز کی طرف چلو۔" ہم چل پڑے اور وُہ ائیر ہوسٹس سے ہمکلامی اور ہم خرامی کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ لیکن محترمہ نے کوئی گمراہی کی بات نہ کی، بلکہ آپ کے روئے انور پر نگاہ پڑی تو محسوس ہوا جیسے ابھی مصلے سے اُٹھ کر آئی ہوں۔ جب پوچھا کہ آپ کا یہی کام ہے کہ بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہِ راست پر لا کر جہاز تک پہنچا دیں تو بولیں:

"جی ہاں میں گراؤنڈ ہوسٹس ہوں۔"

کیا ائیر ہوسٹس تولیدِ خون کا باعث ہوتی ہے؟

ہوسٹسیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ارضی و سماوی۔ ارضی یعنی گراؤنڈ ہوسٹسیں نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں۔ یعنی نماز پڑھیں نہ پڑھیں، پرہیز گار لگتی ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے دِل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دُنیا فانی معلُوم ہوتی ہے اور ان کی صحبت میں ہوائی جہاز کی بجائے نزدیک ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی ہوسٹسیں جہاز پر پائی جاتی ہیں اور ان کی تاثیر بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ان کی ہمسفری سے یادِ الٰہی میں تو نمایاں کمی آجاتی ہے، البتہ ان کے قرب سے تولیدِ خون میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے اور ان کی معطّر سانسوں کے طفیل ہوائی جہاز کی ائیر کنڈیشنگ کے باوجود زندگی میں حرارت آتی ہے اور یہ چلتی پھرتی رہیں تو دُنیا رہنے کے قابل معلُوم

ہوتی ہے۔ ان کی مہمان نوازی اوڈی کلون میں گھل کر جہاز کی فضا کو قطعی طور پر ایمان ربا بنا دیتی ہے، جس سے مسافروں اور مسافرات کے اپنے اپنے ارمان اور رومان تحت الشّعور میں کروٹ لے کر اچانک جاگ اُٹھتے ہیں حتیٰ کہ بوڑھے اور بھاری بھر کم سینئر افسر بھی جو ریٹائرمنٹ کے دہانے پر کھڑے ہو کر آخری سرکاری دورے پر نکلے ہوتے ہیں، بار بار گھنٹی کا بٹن دباتے ہیں اور بار بار سنگتریاں طلب کرتے ہیں اور اس بہانے اپنی ہلکی پھلکی میزبانوں سے خوش وقت ہو کر اپنی ہم عمر اور ہم وزن بیگمات سے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر وقفۂ نجات مناتے ہیں۔ الغرض ارضی و سماوی ہوسٹسوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

آخر ہم نے دولتِ ایمان سے مالا مال ہو کر اس خدا رسیدہ ارضی ہوسٹس سے رخصت لی اور اس توقع پر زینے پر قدم رکھا کہ رنگ و بو کی آسمانی دُنیا میں داخل ہوتے ہی شاید کوئی فتنہ سامان سماوی میزبانہ ہمارے ایمان کے امتحان پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن دروازے پر کھڑی ائیر ہوسٹس کو دیکھا تو خلافِ توقع موصوفہ میں کوئی ممتحنوں والی بات نظر نہ آئی۔ ہر چند کہ آپکے رخ و گیسو پر پی آئی اے کی مفت کریموں اور اوڈی کلونوں کا فیاضانہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا تاہم وہ بات پیدا نہ ہو سکی تھی جو سماوی مہ سیماؤں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بلکہ شکل و صورت سے آپ اپنی اس ارضی بہن سے بھی زیادہ تہجّد گزار نظر آئیں جس کی تحویل سے ہم ابھی ابھی آزاد ہوئے تھے۔ بہر حال آپ نے

حسبِ معمول خوش آمدید کہنے کے لئے مُنہ کھولا اور معاً آپ کی آواز کی خنک لہر سے جہاز کے تھرمامیٹر میں پارہ گرنے کی آواز سُنائی دی۔ ہم نے اپنے ایمان کو ٹٹولا تو بالکل سالم اور صحت مند پایا۔ کیا مجال جو ذرا سی آنچ بھی آئی ہو اور آتی بھی کیسے؟ برف خانے سے آنچ نہیں اُٹھا کرتی۔ بلکہ قرائن سے نظر آتا تھا کہ ضرورت کے وقت آپ آگ بجھانے کے آلے کا کام بھی دے سکتی ہیں۔ باقی رہا ان کے قرب سے تولیدِ خون کا امکان تو فی الحال انجمادِ خون کا خطرہ زیادہ قریب تھا۔ دراصل پی آئی اے نے محترمہ کے ساتھ زیادتی کی تھی یعنی مشیعت ایزدی نے انہیں ایئر ہوسٹس پیدا نہیں کیا تھا۔ لیکن پی آئی اے نے بزور کر دیا تھا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ آپ کسی کام کے قابل نہیں تھیں۔ یہ بات نہیں۔ آپ ٹیلی ویژن پر پکا راگ گا سکتی تھیں جہاں آپ کو مزید مُنہ بگاڑنے کی حاجت نہ ہوتی۔ یا آپ ایکسچینج آپریٹر بن کر عشق باز فون کندوں کو غائبانہ طیش دِلا سکتی تھیں اور اگر کوئی ایسا ہنر نہیں جانتی تھیں تو فقط شادی کر کے خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام تہ و بالا کر سکتی تھیں۔ الغرض زمین پر ان کی جولاں گاہ بڑی وسیع تھی لیکن آسمانی میزبانوں کی دُنیا میں آپ بہت بے جا لگتی تھیں۔ بجھا بجھا سا ناہونہار چہرہ، لحیم گال، سقیم آنکھیں اور ضخیم ہونٹ جن تک مسکراہٹ کی رسائی مونٹ ایورسٹ کی برفیلی چوٹی سر کرنے سے کم نہ تھی اور جن کی وسعت میں لپ

سٹک نے تھک ہار کر دم توڑ دیا تھا کسی غیر جانبدار شخص کے نزدیک بھی یہ ہوائی میزبانی کے لچھّن نہ تھے۔

بہر حال ہم نے موصوفہ کی خوش آمدید کے جواب میں اپنے جذبات پر قابو رکھا اور خاموشی سے ان سینئر افسروں کے پیچھے بیٹھ گئے جو سراپا تصویر درد بنے سنگتروں کا مقاطعہ کئے بیٹھے تھے اور کئی ایک تو اپنی بیویوں کو جانِ من سے خطاب کر کے خط لکھ رہے تھے اور از راہِ پشیمانی اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے۔

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ہم نے بھی پی آئی اے کے سلیکشن بورڈ کے خلاف احتجاج کے طور پر کھانے پینے کی ہڑتال کر دی اور اپنی سیٹ کی پشت کو پیچھے گرا کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ ہم آنکھیں کھول کر بھی لیٹ سکتے تھے لیکن کُچھ دیکھنے کو بھی ہوتا۔ ذوقِ دید کو گوارا نہ ہوا کہ یُوں بلا ضرورت چشمِ بینا وَا کی جائے۔ ویسے آنکھیں بند رکھنے کی ایک مزید وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری جوڑواں سیٹ پر یعنی بالکل ہمارے پہلو میں ایک تنگ لباس میم صاحبہ اپنے بیشتر Secret weapons (خفیہ ہتھیار) بے نیام کے نیم دراز تھیں مگر اس اسلحہ کی نمائش کے باوجود بے ضرر تھیں کہ قیافتہً انہیں اپنے آخری ہمنشیں کو شکار کئے ہوئے کم و بیش تیس برس بیت چکے تھے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ان کی بے نیش

عریانی محض ویرانی کا اشتہار تھا اور صاف ظاہر تھا کہ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا۔ سو اس بے اشتعال ماحول میں آنکھیں موند لینے کے سوا کسی دیگر مفید شغل کی گنجائش نہ تھی۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں

وُہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ائیر ہوسٹس کو ڈائن کس نے کہا ہے؟

کُچھ دیر بعد اچانک ائیر ہوسٹس نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا:

"خواتین و حضرات، تھوڑی دیر کے بعد ہم لاہور کے ہوائی اڈّے پر اُترنے والے ہیں۔ براہ مہربانی اپنے سگریٹ بجھا دیں اور حفاظتی بند باندھ لیں۔"

یہاں تک تو اعلان مناسب اور ضروری تھا لیکن خاتمہ کلام سے پہلے محترمہ نے یہ بھی کہہ دیا۔

"ہمیں امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہو گا۔"

جو نہایت نامناسب اور غیر ضروری تھا۔ کُچھ مسافروں نے تو اس امیدِ بے جا کے اظہار پر سختی سے اعتراض کیا۔ ایک سینئر افسر یہ کہتے سنا گیا:

”ایسا بانجھ سفر اور خوشگوار؟ کیا اس لئے کہ کریش (CRASH) ہونے سے بچ گئے ہیں؟“

ایک اور صاحب بولے: ”یہ جراحت کے بعد نمک پاشی ہے۔“

پچھلی نشستوں سے ایک غضب ناک احتجاج بلند ہوا اور کسی دِل جلے نے غصّے میں آ کر ائیر ہوسٹس کو براہ راست ڈائن کہہ دیا جو بہت غلط تو نہ تھا لیکن بہت پارلیمانی بھی نہ تھا۔ اس پر ایک نستعلیق سے پولیس مزاج افسر برداشت نہ کر سکے تو بپھر کر پچھلی سیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے پُر رعب انداز میں بولے:

”ائیر ہوسٹس کو ڈائن کس نے کہا ہے؟“

ادھر سے اتنا ہی بارعب جوابی سوال کیا:

”ڈائن کو ائیر ہوسٹس کس نے کہا ہے؟“

اس کے بعد جہاز میں خاموشی چھا گئی اور مسافروں نے اپنے حفاظتی بند باندھ لئے۔ پولیس مزاج افسر نے بھی موقع کی نزاکت دیکھ کر مُنہ میں سنگتری ڈال لی۔

کیا تھانے کی آب و ہوا عشق کو راس ہے؟

لاہور کے رن وے پر جہاز رُکا تو ارشاد ہوا کہ کراچی جانے والے مسافر آب و ہوا بدلنا چاہیں تو پینتالیس منٹ کے لئے نیچے جاسکتے ہیں۔ ہمیں یُوں بھی جہاز میں بیٹھنے کا شوق نہ تھا۔ ادھر نیچے ہال میں جاوید اور امین انتظار کر رہے تھے اور ان دونوں سے ملنا لازم تھا۔ جاوید سے اس لئے کہ ان دِنوں ایک طرف عشق اور دوسری طرف شادی کی کشمکش میں مبتلا تھے گویا اس مقام پر کھڑے تھے جہاں پیچھے کعبہ تھا اور آگے کلیسا۔ اور اس ایمان و کفر کے معاملے میں ہم سے ایک فیصلہ کُن مشورہ چاہتے تھے اور ہر چند کہ اس معرکے کے لئے صحیح ریفری غالب ہی تھے، تاہم اس خیال سے کہ چچا کی خدمات حاصل کرنا ممکن نہیں، ہمیں ایک دوست کے کام آنے میں بخل نہ تھا اور امین سے ملنا اس لئے لازم تھا کہ اگر انہیں جاننے والا ان کے گرد پانچ میل کے نصف قُطر میں کسی مقام پر اتفاقاً موجود ہو اور ان سے تبرکاً دو چار لطیفے سُنے بغیر اس دائرے سے نکل جائے تو سمجھو کہ دائرہ اسلام سے نکل گیا۔ یہ نہیں کہ ان کے لطیفے بہت اسلامی ہوتے تھے، فقط یہ کہ مسلمانوں کو بہت موافق آتے تھے۔ البتہ سبزی خوروں پر یہ کلامِ نرم و نازک قطعاً بے اثر تھا۔ جو شخص بھی محمدّ امین کے لطیفوں پر پھڑک نہ اُٹھا، تحقیق پر گو بھی اور شلغم کا شیدا نکلا۔ یعنی ذوق سے محروم اور وجدان سے عاری کہ سبزی خوروں میں ذوق

اور وجدان کی جگہ رتیح لے لیتی ہے۔ چنانچہ ان صالح گوشت خور دوستوں کی کشش سے بلا تاخیر جہاز سے باہر نکلے۔ آگے جاوید اور امین کھلے بازو اور خالی آغوش لئے منتظر کھڑے تھے۔ پہلے جاوید بولے اور قصّہٴ درد سنانے لگے۔ یہ قصّہٴ درد نہ تھا، فریاد تھی، آہ تھی۔

"کلیسا والی کی تیغِ ابرو کا کشتہ ہوں اور اس کے حسن جہاں سوز کا سوختہ ہوں۔ وُہ راضی بھی ہے مگر صاحبِ کلیسا، یعنی اس کا باپ راضی نہیں۔ بے چاری دن رات اسے منانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یعنی وُہ راتیں چھوڑ کر جن میں مجھ سے چوری ملتی ہے۔ لیکن وُہ ظالم ایک نہیں سُنتا۔ کل بتا رہی تھی کہ جب بھی آتا ہے ترا نام میرے نام کے ساتھ تو بپھر اُٹھتا ہے اور کہتا ہے تھانے میں رپٹ لکھوا دوں گا۔ یہ ہیں ارادے اس ہونے والے خُسر کے۔ ادھر گھر والے ایک اپنی پسند کی حورِ شمائل انتخاب کئے بیٹھے ہیں۔ انتخاب یہ بھی لاجواب ہے اور اصرار بھی بے حساب ہے، مگر ہاں کرنے میں کلیسا والی حائل ہے۔ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟"

ہم نے کہا "دیکھو صاجزادے، جس لڑکی کی شادی باپ کی رضامندی کی محتاج ہے وُہ شادی کے بعد بھی بِلا اجازت عشق نہ کر سکے گی اور یہ آپ کی ازدواجی صحت کے لئے مفید نہ ہو گا۔ لٰہذا جی کڑا کر کے کلیسا والی سے ایک الوداعی ملاقات کرو اور اس سے کہو

کہ جانِ من، قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اب ابّا کو منانے کی کوشش بند کر دو ورنہ بالکل ممکن ہے کہ تمہاری مساعی جمیلہ مُجھے یا ہم دونوں کو تھانے یا جیل تک پہنچا دیں اور ان دونوں مقامات کی آب و ہوا عشق کو راس نہیں۔ پھر اس کے بعد جب کلیسا والی سے چھٹی مل جائے تو اولین فرصت میں کعبہ والی سے شادی کر لو کہ اس کے راستے میں کوئی نارضامند باپ یا تھانہ نہیں آتا۔" قصّہ کوتاہ، جاوید مان گئے اور آج حسبِ معمول ایک گڑیا سی بیٹی کے باپ ہیں۔

باقی تیس منٹ میں ہم نے امین صاحب سے لطیفے پر لطیفہ سُنا۔ اور اس طرح آئندہ تین ماہ کے لئے زادِ سفر جمع کر لیا۔ تذکرۃً امین صاحب نے ہم سے پوچھا کہ پنڈی سے لاہور تک سفر کیسا رہا؟ ہم نے کہا: ائیر ہوسٹس کے سوا سب خیریت تھی۔ اس پر آپ نے ائیر ہوسٹسوں کے متعلق ایک نہایت ہی متبرک الوداعی لطیفہ سنایا۔ اگر کبھی آپ سے ملاقات ہو گئی تو یہ لطیفہ زبانی تو سنا سکیں گے لیکن افسوس ہماری تحریر اس کی طہارت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ضرورت ہے ایک معتدل ائیر ہوسٹس کی

لاہور سے روانہ ہوئے تو وُہی جہاز تھا اور وُہی جہاز کا عملہ مع ائیر ہوسٹس! ظاہر ہے کہ قیامِ لاہور کے وقفے میں پی آئی اے والے اتنی عبرت حاصل نہ کر سکے تھے کہ لاہور

سے آگے کوئی متبادل اور معتدل سی ائیر ہوسٹس شریکِ سفر کر دیتے۔ یہ نہیں کہ ان کے پاس اچھا مال نہ تھا۔ ہم نے لاہور ائیر پورٹ کی غلام گردشوں میں کئی دلآرائیں اور شہنازیں چلتی پھرتی دیکھی تھیں۔ لیکن وُہی بات کہ اصلی مال کی ذخیرہ اندوزی کا چسکہ بُرا ہے۔ اعلیٰ کوالٹی کی جنس کو خواہ یہ چینی ہو چائے ہو یا ائیر ہوسٹس کوئی صاحبِ اختیار باہر کی ہوا نہیں لگنے دیتا۔ لیکن ہوائی سفر کوئی روز روز تو کرتا نہیں۔ چنانچہ آج کی پرواز میں اعلیٰ قسم کی ہوسٹس کی پس اندازی مسافروں کو بالکل موافق نہ آئی۔

کراچی اُترے تو خلافِ توقع ٹھنڈی ہوا کے نکیلے اور ہٹیلے جھونکے خیر مقدم کو آئے۔ کہاں وُہ لاہور کی لیچڑ لو اور کہاں یہ کراچی کی کافر ہوا کہ ہمارے گرد و پیش جملہ عقدہ ہائے حسن و جمال کھلنے لگے۔۔۔ وُہ زلفوں کی پریشانیاں، وُہ آنچلوں کی شادمانیاں اور وُہ ساڑیوں کی حشر سامانیاں۔ ہمارے معمر دورہ باز افسروں کے وُہ ارمان جو دمِ پرواز پورے نہ ہوئے تھے، دمِ رفتار نکلنے شروع ہوئے اور آخر کار کسی قدر آسودگی کے عالم میں لمبی سٹاف کاروں میں بیٹھ کر قصرِ ناز کو چل دیئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہماری ٹیکسی نے بھی شہر کا رخ کیا۔

وُہ جس کا ظاہر افسرانہ اور باطن چپراسیانہ ہے

کراچی پہنچ کر سروسز کلب میں ڈیرے ڈالے۔ سروسز کلب کی ساخت عجیب ہے۔ اس کا صحن گل و گلزار، اس کا ڈرائنگ روم سدا بہار، مگر اس کے رہائشی کمرے خار زار اور اس کا کھانا زبون و خوار۔ ایک زمانہ تھا۔۔ اور وُہ انگریز کا زمانہ تھا۔۔ کہ ہم فوجی افسروں کو ہدایت تھی کہ شہری زندگی میں کوئی ایسی حرکت مت کیجو جو دُوسرے درجے کے آدمی کرتے ہوں۔ قیام کرو تو فسٹ کلاس ہوٹل میں۔ سفر کرو تو فسٹ کلاس ڈبّے میں، سینما دیکھو تو فسٹ کلاس نشستوں میں ۔ ذرا کوئی افسر ردی ریستوران، سستی سواری یا گھٹیا گھاٹ پر دیکھا گیا اور کورٹ مارشل نے آ دستک دی۔ لیکن ایسا حادثہ ہوتا شاز ہی تھا کیونکہ یہ ان دِنوں کی بات ہے جب قیمتوں کے قدم سطحِ زمین ہی پر تھے اور تنخواہوں میں افسرانہ وقار کو آفتاب آثار رکھنے کی طاقت تھی۔۔ چنانچہ درجہ اوّل کے مقامات و مشاغل پر انہی کا اجارہ تھا۔ یہ لوگ مری جا کر سیسل ہوٹل سے باہر قدم رکھنا ہتک قدم سمجھتے تھے اور لاہور میں فلیٹی سے باہر دیکھنا توہینِ نگاہ گردانتے تھے۔ لیکن پھر زمانہ بدلا۔ قیمتوں اور کرایوں نے پر پرواز تولے اور افسروں کو سوتا چھوڑ کر چاند کے رستے مریخ کو بڑھنے لگے۔ افسرانہ تنخواہوں اور الاؤنسوں نے لبِ بام تک تو ان کا پیچھا کیا لیکن پھر مُنہ کے بل گر پڑے اور بتدریج افسرانہ جاہ و جلال کا رنگ روپ بِگڑنے لگا

اور ان کے سفر و حضر کے لوازم سکڑنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کسی انٹر کانٹینینٹل یا پیچ لگژری ہوٹل میں کوئی فوجی افسر نظر نہیں آتا۔ اب یا تو وہاں درآمد اور برآمد کے رمز شناس لکھ پتیوں کا قبضہ ہے یا صابن ساز اور پارچہ باف کروڑ پتیوں کا۔ یعنی اوّل درجے کے ہوٹل اور ہنگامے یا تو اوّل درجے کے بنیوں کے ہو کر رہ گئے ہیں یا پرلے درجے کے سمگلروں کے۔ لیکن فوجی افسروں کو اپنے وقار کی حفاظت تو بہر طور کرنا ہے۔ لہٰذا انہیں ایک ہی جائے پناہ نظر آتی ہے اور وُہ ہے سروسز کلب جس کا ظاہر افسرانہ ہے اور باطن چپڑاسیانہ۔ لیکن یہی ایک مقام ہے جہاں غریبی میں خودی کی نگہبانی ممکن ہے۔

چنانچہ سروسز کلب میں ڈیرہ ڈال کر ہم نے خودی کی بیرونی حفاظت تو مستحکم کر لی لیکن جب اندرونی حفاظت کے لئے کھانے کی میز پر جا بیٹھے تو معلُوم ہوا کہ سوائے کافی کی پیالی کے باقی تمام بارود بیکار ہے۔ رہی سہی کسر رات کو آہنی پلنگ، سنگین بستر اور چوبی تکئے نے پوری کر دی، مگر علی الصبح جب بیرا چائے لایا تو ہمارے اندر افسری نے پھر کروٹ لی۔ الغرض ساڑھے سات بجے کے قریب ہم پھر کرنیلی لگا کر خلق کے مقابلے میں آ گئے۔۔ لیکن ڈرائنگ روم میں ناشتہ کرنے بیٹھے تو آگے سویوں کی مغموم سی پلیٹ رکھی تھی اور بس۔ ہمیں پھر وُہ لفٹینی کے دن یاد آئے جب ہمارے میس کی میز شیر،

شکر، شہد اور شمپین سے لدی ہوتی تھی لیکن چھوڑیئے ان بھولی ہوئی کہانیوں کو دلِ حزیں کو بادہ شبانہ کی سر مستیاں یاد کر کے اور ملال ہو گا۔

معاف کیجئے گا۔ تاج محل آج دورے پر ہے۔

ناشتے کی میز پر سے اُٹھے تو دوستوں کو فون کرنے چل پڑے کہ ہم کراچی میں ہیں۔ فارغ ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرنا چاہو جو شاہوں کی شان کے شایاں ہو تو ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔

آغا غلام حسین[14] بولے۔ "کار بھیج رہا ہوں، جتنی سیر اکیلے کر سکتے ہو کرو۔ باقی میں شام کو کرادوں گا۔"

ابن انشا بولے: "ہم بھی فارغ بیٹھے ہیں۔ آؤ اور جو سلوک جی چاہے کرالو۔"

ہم نے کہا "شکریہ جہاں گردِ اعظم۔ ذرا ہمارے لئے ایک مفصّل ہدایت نامۂ سیر و تماشہ تیار رکھئے گا۔ ہم بھی گھر سے سفر یورپ کے ارادے سے نکلے ہیں۔" مشتاق احمد یوسفی کو حسبِ معمول بینک اور بارگاہ سے غیر حاضر پایا۔ کراچی جا کر یوسفی کی ملاقات سے محروم رہنا ایسا ہی ہے جیسے آگرہ جا کر تاج محل نہ دیکھنا۔ یوسفی دیدار سے زیادہ

---

[14] دوستوں کے کام اور ماتحتوں کے آغا صاحب

گفتار کے تاج محل ہیں۔ ان کی زبان سے، ان کے قلم کی طرح ہر لفظ گُلبدن بیگم بن کر نکلتا ہے اور ہمیں انہی گلبدن بیگموں کی دید کا شوق تھا۔ مگر وائے قسمت کہ فون کیا تو پتہ چلا کہ تاج محل تو دورے پر ہے۔ ناچار از راہِ تلافی ہم نے "خاکم بدہن" کا ایک نسخہ اپنے ساتھ رکھ لیا کہ یہ بھی تاج محل کا جیبی نمونہ ہے۔

حکیم محمّد سعید کے درجن بھر ٹیلی فون نمبروں سے ایک پر تجربۃً قسمت آزمائی کی تو جواب میں کسی نے ایک درجن مزید ٹیلی فونوں کی فہرست لکھوادی۔ گویا حکیم صاحب کو ڈھونڈنے سے ایک نیا امریکہ دریافت کرنا آسان تھا۔ ناچار ٹیلی فون رکھ دیا۔ ہمیں حکیم صاحب کی ملاقات کا شوق تھا کہ وُہ پاکستان بھر میں سب سے شیریں ادا حکیم ہیں۔ ان کی شیریں تریں ادا شربت روح افزا کی تخلیق ہے جسے مشروبِ مشرق بھی کہتے ہیں۔ قاعدے کی رُو سے اب تلافی کی تو یہی صورت تھی کہ ہم ایک بوتل روح افزا بھی ساتھ رکھ لیتے لیکن ہم نے ایک بہتر بدل یعنی حکیم صاحب کا فوٹو جیب میں ڈال لیا کہ مشروب کی مشرقیت سے حکیم صاحب کی اپنی مشرقیت کہیں زیادہ مفرّح ہے۔ آپ کے وجود پر کالے چشمے کے سوا کوئی مغربی آثار نہیں۔

نقشہ راہ سلوک کے مقامات کا

اتنے میں کار آگئی اور ہم سیدھے بندر روڈ پر تھیوسافیکل ہال پہنچے۔ جہاں ابن انشا اپنی تھیوسافی[14] کے زور سے ہمارے لئے بیروت، جینوا، پیریں وغیرہ کے نقشے مع جملہ کارواں سراؤں، غلام گردشوں اور چور دروازوں کے تیار کئے بیٹھے تھے۔ آپ نے چند لفظوں میں ہم سے بیعت لی اور پھر نقشوں کی مدد سے بڑی تیز رفتاری سے راہِ سلوک کی مختلف منازل طے کرانے لگے۔ آپ نے وہم و تشکیک کے پردے ایک ایک کر کے چاک کر ڈالے اور جملہ اسرارِ نہانی بے حجاب کر کے رکھ دیئے۔ پھر آپ نے ان مقامات کی نشان دہی کی جہاں اپنے گزشتہ سفر میں حسبِ ضرورت قرم، کلیجا یا سر رکھا تھا اور ہمیں ہدایت فرمائی کہ خدا توفیق دے تو انہی مقامات پر اپنا قدم، اپنا کلیجا اور اپنا سر بھی رکھنا۔ اور پھر آپ نے ان مقامات پر سُرخ پنسل سے لال دائرے کا نشان لگا دیا کہ مریدِ نو مشق صراطِ مستقیم سے بھٹک نہ جائے۔ پھر ذرا کم اہم مقامات پر آپ نے نیلے دائرے کا نشان ثبت کیا۔

آخر میں آپ نے ہاتھ اُٹھائے اور ان راہوں پر چلنے کے لئے جو بہت زیادہ مستقیم نہ تھیں۔۔ ہماری استقامت کی دُعا مانگی۔ معاً ہمارا دھیان اپنی بش شرٹ کے گریبان کی

---

[14] یہ عقیدہ کہ ہر شخص بلا واسطہ خدا کی معرفت اور روحانی وجدان حاصل کر سکتا ہے۔

طرف گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سینہ کی پر اسرار روشنی سے جگمگا رہا ہے اور ظاہر کی آنکھ بند کرتے ہیں تو باطن کی وا ہو جاتی ہے۔ دمِ رخصت آپ نے مزید پند ہائے سود مند اور خصوصاً بیروت کے کسینو کے متعلق موعظۂ حسنہ ہم پر دم کئے اور ہم نے نہال ہو کر پیرِ کامل کو الوداع کہا۔

ایک پلیٹ تازہ ناول کی

حسبِ وعدہ پچھلے پہر آغا آیا اور ہمیں سیر کو لے چلا۔ پہلی منزل ڈیفنس سوسائٹی میں ایک جگمگاتا ڈرائنگ روم، ایک جھلملاتا کافی سیٹ اور ایک چہچہاتی میزبانہ تھی۔ وہیں محترم میزبان بھی تھے لیکن ان کی حیثیت ڈرائنگ روم کے متفرق فرنیچر کی سی تھی۔ بلکہ ان کے مقابلے میں صوفہ کسی قدر زیادہ معزز نظر آتا تھا۔ بہر حال میاں بیوی دونوں سے تعارف ہوا اور تعارف کے دوران یہ راز کھلا کہ محترمہ ایک معروف قسم کی میزبانہ ہی نہیں بلکہ ایک نامعلوم قسم کی مصنّفہ بھی ہیں۔ چنانچہ کافی کی پیالی، پالک کے پکوڑوں اور سالن کے سموسوں کے ساتھ ایک پلیٹ تازہ ناول کی بھی آگئی اور ہمیں بتایا گیا کہ ناول پکوڑوں سے کسی طرح کم تازہ یا خستہ نہیں اور یہ کہ مصنّفہ کی تمنّا ہے کہ ہم کافی کے ساتھ ناول بھی نوش کرتے جائیں اور جانے سے پہلے اپنی قیمتی رائے کا اظہار کر کے ممنون کریں۔

ہم نے ناول خوانی اور رائے زنی کے لئے آتی رات کی مہلت مانگی جو مل گئی لیکن محترمہ کو یہ یقین دِلانے میں کافی وقت لگا کہ ناول کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے لازم نہیں کہ رات مصنّفہ کے ڈرائنگ روم ہی میں گزاری جائے دراصل مصنّفہ کو ہماری گزارش سے تو ایسا اختلاف نہ تھا، خرابی یہ ہوگئی کہ آپ کے شوہر محترم بھی ہماری تائید کر بیٹھے اور ہر چند کہ انکی تائید محض مسکین آنکھوں کی خفیف سی جنبش تھی، تاہم بیگم صاحبہ کے مشتعل ہو جانے کا اپنا پیمانہ تھا۔ یعنی جہاں ہم آپ اشتعال میں آکر ایک دو انچ اُچھلتے ہیں وہاں بیگم صاحبہ ایک دو فٹ اُچھل پڑیں۔ اور دو فٹ ایک غضبناک بیگم کے لئے بھی خاصی بلندی ہے۔ بہر حال اس چھوٹے سے پیالی کے طوفان کے سوا یہ ساری سوشل نشست بڑی پُر سکون رہی۔ بلکہ شوہر محترم تو اس جھاڑ جھٹک کے بعد بھی بڑی تمیز سے کافی پیتے اور وقتاً فوقتاً مُسکراتے رہے، لیکن زبان کے رستے کوئی آواز نہ نکالی۔ میاں کی زبان بندی شرائط نکاح کی دفعات میں سے ایک تھی یا آپ مادر زاد بے زبان واقع ہوئے تھے، خدا ہی بہتر جانتا ہے اور ہم نے خدائی راز کو کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

کیا سالم لڑکی سے شادی کرنا عقلمندی ہے؟

کُچھ ایسا ہی ماحول ایک دُوسرے گھر کا تھا، جہاں ہم جھیل پارک کے راستے کسی قدر تازہ دم ہو کر پہنچے۔ گویا یہ ہماری سیر کی دوسری منزل تھی۔ ظاہر تھا کہ آغا کی ان لوگوں

سے بے تکلّفی ہے۔ دروازے پر پہنچتے ہی آپ نے ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں صدا دی:

"شیمی"

اور جواب میں ایک جسیم مگر وجیہہ خاتون مع تبسّم بر آمد ہوئی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ آغا کے ساتھ اجنبی بھی ہے اپنے تبسّم کا ذخیرہ آغا ہی پر ختم کر کے ہمیں ایک غیر مرطوب اور خشک نگاہ سے دیکھا۔ آغا نے ہمارا تعارف کرایا تو ان کی خشکی میں نم کے کوئی آثار نظر نہ آئے حالانکہ آپ کی مٹّی خاصی زرخیز دکھائی دیتی تھی۔ اجنبی یا تو پہلی نگاہ ہی پر دِل میں کھب جاتا ہے یا دِل سے ٹکرا کر گیند کی طرح پیچھے کی دیوار سے جا لگتا ہے۔ ہمیں بھی دِل اور پھر دیوار سے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ آغا کہ پرانا زَن شناس تھا اور بظاہر شیمی کے مزاج کا سپیشلسٹ، بولا۔

"شیمی یہ میرے دوست ہیں۔ کوئی چیز منگوانا ہو تو بتاؤ- یہ ولایت جا رہے ہیں۔" گامے کا یہ کہنا تھا کہ شیمی نے گویا بلا تاخیر گیند اُٹھالی اور دوپٹے کے نیچے سینے سے لگالی۔ ہمیں واضح طور پر کھبنے کا احساس ہوا۔ محترمہ آغا کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے فی الفور ہمیں صوفے تک لے گئیں اور بٹھا کر پوچھا:

"تو آپ ولایت جا رہے ہیں۔ کب؟"

اگر آپ آج تک تعویذ سلیمانی استعمال کرتے رہے ہیں تو ناحق وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ آئندہ اسمِ اعظم استعمال کریں یعنی سیر ولایت کا جھوٹ یا سچ بولیں۔ مراد پائیں گے۔

اتنے میں پردے کے پیچھے سے بظاہر ایک مردانہ چہرہ نمودار ہوا۔ اگر یہ شیمی کے شوہر تھے تو ان سے زیادہ سہما ہوا شوہر دنیائے اسلام میں کہیں نہیں تھا۔ شیمی نے انہیں نظر ایک سرسری نگاہ سے دیکھا لیکن اس ایک نگاہ میں کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی، مفصّل ہدایات تھیں کیونکہ موصوف وہیں سے پلٹ گئے اور پانچ منٹ کے بعد مشروبات سے لدی ہوئی سینی اُٹھا لائے۔ تعارف پر معلُوم ہوا کہ فی الواقع آپ ہی اس گھر میں خاوندیت کے تہمت بردار ہیں۔ غور سے دیکھا تو آپ ذرا جانے پہچانے نظر آئے اور پھر نے ہم پر القا ہوا کہ آپ تو کوئی دس سال پیشتر پنڈی میں ہمارے ہمسائے تھے اور کنوارے تھے۔ جب اس الہڑ کنوارے کا تصور یکلخت ایک پالتو خاوند کی صورت اختیار کر گیا تو ہم پر رقت طاری ہو گئی اور ہم نے اپنے آنسوؤں کو گرتے گرتے سنبھالا۔ لیکن وُہ اپنے آنسو نہ سنبھال سکے۔ گویا کہہ رہے ہوں۔

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں؟

ہمیں پہچان کر ان کا ہم سے بھی برا حال ہو گیا۔ یُوں معلُوم ہو تا تھا جیسے غریب ابھی ایک آہ جہاں سوز کے ساتھ نالہ کھینچتا ہے اور بہاگ میں کلامِ اقبال چھیڑ تا ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

لیکن کہیں سے اشارہ پا کر آپ نے پھرتی سے آنسو پونچھے اور ایک ہچکی لے کر پوری آہ ضبط کر گئے۔ معاً ہمیں یاد آیا کہ یہ ایک بڑی چلبلی اور چنچل لڑکی پر مرا کرتے تھے جو اپنے دیگر قابلِ دید مقامات کے علاوہ چاہ ذقن کی وجہ سے مشہور تھی۔ پھر ہم نے شیمی کی ٹھوڑی کا سرسری معائنہ کیا اور اس چاہ ذقن کے آثار دیکھے جو امتداد زمانہ اور چربی کے ہاتھوں اب کسی قدر اٹ چکا تھا لیکن ہموار نہیں ہوا تھا۔ یعنی قتل عاشقاں کی شہادت موجود تھی۔ بیشک شیمی وُہی لڑکی تھی اور پھر ہمیں چچا گلزار کی وُہ پیغمبرانہ بات یاد آئی جو انہوں نے ان کی شادی پر کی تھی۔ چچا نے کہا تھا۔

"اس لڑکے کو جزو کل میں تمیز نہیں، یہ مرتا اس کے چاہ ذقن پر ہے اور شادی سالم لڑکی سے کر[۱۵] رہا ہے۔ پچھتائے گا۔"

---

[۱۵] شفیق الرحمٰن سے معذرت کے ساتھ

اور آج دس برس کے بعد ہم دیکھ رہے تھے کہ وُہ پچھتانے سے گزر کر چند اگلی منزلیں بھی طے کر چکا تھا۔ یعنی مشکیں کسوا چکا تھا، پھڑ پھڑا چکا تھا اور اب سلو موشن میں دم توڑ رہا تھا۔

مشروبات کے خاتمے کے ساتھ ملاقات بھی ختم ہوئی۔ باہر نکلے تو ہم نے آغا سے پوچھا۔ "آغا۔ یہاں کوئی تمہارا دوست بھی ہے جس کے ساتھ گھر میں کم از کم مساوات ہی برتی جاتی ہو؟"

کہنے لگے۔ "کئی ہیں لیکن میں تمہیں سیر کرانے نکلا ہوں نہ کہ اخلاقِ حسنہ کا درس دلانے۔ مساوات والے گھروں میں باہمی اَدب و آداب سے ماحول اس قدر بوجھل ہو جاتا ہے کہ کمر دُکھنے لگتی ہے۔ کبھی تم نے مساوی طور پر مؤدب میاں بیوی کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا ہے؟ اگر تم نے نہیں دیکھا تو شیکسپیر نے دیکھا ہے اور معلُوم ہے وُہ اس باہمی خوشامد کے متعلق کیا کہتا ہے؟"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے جیسے دو ببون بندر ایک دُوسرے پر از راہِ شفقت دانت نکال رہے ہوں۔"

"یہ تو بڑی ہولناک سی تشبیہ ہے۔" ہم نے چونک کر کہا۔

بولا ”جبھی تو میں ایسے گھروں سے پرہیز کرتا ہوں۔ جب تک گھر میں، یعنی کسی دُوسرے کے گھر میں، تھوڑی سی عدم مساوات نہ ہو زندگی میں شگفتگی نہیں آتی۔ ایسی برخوردارانہ فضا میں نہ خوباں سے چھیڑ چل سکتی ہے نہ پاسبانِ عقل کو دھکا دیا جا سکتا ہے اور ہاں نوٹ کر لو، یہ گاما نہیں بول رہا، غالب اور اقبال بول رہے ہیں۔ اونہہ ہوں۔“

آغا کی طبیعت میں سیڈ ازم[16] کا جاندار شائبہ تھا بلکہ وُہ یہ زیادتی اپنے آپ سے بھی روا رکھتے تھے۔ گولڈن مین[17] کا ترجمہ سنہری کمینگی کرتے تھے کیونکہ آپ کوئی کام کرتے تو حد سے گزر کر ہی دم لیتے۔ کہتے تھے ”زندگی قلندرانہ تجاوزات کے بغیر مرگ بے شرف ہے اور اعتدال پسندی کا نامردی سے قریبی رشتہ ہے۔“ ایک دن انہیں بلانوشی پر ٹوکا تو کڑک کر بولے

”کارِ ثواب میں حائل ہوتے ہو؟“

کہا ”ثواب تک پہنچتے پہنچتے اپنی صحت کا ستیاناس کر لو گے۔“

---

[16] (SADISM) ایذا رسانی میں لطف لینا۔

[17] (GOLDEN MEAN) اعتدال کا سنہری اصول فقط MEAN کے معنی اعتدال بھی ہوتا ہے اور کینہ بھی

آغا نے اپنے توانا کندھوں کو پھیلاتے ہوئے کہا

”آؤ کشتی لڑ کر صحت کا فیصلہ کر لیں۔ ہو جائے مقابلہ سکاچ اور لیمن سکواش کا۔“

”لیکن سکاچ کا اثر تو لانگ رَن [۱۸] میں ہو گا۔“ ہم نے عقل کے زور سے ڈرایا۔

”برخوردار میں پچیس سال سے پی رہا ہوں۔ میں تو کب کا لانگ رَن میں ہوں۔“ گامے نے تجربے کے زور سے جواب دیا۔

---

[۱۸] LONG RUN معنی بُہت عرصے کے بعد

ائیر ہوسٹس گھر اُجاڑنے میں کیا مدد دے سکتی ہے؟

بالآخر وہ وقت آیا کہ ہم جملہ احباب سے بچھڑ کر اور اعدا سے بچ کر تقریباً صحیح سالم کراچی ائیر پورٹ پر پہنچے جہاں ہمارے انتظار میں پی آئی اے کا بوئنگ ۷۰۷ کھڑا تھا۔ ہم نے زینے پر قدم رکھا اور قدم رکھتے ہی اس خوش آمدید کے مکاطب بنے جس کے لئے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ یعنی ان لبوں سے خیر مقدم کے الفاظ سنے جن کی نازکی بیان کرنے کے لئے خُدا نے میر کو پیدا کیا تھا۔ یہ لب، یہ گلاب کی پنکھڑیاں، ایک سچّی اور کھری ائیر ہوسٹس کے تھے جس کی تخلیق میں فطرت اور پی آئی اے سے کوئی ایک غلطی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ پر ہی ہمارے پنڈی سے

کراچی تک کے گلے ڈُھل گئے۔ اور دوسری نگاہ پر ہم نے جملہ متعلقان پی آئی اے کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا۔

جہاز کے اندر داخل ہوئے تو ایک دوسری شاخِ نبات ہمارے بورڈنگ کارڈ کا بارِ گراں اٹھائے ہمیں اپنی مخصوص نشست تک لے گئی۔ وہ سراپا تواضع آگے آگے اور ہم سراپا تفاخر پیچھے پیچھے۔ جونہی ہماری سیٹ آگئی، اس نے مرصع مسکراہٹ کے ساتھ ہماری نشست کی طرف اشارہ کیا۔ سیٹ پر بیٹھ تو شاید ہم خود بھی جاتے لیکن اتنے پیارے اشارے کا مشار الیہ بننے کے بعد بیٹھنے میں ہمیں ایک توانائی کا سا احساس ہوا جیسے ٹانک پی لی ہو۔ خُدا جانے ایک ایسے ہی موقع پر غالب پر کیوں اُلٹا اثر ہوا تھا۔ چچا بیچارے نڈھال ہو کر آہیں بھرنے لگے تھے۔ "طاقت ربا وہ اس کا اشارہ کہ ہائے ہائے۔" چنانچہ ایک آسودگی کے عالم میں اپنی نشست پر فروکش ہوئے لیکن پہلی سنگتری کے بعد جونہی استقبال کے ابتدائی سحر سے سنبھلے اور حساب بیش و کم کی تمیز آئی تو ہم پر کھلا کہ اعلیٰ کوالٹی کے چاولوں کی طرح بڑھیا قسم کی ایئر ہوسٹیں بھی برآمد کے لئے ہی استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن وُہ جو اندرونی پروازوں میں آسمانی دکھائی دیتی ہیں، دراصل بڑی خاکی ہیں اور یہ کہ سماوات کی سروری فقط بیرونی پرواز کی پریوں ہی کو زیبا ہے۔

دخترانِ فلک کے قصیدہ کو ہم نے قصداً طول دیا ہے۔ کُچھ تو یہ حکایت لذیذ ہے اور ذرا دراز تر کہے جانے کے قابل ہے اور کُچھ ہم اپنی تلخ نوائی کی تلافی بھی کرنا چاہتے ہیں جو پنڈی کراچی کے سفر میں ہم سے سرزد ہوئی تھی۔ ہمیں توقع ہے کہ نکتہ رس قاری اس بات کی داد دے گا کہ جہاں ہم کج اداؤں کے ساتھ اظہارِ بیزاری میں بُخل نہیں برتتے، وہاں زہرہ جبینوں کی دِلداری میں اسراف بھی روا رکھتے ہیں۔ بلکہ خاص حالات میں تو گھر بشمول دِل بھی لُٹا دیتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ وُہ شخص جو تعریف تو کرے مگر قبض کے ساتھ، تحقیق، بخیل ہی نہیں، رزیل بھی ہے۔

اُڑنے سے پیشتر ایک رس بھری آواز نے براہ مائیکروفون ہمیں خوشامد کی حد تک خوش آمدید کہا اور خوش آمد کا مزا ابھی مُنہ ہی میں تھا کہ بوئنگ فضا میں بلند ہوا۔ جب بہتّر درجے کی بہار آفریں بلندی پر پہنچا تو تواضع کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے نگار آئے، پھر ناشتہ آیا۔ پھر سگار آئے اور آخر سوال آئے۔ ''کُچھ پیجیئے گا؟ کُچھ پڑھیے گا؟ سر کے نیچے تکیہ رکھ دوں؟ پاؤں کے نیچے دِل رکھ دوں؟ اپنی جاں نذر کروں؟ اپنی وفا پیش کروں؟۔''۔ خُدا جانے اس توبہ شکن تواضع نے کتنے شوہروں کے مزاج بگاڑے اور گھر اُجاڑے ہوں گے، لیکن معاف کیجئے یہ سوال ہمیں بعد از وقت سوجھ رہا ہے۔ اس وقت بوئنگ کے مسافروں کو ایسے فاسد سوالوں کا مزاج نہ تھا۔ اگر کوئی پوچھتا تو جواب

صاف تھا، مزاج بگڑتا ہے تو بگڑنے دیجئے۔ گھر اُجڑتا ہے تو اجڑنے دیجئے۔ ناصحو اس لمحہ یہ سب فکر فضول ہے، جب حشر کا دن آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔

جب تواضع کا طوفان تھما تو آہستہ آہستہ ہوسٹسوں نے بھی پر سمیٹے اور ایپرن اُتار کر اپنے آستانے میں ستانے لگیں، اگرچہ پھر بھی گھنٹی کی آواز پر کبھی روتے بچّوں کے مُنہ میں مصنوعی نپل اور کبھی بسورتے بوڑھوں کے دہن میں اصلی اسپرو ڈالتے نظر آئیں۔ بہر حال ایک مختصر سے بے ہوش وقفے میں ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جہاز میں ہمارے علاوہ اور مسافر بھی ہیں۔ سب سے پہلے ہم نے ہم نشیں پر توجہ دی۔ آپ کے چہرے پر میرپور اور قمیص پر سالن کے آثار تھے۔ خوش قسمتی سے آپ سو رہے تھے۔ زیادہ گہرے تعارف کی نوبت نہ آئی۔

یہ صحرا یہیں رہتا ہے

کھڑکی سے باہر جھانکا تو معلُوم ہوا کہ دیارِ وطن سے کوسوں نکل آئے ہیں۔ وُہ خطۂ خاک جس پر ہم اُڑ رہے تھے، خطۂ پاک نہ تھا بلکہ پانچ میل کی بلندی سے بھی اجنبی نظر آتا تھا۔ یہ صحرا تھا اور کوئی صحرا سا صحرا! چپٹا، چیٹیل اور چوپٹ، ہم نے اپنے حافظے کے جغرافیہ داں حِصّے سے اس صحرا کا نام پوچھا تو حافظے نے اپنی معصومیت کا اظہار کیا۔ ہمیں الجھن یہ تھی کہ ہمارے علمِ فقہ کے مطابق وہاں سمندر ہونا چاہئے تھا یا ساحلِ سمندر

جہاں نقرئی بادبانوں والی خوابگوں کشتیاں رواں ہوں اور سبکسارانِ ساحل روپہلی ریت پر غسلِ آفتابی میں رو بکف فلکلیے ہوں تاکہ اُوپر سے ہمارا طیارہ گزرے تو ان تک پوشوں کو کُچھ چھپائے نہ بنے۔۔ ہمیں پورا علم ہے کہ جہاں دیکھنے والوں اور دیکھے جانے والوں کے درمیان پانچ میل کا عمودی فاصلہ حائل ہو وہاں کوئی قابلِ فہم اعضا و اجزا نظر نہیں آتے۔ تاہم التماس ہے کہ ایسا سوچنے میں کیا حرج ہے؟ رعنائی پر بے شک ہمارا تصرف نہیں لیکن رعنائی خیال تو کسی کی جاگیر نہیں اور یہ ہمارا نہیں غالب دیدہ ور کا نسخہ ہے:

ہے خیال حُسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال

لیکن اس لق و دق صحرا کے نظارے سے ہمارے خیال کا حُسن بُری طرح ریگ آلود ہو گیا۔ ہاں ایک فائدہ ہوا کہ یہ الجھن ایک تقریبِ ملاقات کا بہانہ بن گئی اور ہم نے پاس سے گزرتی ہوسٹس کو ٹھہرا کر پوچھا: "یہ صحرا کہاں سے آ گیا؟"

بولی: "جہاں تک میرا علم ہے یہ صحرا یہیں رہتا ہے۔ بہر حال یہ ایران ہے۔"

"ایران!" ہمارے مُنہ سے احتجاجاً نکلا۔ "وُہ سعدی و حافظ والا ایران! وہ آب رکنا باد و گلگشت مصلے والا ایران؟ وُہ آہوں اور غزالوں والا ایران؟ وُہ بلبلوں اور قمریوں والا یران؟ وُہ۔۔۔"

"معاف رکھئے گا۔ ائیر ہوسٹس ایک دِلآویز بے صبری سے بولی۔ ایران کے چرند و پرند کی فہرست تو بہت طویل ہے اور مُجھے دُوسرے مہمان بھی بلا رہے ہیں۔ کیا میں کوئی فوری خدمت بجالا سکتی ہوں؟ مثلاً اسپرو۔۔۔"

ہم اتنے بوڑھے تو نہ تھے کہ صدمۂ صحرا سے جانبر ہونے کے لئے ہمیں اسپرو پیش کی جاتی لیکن اتنے بچّے بھی نہ تھے کہ ہمارے مُنہ میں نپل دے دیا جاتا۔ بہر حال اسپرو کی پیش کش ہم نے شکریے کے ساتھ مگر نہایت وثوق سے ٹھکرا دی۔ ہمیں ناخوش دیکھ کر ہوسٹس بولی۔

"آپ چند گھنٹے صبر کریں۔ بیروت میں آپ کو اتنی بُلبلیں اور قُمریاں ملیں گی کہ چکلالے میں اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوتیں۔"

اور پھر ایک رواں دواں، مسکراتی گنگناتی لہر کی طرح آگے بڑھ گئی اور ساتھ ہی ہمارے جملہ شکوے اور شکایتیں بہا لے گئی۔ نیز کُچھ روشنی بھی چُرا لے گئی۔ روشنی ماند پڑی تو ہم نے بھی آنکھیں موند لیں کہ پچھلی رات بہت تھے جاگے لیٹ گئے آرام کیا۔۔۔ بیروت تک پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ کہیں بغداد کی نواحی فضا میں لنچ کے لئے جاگے بلکہ جگائے گئے۔ لنچ تو خیر لذیز تھا ہی لیکن ہم پر دیرپا اثر نان و گوشت کے ذائقے کا نہ تھا بلکہ

تواضع کے مزے کا جس نے ہمیں اور ہمارے ہم نشیں کو عارضی مہاراجا بنا دیا۔ ہمیں ریاست چکلالہ کا اور انہیں ریاست میرپور حال بریڈفورڈ کا!

پھر دفعتہً بیروت آ گیا اور ہماری بین الاقوامی زندگی کی ابتداء ہوئی۔ اس کی پہلی علامت یہ تھی کہ جونہی ہم جہاز سے اُترے ہم سے زیادہ توجّہ ہمارے پاسپورٹ کو دی جانے لگی۔ گویا پاکستان سے ہم پاسپورٹ لے کر نہیں آئے تھے بلکہ پاسپورٹ ہمیں لے کر آیا تھا اور یہ جاننے کے لئے کہ ہمارا وجود لبنان کے لئے مفید ہے یا مُضر ہماری نیّت سے زیادہ ہمارے پاسپورٹ کی نبض ٹٹولی گئی۔ جب ہمارے پاسپورٹ کی صحت ٹھیک نکلی تو ہماری تندرستی بھی تسلیم کر لی گئی۔ گویا ہماری حالت ان داستانی شہزادوں سے مختلف نہ تھی جن کی جان طوطے مینا میں ہوتی تھی۔ ہماری جان پاسپورٹ میں تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے چوما، سینے سے لگایا اور جس چیز کو کبھی دراز کی تہہ میں پھینک دیتے تھے اب دِل کی تہہ میں جگہ دی۔ یہ ہو چکا تو بسم اللہ کر کے دونوں ہاتھوں سے سامان اُٹھایا اور چل پڑے۔ ہم مہاراجگی سے بوئنگ سے اُترتے ہی معزول ہو گئے تھے۔ اور کسٹم کے راستے کُچھ عربی کُچھ انگریزی، کُچھ سچ، کُچھ جھوٹ بولتے ائیرپورٹ سے باہر نکلے۔

بیروت میں بھی آپ کی سسرال ہے

بیروت میں ہمارا کوئی واقف آشنا نہ تھا۔ پاکستان سے روانگی سے پہلے ہمارے ایک مہربان نے اپنے ایک مہربان کو جو بیروت میں مقیم تھا تار بھیج کر ہمارے استقبال کی تاکید کی تھی۔ ہم نے ائیرپورٹ سے نکل کر ہر چہرے کو دیکھا کہ کسی زاویے سے پاکستانی نظر آتا ہے یا نہیں اور آتا ہے تو آمادہ استقبال ہے یا نہیں لیکن ناکامی ہوئی۔ ناچار ہم نے ابن انشا کا ہدایت نامہ نکالا۔ لکھا تھا

"بیروت ائیرپورٹ سے ٹیکسی لے کر سیدھے الحمرا ہوٹل جایئے۔" ساتھ ہی الحمرا پر سُرخ دائرے کا نشان تھا۔ ہم نے تیزی سے الحمرا کے لئے ٹیکسی لی۔ منزل مقصود پر پہنچے تو منزل سامنے تھی مگر مقصود غائب۔ یعنی ہوٹل موجود تھا مگر رہنے کو جگہ نہ تھی۔ الحمرا کناروں تک مسافروں سے بھرا پڑا تھا۔ معلُوم ہوتا تھا بیروت کے اکثر سیاحوں کے پیرانِ طریقت نے اپنے لال دائرے الحمرا ہی پر ثبت کئے ہیں۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک بار پھر ابنِ انشا کے نقشے کی طرف رجوع کیا اور ایک نیلے دائرے والا مقام نظر آیا جو راہِ طریقت سے ذرا ہٹ کر واقع ہوا تھا لیکن تھا خاصا کارآمد۔ یہ پی آئی اے کا دفتر تھا اور الحمرا سے بہت دور نہ تھا۔ دو چار قدم ہی چلے تو سامنے ایک عمارت کی پیشانی پر سبز پاکستانی رنگ کے تین مانوس انگریزی حروف نظر آئے، PIA! دفعتاً ساری اجنبیت،

ساری کوفت دور ہو گئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وطن میں ہم پی آئی اے کے دفتر کے سامنے سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے غیروں کا گھر ہو۔ لیکن کسی غیر ملک کی گلیوں سے گزرتے ہوئے یہ تین سبز حروف نظر آ جائیں تو یُوں لگتا ہے جیسے سسرال ہو۔ اندر داخل ہوئے تو مانوس پاکستانی چہرے دکھائی دیئے۔ اُردُو میں علیک سلیک ہوئی اور پھر ہم نے اپنے تار فراموش میزبان کو فون کیا۔ ہمارے ابتدائی سلام کے جواب میں بڑی دوستانہ اُردُو آواز آئی۔

"ارشاد۔"

"کیا میں فیاض صاحب[19] سے بول رہا ہوں۔"

"بے شک یہ آپ کا خادم فیاض ہے۔ اور آپ کی تعریف۔"

"میری تعریف تو اس تار میں درج ہے جو رحمٰن صاحب[20] نے آپ کو ایبٹ آباد سے بھیجا تھا۔"

"کب بھیجا تھا۔"

---

[19] حبیب بینک بیروت کے مینجر

[20] پبلک سکول ایبٹ آباد کے پرنسپل ایم اے رحمٰن

"یہی کوئی تین روز ہوئے۔"

"صرف تین؟ خُدا نے چاہا۔۔۔ اور خُدا کا چاہنا بڑا ضروری ہے۔۔۔ تو ہفتے عشرے تک پہنچ جائے گا۔"

"تو تار یہاں اس رفتار سے پہنچتے ہیں؟"

"جی ہاں، بشرطیکہ تائیدِ ایزدی بھی شاملِ حال ہو اور اگر شامل نہ ہو تو ایک ہفتہ اور جمع کر لیں۔ بہر حال حکم؟"

"اگر آپ کو تار مل جاتا تو اس کا مضمون کُچھ اس قسم کا تھا کہ اس خاکسار مسمّیٰ محمّد خان کا ائیرپورٹ پر استقبال کیا جائے۔ اور پھر کسی موزوں سے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر دیا جائے۔"

"آپ ائیرپورٹ سے بول رہے ہیں؟"

"نہیں جناب، وُہ منزل طے کر چکا ہوں۔ اس وقت پی آئی اے کے دفتر میں ہوں۔"

"آپ ہمارا قصور دس منٹ تک اور معاف فرمائیں اور وُہیں ٹھہریں۔"

بیروت میں بیوی ضائع ہونے کا خطرہ ہے

پورے دس منٹ کے بعد ایک خوب رو لبنانی نوجوان ہمارا نام پوچھتے پوچھتے پی آئی اے کے دفتر میں داخل ہوا۔ ہمارے سامنے آ کر کمر سے جھکا اور تقریباً نیم رکوع کی حالت میں پہنچ کر کہنے لگا۔

"خاکسار کو ولید کہتے ہیں۔"

ہم نے دِل میں سوچا کہ اگر کہتے ہیں تو کیا حرج ہے۔ ولید نام کے لئے اتنے خادمانہ تعارف کی ضرورت تو نہیں کہ اعترافِ گناہ معلُوم ہو۔ لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ خدمت اس کا پیشہ ہے۔ اپنا تعارف جاری رکھتے ہوئے بولا:

"میں فیاض صاحب کا اسٹنٹ ہوں۔ انہیں آڈٹروں نے گھیر رکھا ہے اور کئی روز تک گھیرے رکھیں گے، مگر میں ان کی زد سے محفوظ ہوں اور آپ کی خدمت کیلئے وقف کیا گیا ہوں۔"

پھر پورے پانچ منٹ فیاض کی طرف سے اور ایک مدّت تک اپنی طرف سے نہایت ہی رقت خیز معذرت پیش کرتا رہا جو کہ ایک لبنانی کی معرب انگریزی میں اور بھی درد انگیز محسوس ہوئی۔ اور پیشتر اس کے کہ اس کی انگریزی اچانک ایک عربی آہ کی شکل

اختیار کر لیتی ہم نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا، مضمون تبدیل کرنے کی کوشش کی اور موضوع کو ہوٹل کے انتخاب پر لے آئے۔

ولید ساتھ کار لائے تھے۔ اس میں بیٹھ کر ہوٹل تلاش کرنا شروع کیا۔ تلاش شروع کرنے سے پہلے ہمیں بتایا گیا کہ ہر چند کہ مرکزی بیروت میں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی کمی نہیں اور ہوٹلوں میں کمروں کا توڑا بھی نہیں، تاہم کمروں میں خالی بستروں کی شدید کمی ہے۔ ہم نے حیرت کا اظہار کیا تو ولید نے ہمیں یاد دِلایا کہ بیروت عالمی سیاحوں، سراغرسانوں اور سمگلروں کی جنت ہے اور موسمِ گرما میں جنت کا کوئی بستر خالی نہیں رہتا۔ بلکہ اکثر اوقات ایک ایک بستر میں دو دو سوتے ہیں۔

ہمارے مُنہ سے بِلا ارادہ نکل گیا۔ ''یہ بندوبست البتہ مناسب ہی معلُوم ہوتا ہے۔''

ولید نے ایک لمحے کے لئے ہمیں غور سے دیکھا۔ پھر ادب میں تھوڑی سے شرارت ملا کر بولا۔

''سر، یہ بندوبست ہر مسافر کیلئے نہیں۔ یہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اپنی بیویاں ساتھ لاتے ہیں۔''

اور یہ کہتے ہوئے ظالم نے ''بیویوں'' کے لفظ پر اتنا زور نہ دیا جتنا ''اپنی'' پر۔ پھر ہماری دِلجوئی کے طور پر کہنے لگا۔

"اگر آپ کا ہوٹل جنت کے مرکز کے بجائے جنت کے حاشیے پر واقع ہو تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہو گا؟ وہاں بستر ملنا یقینی ہے۔"

کہا۔ "اگر مرکزی بستروں میں گنجائش نہیں تو پھر کہیں سہی۔

جب میکدہ چھُٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد و مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو"

چنانچہ ولید ہمیں ایک حاشیائی ہوٹل بنام سیمارا میز میں لے گئے۔ جس پر کسی خانقاہ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے در و دالان کی بیکسی سے یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے محکمہ او قاف اور محکمہ آثارِ قدیمہ کی مشترکہ تحویل میں ہو۔ مینجر سے، معاف فرمائیے، مجاور سے بات ہوئی تو بولا۔

"کئی کمرے خالی ہیں۔ جو پسند آئے لے لیں۔"

ولید جھٹ بولے۔ "میں نہ کہتا تھا یہاں فقط بستر ہی نہیں، سالم کمرے خالی ملیں گے۔ اس جگہ وُہ مرکزی ہوٹلوں والی تنگیاں اور مجبوریاں نہیں۔ یہاں تو میاں بیوی باہم لڑ بھی پڑیں تو علیٰحدہ علیٰحدہ کمروں میں سو سکتے ہیں۔"

یہ بات ہمیں بہت موافق نہ آئی۔ آخر ایسی سہولت کی کیا خوشی جس سے بیوی ضائع ہونے کا امکان ہو۔ مسافرت میں ایک جنگجو بیوی کھو دینا بھی بڑا زیاں ہے کہ یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے۔ سو ایک سے زیادہ خالی کمرے سراسر مانع حقوقِ ازدواج ہیں۔ بہر حال ہم کہ تنہا سفر کر رہے تھے، خالی کمروں سے ایسے خائف نہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک کمرہ چُن لیا۔ اندر داخل ہوئے تو ہر چند کہ بیشتر سامانِ ضرورت موجود تھا تاہم ہر شے سے عبرت اور بے ثباتی ٹپکتی تھی۔ ہمیں ذرا آزردہ دیکھ کر ولید اپنے انتخاب کی صفائی میں بولے۔

"مسٹر خان، چوبیس گھنٹوں میں سے رات کے چند گھنٹے گزارنے کے لئے یہ جگہ بری نہیں۔ بہر حال آپ بیروت میں سونے کیلئے نہیں سیر کرنے کو آئے ہیں۔ اور سیمارا میز کی رات کے باوجود آپ کی دِن کی سیر کا ذائقہ بالکل وُہی ہو گا جیسا سینٹ جارجز ہوٹل کے مکینوں کا۔"

اب ہمارا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جس شخص کی راتیں ویران ہوں، اس کے دن شاداب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہم نے سیمارا میز کے باوجود اپنی رات میں ستارے ٹانکنے کا پروگرام بنا رکھا تھا جس سے ولید ابھی بے خبر تھے۔ لہٰذا ہم نے سامان رکھا اور ولید کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ولید صاحب۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ صرف یہ بتاتے جایئے کہ کسینو لبنان کا ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے۔ ہم رات وہاں گزاریں گے:۔

ولید بولے۔: ہمیں آپ کے کسینو کے شوق یا پروگرام کا علم نہ تھا۔ فیاض تو آج شام آپ کی دعوت کرنا چاہتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔": ہماری اطلاع کے مطابق بیروت میں اہم شے دال روٹی نہیں، کسینو ہے۔ فیاض کو شکریئے کے ساتھ یہ پیغام پہنچائیں کہ اگر کھانا ضروری ہو تو کل شب سہی مگر خدارا آج کی رات سازِ دال نہ چھیڑ کہ ہم سیر گُل کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

ولید نے ہمارے بہانے کی شوخی اور عزم کے تیور دیکھے تو سر جھکا کر تعلیم بجا لایا اور ٹیلیفون اُٹھا کر ہوٹل کے مجاور سے پکی عربی میں بات کرنے لگا۔ پھر ہمیں بتایا کہ آپ کی کسینو کی نشست بُک ہو گئی ہے۔ کسینو کی بس آپ کو ہوٹل سے لے جائے گی اور واپس بھی لے آئے گی۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور رخصتی مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا تو بولے

"مُجھے رخصت کرنے سے پہلے ایک سوال کا جواب دیں کہ اب سے آٹھ بجے شام تک یعنی پورے پانچ گھنٹے تنہا کیا کریں گے اور اگر ان پانچ گھنٹوں میں آپ کو تھوڑا سا بیروت دکھا دیا جائے تو کیا حرج ہے؟"

جٹی نہا کے چھپڑ وچوں نکلی

ہم نے دِل سے مشورہ کیا تو معلُوم ہوا کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ولید کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ سیمارا میز سے نکل کر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سینٹ جارجز ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کا کلس نظر آیا اور جونہی ہماری نگاہ بارھویں منزل سے اُترتی اُترتی سطح زمین کے قریب پہنچی، ہمیں ہوٹل کا نیلگوں "سومنگ پول[۲۱]" رنگارنگ چھتریاں اور سُرخ و سپید جسم دکھائی دیئے۔

ولید بولے: "آیئے آپ کو ذرا اس مرکزی ہوٹل کا ذائقہ بھی چکھاتے جائیں۔" اور پھر سیدھے اس خالی میز کی طرف بڑھے جو نہانے والوں، نہانے والیوں اور تماشائیوں کے جھرمٹ میں سومنگ پول کے کنارے رکھی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور پھر گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف جسم ہی جسم دکھائی دیئے، برہنہ بے پروا جسم، سنسناتے تھرتھراتے جسم، بے تاب بے حساب جسم، جوانی سے چور اور زندگی سے بھرپور جسم!

اتنے میں ایک بیرا آیا جس نے ولید کو پہچان کر سلام کیا۔ معلُوم ہوا کہ ولید صاحب بھی اس حوض کے پرانے شناور ہیں۔ بیرا کوکا کولا لے آیا۔ ہم ہاتھوں سے آب اور

---

[۲۱] (SWIMMING POOL) نہانے کا تالاب

آنکھوں سے شراب پینے لگے۔ ناگاہ ایک برق وش نے رک کر سومنگ پول کے نیلگوں پانی سے اپنا براق سینہ بلند کیا۔ اسے دیکھنا تھا کہ ہمیں دو آبے سے آواز سُنائی دی

جٹی نہا کے چھپڑ وچوں نکلی، سلفے دی لاٹ ورگی

اگلے لمحے میں اس شعلہ رو کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اسی لمحے ہم نے اپنے چہرے پر ٹارچ کی سی روشنی محسوس کی۔ کیا اس کی مسکراہٹ کا رُخ سچ مچ ہماری طرف تھا؟ اجنبیت کے باوجود ہم جواب میں وجد میں آنے کو تھے کہ ولید نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر نہ صرف جنبشِ بازو سے جواب دیا بلکہ چلا کر کہا:

"لیلیٰ۔"

اور ساتھ ہی ہمیں اطلاع دی کہ "لیلیٰ میری دوست ہے۔" ہمارا وجد یکلخت تھم گیا کہ لیلیٰ کی مسکراہٹ کے مخاطب ہم نہ تھے۔ ہمارا ہم نشیں تھا۔ وُہ بھی کم نہ تھا کہ ولید کی معرفت ایک دور کی نسبت ہمیں بھی تھی۔ لیلیٰ کو غور سے دیکھا تو ظالم جس حد تک پانی سے باہر تھی، اگر بلا نہ تھی تو کُچھ نہ تھی۔ ہم ولید کی خوبی قسمت پر رشک کی ابتدا ہی کر رہے تھے کہ لیلیٰ آبی زینے سے چڑھ کر ایک نوخیز غزالہ کی طرح رقصاں رقصاں ہمارے سامنے اور قریب آ کھڑی ہوئی۔ اتنی قریب کہ ذرا بے باکی سے آنکھ جھپکتے تو اس کے گیلے بدن کو پلکوں سے چھو لیتے۔ لیکن یہ آنکھ جھپکنے کا نہیں آنکھ کھولنے کا مقام

تھا اور دیکھا تو جو کُچھ پانی کے اندر بھی تھی اگر قیامت نہ تھی تو کُچھ نہ تھی اور قیامت بھی وُہ جو عین سر پر آ کھڑی ہو۔ لیلیٰ نے ولید کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"آؤ نہائیں۔"

ولید بولے: "پہلے ان سے ملو۔ مسٹر خان، میرے مہربان۔"

بولی: "میرے بھی ہیں۔"

اور پھر ہماری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ بھی آئیں مسٹر خان۔"

کہا "شکریہ میرے پاس تو نہانے کے کپڑے نہیں۔"

بولی "یہاں بیدنگ سوٹوں کی کمی نہیں اور مرد کا بیدنگ سوٹ ہوتا بھی کیا ہے؟ ایک بالشت کپڑا!۔"۔ اور مسکرا دی۔

ہم نے کہا: "جی ہاں۔ ظلم تو عورتوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ پوری دو بالشت کا سوٹ پہننا پڑتا ہے۔"

بولی: "پہننا نہیں کسنا پڑتا ہے۔"

اور پھر بیرے سے بولی: "دو مردانہ کاسٹیوم لے آؤ۔"

ہم نے کہا: ”مس لیلیٰ، دعوت کا شکریہ۔ مگر میں یہاں نہ نہا سکوں گا۔ ہمارے یہاں غسل پردے کا معاملہ ہے۔“

بولی: ”مگر ہم کوئی برہنہ تو نہیں نہا رہے۔“

کہا: ”محترمہ، یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کی برہنگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے۔“

بولی ”آپ کے ہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے؟“

عرض کیا: ”بھئی سچی بات ہے۔ اپنے ہاں تو ٹخنے سے شروع ہوتی ہے اور اکثر اوقات سر سے پار ہو جاتی ہے۔ مگر آج کل آنکھوں پر بھی رکنے لگی ہے۔“

کہنے لگی: ”اللہ آپ پر رحم کرے، آپ تشریف رکھیں۔ مُجھے آپ کی پردہ وری منظور نہیں۔ مگر ولید تم؟“

ولید بولے ”آج ہم بھی پردہ نشیں ہیں۔ خدا حافظ۔“

لیلیٰ نے الوداع میں اپنے لمبے بازو کی تمام تر لمبائی کو ایک دِلگداز سی جنبش دی۔ ساتھ ہی ہم دونوں پر ایک متبسم نگاہ ڈالی جو ولید کے دِل سے ہوتی ہوئی ہمارے جگر کے پار بھی ہو گئی۔ پھر رقصاں رقصاں لبِ آب تک پہنچ گئی اور ایک کھلنڈری مچھلی کی طرح

پانی میں اُتر گئی اور ہم مرکزی ہوٹل کا مزا چکھ کر۔۔ زبان سے کم آنکھوں سے زیادہ۔۔۔ آخر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ولید کی کار میں بیروت کی سڑکوں پر چل نکلے۔

جہنّم میں سکائی سکریپر تعمیر کئے جائیں گے۔

ایک جگہ کار سے نکل کر بازار میں چند قدم چلے تو یک لخت احساس ہوا کہ ہمارا قد سکڑ کر بقدر تین فٹ رہ گیا ہے۔ ولید سے شکایت کی تو بولے۔

"اللہ آپ کی درازی قامت کا نگہبان ہو، آپ کا قد نہیں سکڑا، صرف دونوں طرف کی عمارات بلند ہو گئی ہیں۔ یہ دائیں ہاتھ والی دس منزلہ ہے، بائیں ہاتھ والی پندرہ منزلہ۔ سامنے بائیس منزلہ اور ذرا آگے چالیس منزلہ۔ یہ بالشتے جو آپ کو فٹ پاتھ پر رینگتے نظر آرہے ہیں، بالغ مرد و زن ہیں اور وُہ رینگ نہیں رہے، ہماری طرح پاؤں کے بل چل رہے ہیں۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا تو اس خشت و سنگ کے ملبے میں فقط ایک چیز بے وقعت نظر آئی۔ انسان! یعنی ان عمارات کا خالق مگر اپنی تخلیق اپنے فرینکسٹائن[۲۲] کا صید زبوں۔

---

[۲۲] (FRANKENSTEIN)

ہم نے ولید سے پوچھا: ”یہاں کہیں یک منزلہ مکان بھی پایا جاتا ہے؟“

بولا: ”آج سے بیس برس پہلے کہیں کہیں نظر آتا تھا اب نہیں۔ یک منزلہ مکان ربّ العالمین کی رحمت ہے اور بیروت اس رحمت سے محروم ہے؟“

اس صورتِ حال کا آسان لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ بیروت کی ایک تہائی آبادی کے قدم تو زمین پر ہیں مگر دُوسری تہائی ہوا میں معلّق ہے اور تیسری زینوں اور سیڑھیُوں پر سے اُتر چڑھ رہی ہے اور ہر تہائی کا نصف بچّے، بوڑھے اور بیمار ہیں۔ ان چہل منزلہ مکانوں کے مکینوں سے کوئی دِل کی پوچھتا تو یقیناً فریاد کر اُٹھے کہ خدارا نکالو ہمیں ان خوبصورت قید خانوں سے۔ ہماری خواہش فقط اتنی ہے کہ دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔ ہم نے ولید کی رائے پوچھی تو بولا: ”میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جہنم میں رہنے کو سکائی سکریپر ملیں گے ورنہ عذاب کا منشا پورا نہ ہو سکے گا۔“

ہم نے یہ سنا تو پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے اور پھر وہیں سے یعنی بیروت کے بازار ہی سے کھڑے کھڑے اہلِ وطن کو پکارا کہ اے خاک نشینانِ پاکستان مژدہ ہو کہ آپ یا آپ میں سے اکثر ابھی اس صد منزلہ لعنت سے محفوظ ہیں جو اہلِ بیروت کا مقدر بن چکی ہے اور اے کوچہ گردانِ وطن مبارک باشد کہ خواجہ بلند بام نافرجام ہے اور اس بے توفیق مسخرے پر رحم کھاؤ کہ فراخیٔ زمین سے محروم اور تنگی بام میں محبوس ہے۔

وقت گزر رہا تھا۔ ولید نے کار تیز کی اور بیروت کے بام و در فلمی تصاویر کی طرح جھلک دکھا کر غائب ہونے لگے۔ لیکن ایک گلی سے دُوسری گلی میں مڑنا یوں لگتا تھا جیسے ایک سرنگ سے نکل کر دُوسری سرنگ میں داخل ہو رہے ہوں۔

"یا اللہ۔"۔ دفعتہً مُنہ سے دُعا نکلی۔ "تیری ہموار زمین پر یہ ناہموار عمارات کبھی ختم یا ذرا پست بھی ہوں گی؟"

دُعا ابھی لَب پر ہی تھی کہ جواب آیا۔

"مایوس نہ ہو۔ کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ۔"

اور کیا دیکھتے ہیں کہ دفعتہً کار ساحلِ سمندر پر آ نکلی ہے۔ کار سے نکل کر تشکّر کا ایک لمبا سانس لیا اور خشت و سنگ کے فلک بوس ہمالوں کی طرف پشت کر کے اپنی نگاہوں کا دامن سطحِ آب پر پھیلا دیا۔ اس سیال زمرد کی دید سے اعصاب کو وُہ سکون محسوس ہوا گویا ہر ریشۂ بدن پر الزبتھ آرڈن اپنے ہاتھ سے کولڈ کریم مل رہی ہے۔

کسینو کی دُنیا ستاروں سے ذرا آگے ہے۔

لیکن وقت بدستور گزر رہا تھا۔ لوٹ کر سیمار امیز میں آئے۔ ولید رخصت ہوئے۔ ہم نے غسل کیا، کپڑے بدلے اور اتنے میں نیچے سے پیام آیا کہ کیبرے جانے والی بس

انتظار کر رہی ہے۔ بس دیکھی تو یہ بس نہ تھی پری خانہ تھا۔ ہر چند کہ اس کی ساری نشستیں پریوں سے پُر نہ تھیں، کُچھ ہم سے ملتے جلتے کالے پیلے آدم زاد بھی بیٹھے تھے، تاہم مجموعی تاثر یہی تھا کہ کوہ قاف کی پریوں کی بس ہے جو راہ میں چند افرو ایشیائی مسافروں کو لفٹ دیتی ہوئی سیمارامیز کے سامنے آکر رُکی ہے۔ ہمارے حِصّے میں جو نشست آئی وُہ ایک پری کے ساتھ مشترکہ تھی۔ بیٹھنے لگے تو ہماری خاطر پری نے نہ صرف اپنا پرس اُٹھایا بلکہ ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے اتنا واضع تبسّم کیا کہ پوری سیٹ پھُولوں سے بھر گئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ التفاتِ حُسن پر ناز کریں یا حُسنِ التفات پر قربان ہو جائیں۔ بہر حال اپنے آپ پر رشک کرتے ہوئے ہم پھُولوں کی سیج پر بیٹھ گئے۔ حالانکہ ہم اس بات کے لئے بھی تیار تھے کہ یہی بدیع الجمال [۲۳] ماتھے پر بل ڈال کر ہمیں ڈانٹ دے:

"میں پری [۲۴] توں آدم زادہ جہ گل تیری میری؟"

لیکن بدیع الجمال کے تبسّم سے آراستہ ہونٹ کُچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

---

[۲۳] میاں محمّد صاحب کی مشہور پنجابی مثنوی کے ہیرو سیف الملوک کی محبوبہ کا نام۔

[۲۴] میں پری ہوں اور تم انسان۔ تمہارا میرا کیا تعلق؟۔

ہے[25] محبوب مرے دِل جانی اکھیں دی روشنائی

دِل جانی دا جان دِلے دی تدھ بن ہور نہ کائی

الغرض ہم پھُولوں اور پریوں کے جھرمٹ میں گِھرے کسینو پہنچے۔ کیبرے کی وسیع ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو معلُوم ہوا یہ صرف ڈیوڑھی ہی نہیں، قمار خانہ بھی ہے۔ کارنیوال کی سینکڑوں قمار باز مشینیں گاہکوں کی منتظر رکھی تھیں یعنی یہ دِل لگانے سے پہلے زر لگانے کا مقام تھا۔ ہال کے اندر قدم رکھا تو یک لخت احساس ہوا کہ اس کا فرش تو ہے مگر چھت نہیں کہ دور دور تک آسمان کی وسعتوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ ہم نے مسحور ہو کر ساتھی سے کہا "بے شک یہ تاروں بھری رات بھی فطرت کا شاہکار ہے۔"

بولا: "میاں یہ کسینو ہے۔ یہاں فطرت کا داخلہ بند ہے۔ یہ خدا کا آسمان نہیں انسان کا ہے۔ یہ رات اور تارے سب ہینڈ میڈ ہیں۔"

---

[25] اے میرے محبوب میری آنکھوں کی روشنی۔

تم میری جان کے دِل ہو اور میرے دِل کی جان۔ میرے لئے تمہارے سوا کوئی اور نہیں۔ (میاں محمدؒ صاحب)

ہمارا سحر اور گھمبیر ہونے لگا۔ لیکن پھر یکایک سین بدلا اور رات کی سیاہی چھٹنے لگی، ستارے مدھم ہونے لگے اور دور اُفق پر سینکڑوں بام و در وا ہونے لگے۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ ہر درجے میں ایک شعلہ بدن جلوہ فگن ہے۔ اگر غالب ہوتے تو جس در پر نگاہ ڈالتے، چلا اُٹھتے: "اک نگاہِ آتشیں رخ سر کھلا!" اور ہم عرض کرتے: "حضور وُہ آتشیں رخ ہی نہیں، آتشیں بدن بھی ہے کہ صرف سر ہی نہیں کل بدن کھلا ہے!" بہر حال ہم پر واضح ہوا کہ کسینو کی دُنیا صرف ستاروں ہی تک محدود نہیں، یہاں ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں اور یہ جہاں تھے بے حجاب لالہ رخوں اور بے لباس سمن بروں کے جو بنیان، بکینی یا بوڈس سے یکسر پاک تھیں۔ یہاں جملہ کاروبار بے جامہ ہی انجام پاتے تھے بلکہ ہر عمل کے پیچھے یہ مبارک مگر مشکل جذبہ کار فرما تھا کہ زاویوں اور دائروں کو واضح تر کرنے کا کوئی راز سینۂ کائنات گیں باقی ہو تو اسے کس طرح آشکارا کیا جائے اور بے شک خداوندان کسینو اس عقدہ کشائی میں ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر اترے اور اس اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہرے جو ہم سے پیشگی وصول کر لیا تھا۔

لیکن جدّت فقط نمائشِ حُسن ہی میں نہ تھی، جلوہ گاہ حُسن میں بھی تھی۔ اگر پیش منظر حسنِ نسوانی کا نگار خانہ تھا تو پس منظر رنگ و صوت کا حیرت کدہ۔ وہ پردہ اُٹھتے ہی دیدار بھرے کہساروں کا اُبھرنا، وُہ فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی آبشاروں کا گرنا، وُہ مہ وشوں سے لدے ہوئے گنڈولوں کا نہروں سے گزرنا، وُہ زہرہ جبینوں سے بھرے ہوئے اڑن

کھٹولوں کا آسمان سے اُترنا، وُہ چنگ و رباب اور نغمہ و نشاط کے مچلتے ہوئے ریلے، وُہ رنگا رنگ روشنیوں کے بدلتے ہوئے میلے، وُہ بے حجاب تماشائیوں کی خود فراموشی، وُہ بے تاب جوڑوں کی ہم آغوشی وہ۔۔۔ خیر جانے دیں کہ اس سے آگے کی کیفیت بیان کرنے کیلئے کسی جوش یا عدم کی ضرورت ہے۔ ہم تو فقط ٹماٹر جوس پی کر گئے تھے۔ ارے، محویت میں ہمیں وقت ہی کا ہوش نہ رہا۔ رات کے دو بج چکے ہیں۔ تماشا ختم ہونے کو ہے۔ وُہ حسیناں کسینو رخصتی سلام کر رہی ہیں۔ اور دیکھیں، ہماری ہم نشین بھی چونک کر آنکھیں مل رہی ہیں۔ لیکن ہماری ہم نشین کا دوران تماشا سو جانا غلبہ خواب کا نتیجہ نہیں، غرورِ حُسن کا تقاضا ہے کیونکہ موصوفہ نے اپنے من میں ایک پرائیویٹ کسینو بنا رکھا ہے۔ بہرحال ہم جاگے ہیں، آپ بھی جاگیں اور اُٹھئے کہ اب تو لذّت خوابِ سحر گئی۔

واپسی پر بھی کسینو سے لے کر سیمارامیز تک پھر وہی رشکِ حور شریکِ نشست تھی۔ یہ دوطرفہ شبینہ نعمت بے شک غیر مترقبہ تھی لیکن اس نعمت میں نیند کا سکون شامل نہ تھا

یار کو میں نے مُجھے یار نے سونے نہ دیا

رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

ڈرائیور موٹر اور مافیہا سے بے خبر تھا

اس طویل شب بیداری کے بعد سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو ساتھ ہی مادام سیمار امیز بھی ناشتہ لے کر نمودار ہوئیں۔ ہم نے کہا:

"مادام اس قدر سویرے؟"

بولی۔ "یہ سپیدۂ سحر نہیں، سپیدۂ دوپہر ہے۔ اور ناشتہ ہی نہیں، عبدالرحمٰن بھی ایک مدّت سے آپ کی بیداری کا منتظر ہے۔"

اور ساتھ ہی ایک خوش رو نوجوان نے دروازہ سے جھانکا۔ شکل و صورت سے رئیس زادہ لگتا تھا۔ ہم نے انگریزی میں پوچھا:

"آپ کی تعریف؟"

نوجوان اُردُو میں بولا "میں فیاض صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ آپ کے لئے کار لایا ہوں۔ شاید آپ بیروت یا نواحِ بیروت کی سیر کرنا چاہیں۔"

ہم نے کہا: "اچھا تو آپ پاکستانی ہیں؟"

بولا: "جناب معاف رکھنا، میں لبنانی ہوں۔"

”لیکن آپ اُردُو بڑی رواں بولتے ہیں۔“

”جی ہاں، فیاض صاحب سے بول بول کر رواں ہو گئی ہے۔“

”آپ تو بڑے قابل آدمی معلُوم ہوتے ہیں۔“

”جی ہاں، میں شام کو نائٹ سکول میں انگریزی بھی پڑھتا ہوں۔“

اور پھر نمونے اور ثبوت کے طور پر انگریزی میں ہمارا نام اور مزاج پوچھا اور پھر داد کے انتظار میں ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ ہم نے کہا:

”عبدالرحمٰن تم دِلچسپ آدمی لگتے ہو۔“

”جی ہاں، میں بہت دِلچسپ ہوں۔ میں کار بھی خوب چلاتا ہوں، بالکل ہوائی جہاز کی طرح۔“

”یعنی اُڑنے لگتی ہے؟“

”بالکل اُڑ تو نہیں پڑتی لیکن ایسی پیدل بھی نہیں چلتی۔“

”پھر تو جناب آپ خاصے خطرناک ڈرائیور ہیں۔“

”نہیں حضور، خواتین اور ڈرپوک سواریُوں کے لئے میں آہستہ بھی چلا سکتا ہوں۔“

ہم نے مضمون تبدیل کرتے ہوئے کہا:

"عبدالرحمٰن میں ناشتہ کرتا ہوں تم ذرا نیچے انتظار کرو۔"

"میں چشم براہ ہوں گا۔"

اور ایک فوجی سلوٹ اور غیر فوجی مُسکراہٹ کے ساتھ پیچھے مُڑا اور غائب ہو گیا۔

ہم کپڑے پہن کر ہوٹل سے باہر نکلے تو عبدالرحمٰن واقعی چشم براہ اور نقشہ بدست کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی نقشے پر انگلی نچاتے ہوئے بلا تمہید پٹاخنے لگا:

"بیبلوس جائیں گے؟ صیدا جائیں گے؟ بعلبک جائیں گے؟ کہاں جائیں گے؟ حکم کریں۔ میری مانیں تو بعلبک جائیں۔ کیا عجوبہ کھنڈر ہیں، باغ ہیں، نہریں ہیں۔۔۔۔" اور پھر گہرا سانس لے کر سر اُٹھایا اور ہماری طرف دیکھا۔

کہا: "کچھ اور بھی کہنا ہے؟"

بولا: "جی ہاں۔ باغ ہیں، نہریں ہیں، میری ہونے والی سسرال ہے۔ میری منگیتر ہے، مُجھے اسے دیکھے مہینہ ہو گیا ہے۔ آپ کھنڈر دیکھیں گے۔ میں زبیدہ دیکھوں گا۔"

یہ کہہ کر عبدالرحمٰن نے ہمیں اسی طرح حسرت بھری نگاہ سے دیکھا جیسے ہرنی نے سبکتگین کو دیکھا تھا۔ عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں اس تاریخی ہرنی کی رحم طلبی نظر آئی تو ہم نے بلا تاّمل کہا:

"بعلبک ہی جائیں گے۔"

اس پر عبدالرحمٰن کے چہرے پر ایک کومل اور کشادہ مسکراہٹ کھل اُٹھی۔ جو دن بھر نہ کملائی۔ معاً اس نے والہانہ طور پر کار کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر قدم رکھنے کی دعوت دی۔

کار پچپن ساٹھ میل کی رفتار سے اُڑنے لگی یا بقول عبدالرحمٰن رینگنے لگی۔ بعلبک بیروت سے کوئی چالیس میل جنوب مشرق میں ہے۔ پہلے دس بارہ میل پہاڑی سڑک ہے لیکن صاف اور بے شگاف پیچیدہ اور پسندیدہ۔ کار چلانے کا مزا سیدھی اور ہموار سڑک پر نہیں آتا۔ مزا اس میں ہے کہ قدم قدم پر موڑ ہوں اور اگر اس موڑ پر اُترائی ہو تو اگلے پر چڑھائی!۔۔ شاید زندگی کا تمام تر حُسن نشیب و فراز اور زاویوں اور گولائیوں ہی میں ہے۔۔ یہ حسین راستہ بالآخر ایک پہاڑی قصبے میں جا داخل ہوا جس کے کوچۂ و برزن بیروت کے تھے مگر ماحول مری کا۔ وُہی کمروں اور دالانوں میں داخل ہوتے ہوئے بادِل، وُہی آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دُھوپ اور سائے، وہی بوندوں کے بیباک چھینٹے اور

وُہی جھکڑ کے گستاخ جھونکے، وُہی لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے سین جیسے کوئی کھلنڈرا فرشتہ قدرت کی ٹیکنی کلر فلم چُرا کر کسی آسمانی پروجیکٹر سے بلا وقفہ اور بلا ٹکٹ دکھائے چلا جا رہا ہو۔ "مری" سے نکلے تو ایک وسیع وادی میں داخل ہوئے جس کے طول و عرض میں ہم سے غالباً چند ہی منٹ پہلے دستِ غیب نے گلال چھڑک دیا تھا۔ یعنی زمین سُرخ ہی نہ تھی۔ تازہ سُرخ تھی لیکن اس کے بطن سے گہری ہری انگور کی بیلیں گھٹا بن کر امڈ پڑی تھیں۔ یہ بیلیں میلوں تک بیسا کھیُوں کے سہارے کھڑی نظر آتی تھیں اور بے شک انہیں سہارے کی ضرورت بھی تھی کہ ان کے خوشوں میں شرابِ خام تھی اور شاخوں میں شبابِ تام۔ اور اس شراب و شباب کی مستی سے ایک مسلسل لغزش کے عالم میں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد یکلخت باغوں اور شہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ قربِ بعلبک کی علامتیں تھیں۔ ہم نے عبد الرحمٰن کو دیکھا تو اس کے چشم و رخسار میں بھی ایک رنگ و روشنی کا سلسلہ نظر آیا کہ یہ قربِ زبیدہ کی نشانیاں تھیں۔ پھر ایک حویلی کے پاس سے گزرے تو عبد الرحمٰن کار ٹھہرا کر دروازے کی سمت میں چلایا:

"یا زبیدہ!"

اور دُوسرے لمحے دروازے پر ایک حور شمائل آ کھڑی ہوئی۔ ہم سے اجازت لئے بغیر عبدالرحمٰن اُڑ کر دروازے تک گیا اور زبیدہ کا ہاتھ تھام کر ایک عالمِ بے خودی میں موٹر کارومافیہا سے بے خبر زبیدہ کو دیکھنے لگا۔ ہم نے بھی زبیدہ کو دیکھا اور پھر عبدالرحمٰن کی تمام تر بے تابیاں، بے صبریاں اور بے ادبیاں سراسر جائز نظر آنے لگیں۔ ہماری منزل چند سو گز آگے تھی۔ عبدالرحمٰن زبیدہ سے عربی میں کُچھ کہہ کر پھر کار میں آ بیٹھا اور کھنڈروں کے قریب میں ایک گائیڈ کے حوالے کرنے کے بعد دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حریمِ ناز کو پرواز کر گیا۔

پرُوہتوں میں محبّت کے میچ ہوتے تھے

گائیڈ بعلبک کی تاریخ بیان کرنے لگا لیکن جب سیّاح اپنی آنکھوں سے تاریخ دیکھ رہا ہو اسے تاریخ سُننے کی حاجت نہیں رہتی۔ اور جس فصاحت سے جوپیٹر مندر کے چوراسی میں سے چھ پسماندہ مگر سرکش ستون اپنی دو ہزار سالہ داستان بیان کر رہے تھے اس کے سامنے گائیڈ کی زبان قطع کلام کرتی محسوس ہوتی تھی۔ تاریخ ان معبدوں کو پیگن [۲۶] یعنی بے کتاب عہد کی یادگار سمجھتی ہے لیکن اس سے ان کی عظمت، ان کی شوکت اور شانِ دلاویزی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گفتہء غالب ایک ازلی سچائی معلُوم ہوتی ہے کہ

---

[۲۶] (PAGAN)

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے، خواہ یہ وفا خدائے واحد سے ہو جو اہلِ کتاب کا نصیبہ ہے یا خدایانِ متفرق سے جو پیگن امتّوں کا عقیدہ تھا۔ انسان کا جذبۂ عبودیت ایک ہی ہے۔ فقط اس کا رُخ بدلتا رہتا ہے۔ اسی ذوقِ عبادت کی تسکین کے لئے انسان نے کبھی اہرامِ مصر تعمیر کئے، کبھی معابدِ موہنجو دارو، کبھی منادر بعلبک اور کبھی کلیسائے روم اور بالآخر خُدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھی۔ معاف رکھئے گا۔ بعلبک کے کھنڈروں کی دِلاویزی میں کھو کر ہم اپنی توفیق سے بڑھ کر عالمانہ باتیں کرنے لگے اور پیشتر اس کے کہ یہ موضوع ہمیں اور آپ کو دوبارہ گاڑھی فلسفیانہ دھند میں دھکیل دے، آیئے صاف ہوا میں نکل کر گائیڈ کی باتیں سُنیں جو زیادہ عام فہم ہیں۔ گائیڈ کی آواز آئی:

"خواتین و حضرات۔ یہ جو پیٹر کے مندر کے ساتھ باخوض کا مندر ہے۔ اسے شراب کا مندر بھی کہ یہاں رومی رئیسوں میں مئے نوشی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ساتھ ہی وینس یعنی محبّت کی دیوی کا مندر ہے کہ یہاں رومی پروہتوں میں محبّت کے میچ ہوتے تھے۔

"محبّت کے میچ؟" ایک ہپّی نما سیاحہ نے چونک کر پوچھا۔ لیکن اندازِ سوال میں استفسار کم تھا اور تائید زیادہ۔

"جی ہاں۔" گائیڈ نے جواب دیا۔ "شہر کی تمام تر دوشیزاؤں پر پہلا حق پروہتوں کا ہوتا تھا اور اس حق کا استعمال اس مقدس مندر کے اندر بر سرِ عام ظہور میں آتا تھا۔ جو دوشیزہ قوم اس اعزاز یا اس عبادت سے محروم رہتی ہمیشہ کے لئے ننگِ ملّت تصور ہوتی۔"

صرف ایک اور فلسفے کی مختصر سی بات: یہ رومی پروہت بے اولاد نہیں مرے۔ ان کے فرزند آج بھی موجود ہیں جو اپنے آبائی فرائض کو معمولی ترمیم کے ساتھ بدستور انجام دے رہے ہیں۔ یعنی جو کُچھ وُہ مندروں میں برملا کرتے تھے یہ معبدوں میں چھپ کر کرتے ہیں:

چوں بہ خلوت می روند آن کار دیگر مے کنند

بہر حال آیئے، آثار بعلبک سے رخصت ہوں کہ یہ کھنڈر بڑے فلسفہ آور معلُوم ہوتے ہیں اور اگر ہمارے کچّے فلسفے کا روڑا کسی پکّے پروہت کے ماتھے پر جا لگا تو فساد کا اندیشہ ہے اور بہر حال ہمارا مسلک فتنہ نہیں محبّت ہے۔ وُہ دیکھیں ہپّی سیّاحہ نے اپنے ساتھی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور وُہ دونوں وینس دیوی کے حضور محبّت کے مندر میں مبہوت کھڑے ہیں۔ صرف ایک لمحہ ٹھہریں اور ہمیں سنیپ شاٹ لینے دیں۔ کلک!

آگے مسٹر اور ہونے والی مسز عبدالرحمٰن کار سے ٹیک لگائے ہمارے انتظار میں مگر ہماری موجودگی سے غافل محوِ اختلاط و انبساط تھے۔ ہم نے جی کڑا کر کے ایک مصنوعی چھینک ماری۔ اگرچہ دِل نے اس حرکت پر ہمیں ہزار ملامت کی۔ محب اور محبوب کی ملاقات کائنات کا حسین ترین منظر ہے اور اس ملاقات میں مخل ہونا گویا تاج گل ڈھا دینا ہے۔ ہرچند کہ ہمارااحساسِ ندامت شدید تھا تاہم یہ بے حرمتی ہو چکی تھی۔ جواب میں ایک دفعہ چونک اُٹھنے کے بعد عبدالرحمٰن نے مسکرا کر اور زبیدہ نے شرما کر ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم انہیں آشیر باد دے کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وُہ دونوں ساتھ ساتھ اور ذرا قریب قریب اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ ہرچند کہ ہم اس وقت پڑھنے کے موڈ میں نہ تھے تاہم ہم نے جیب سے سفید کاغذ نکال کر یکسوئی سے پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد کار پھر زبیدہ کے گھر کے سامنے رُکی اور زبیدہ نے عبدالرحمٰن کے ایما سے ہمیں دعوتِ چائے دی۔ عبدالرحمٰن لمحاتِ ملاقات کو تا حدِّ امکان طویل کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی عبدالرحمٰن نے ایک بار پھر سبکتگین کی ہرنی کی طرح دیکھنا شروع کیا۔ گویا زبیدہ کی دعوت میں اپنی خاموش تائید بھی شامل کر دی۔ ہم نے آسمان کی طرف دیکھا تو قدرت کا اشارہ بھی یہی تھا کہ زنہار جو دو چاہنے والوں کی تدبیر وصل میں حارج ہوئے۔ ناچار دعوتِ چائے قبول کی اور بعد میں ہرچند کہ بے دستہ پیالیوں میں

قہوہ پینے سے انگلیاں جل اُٹھیں تاہم جگر میں ٹھنڈک محسوس ہونے لگی کہ تاج محل دوبارہ تعمیر ہو رہا تھا۔

بعلبک کی سیر سے فارغ ہوئے تو سیدھے ہوٹل پہنچے۔ عبدالرحمٰن کو چھٹّی دی اور لبنان کا پہلا خاموش لنچ کھایا۔ صُبح کے ہنگاموں کے بعد یہ خاموشی ہمیں بڑی موافق آئی۔ لیکن کھانے کے بعد سستانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ولید نمودار ہوئے۔ وجۂ نزول پوچھی تو

"آپ کو یاد دِلانے آیا ہوں۔"

"جی ہاں، ڈنر؟ وُہ کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"نہیں جناب ڈنر تو رات کی بات ہے۔ فیاض صاحب کا ارشاد ہے چار بجے بینک میں تشریف لائیں۔ ہمارا بینک بھی دیکھیں اور چائے بھی پئیں۔"

زبانی تواضع کی بجائے چائے پلانا بھی بے شک بہتر خدمت ہے لیکن اس کارِ خیر کے لئے چار بجے طلب کرنا بہتر خدمت کی بہترین مثال نہیں۔ خصوصاً اس تھکے ماندے مہمان کو جو بے محابا اور بر ملا خراٹے لے رہا ہو مگر عذر کرنا گناہ تھا۔ ایک مُنہ توڑ جمائی سے عہدہ بر آ ہو کر کہا:

”حاضر جناب۔“

ولید بولے: ”پورے تین بج کر پچپن منٹ پر عبدالرحمٰن کار لے کر آئے گا۔ تیار رہیے گا۔ اور ہمیں یُوں محسوس ہوا کہ اِدھر ولید نکلے اور اُدھر تمام بیرونی گھڑیوں نے یک زبان ہوکر تین پچپن بجا دیئے۔ جیسے ایک غریب الوطن کے خلاف سوچی سمجھی سازش ہو۔

بینک پہنچے تو فیاض صاحب بدستور آڈٹروں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ اور جملہ حاضرین ڈالر، پونڈ اور لیرا کے حضور سر جوڑے اور جبینیں جھکائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئے تو یُوں محسوس ہوا جیسے کسی عبادت میں مخل ہوئے ہوں۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سُن کر جملہ عبادت گزاروں نے سجدے سے سر اُٹھایا۔ ہمیں دیکھا، گھڑیاں دیکھیں، ایک دُوسرے کو دیکھا اور چائے کے وقفے کا اعلان ہوا۔ ڈالر پرستی سے انسان دوستی تک آنا آسان نہیں اور کُچھ دیر تک تو ہماری موجودگی کے باوجود گفتگو پر لاس، پرافٹ اور ڈیپازٹ غالب رہے لیکن رفتہ رفتہ اعداد و شمار کے ملبے سے انسانیت نے کروٹ لی اور پھر باتوں میں عظمتِ آدم کے آثار پیدا ہونے لگے۔ کسی نے غالب اور اقبال کا نام لیا۔ ایک خدا کا بندہ بولا

”کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا۔“

ہم نے کہا: ”بجا کہتے ہو مگر اتنے دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری اپنی برادری میں وُہ جوان یوسفی بھی ہے۔“ اور پھر آہستہ آہستہ مجلس کا بوجھل ماحول چھٹ کر رنگ پر آنے لگا اور آخری منازل میں تو آڈٹروں کے ہونّق ہونٹوں پر بھی انسانی تبسّم کی مدھم لکیریں پھوٹنے لگیں۔ لیکن پھر اچانک دفتر کی گھڑی نے ٹن سے چائے کے وقفے کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور معاً آڈٹروں کے لبوں پر تبسّم کے خطوط ٹوٹنے لگے۔ پیشتر اس کے کہ ماحول پر مکمل یبوست چھا جاتی ہم نے اہلِ مجلس کو خدا حافظ کہا اور ہوٹل کو لوٹ آئے۔

کھانا کھانے کے آداب تیتر سے سیکھئے!

بیروت میں ہماری آخری سرکاری مصروفیت۔۔ سرکاری اس لئے کہ اس پر ہمیں کلی اختیار نہ تھا۔۔ اس شب کا ڈنر تھا جس کے مہتمم اور مختار ولید تھے۔ ہماری شرط فقط اتنی تھی کہ ہمیں خالص لبنانی کھانا کھلایا جائے۔ کیونکہ انگریزی کھانوں سے ہمارا ماضی پہلے ہی بے حد ملوث اور مجروح ہو چکا تھا اور ہمارا مستقبل قریب بھی۔۔ جسے انگلستان میں گزارتا تھا۔۔ خاصا تاریک تھا۔ چنانچہ ولید نے ایک خالص لبنانی ریستوران یلدزلار انتخاب کیا۔ ریستوران میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ کسی محل میں داخل ہوئے ہیں

اور ماحول میں بھی وہی شرافت نظر آئی جو محلات میں ہونی چاہیئے۔ چند ہی مہمان بیٹھے تھے مگر شکل وصورت سے بڑے چیدہ۔ ولید سے وجہ پوچھی تو بڑی سادگی سے بولا:

"یہ محل تو اس لئے لگتا ہے کہ یلدزلار کہتے ہی محل کو ہیں اور شرافت کی بو غالباً اس لئے آتی ہے کہ یہاں آتے ہی شریف لوگ ہیں۔"

ہم نے کہا: "شرفا کی تو کراچی میں بھی کمی نہیں۔ لیکن کھانے کے وقت ہر طعام گاہ کے دروازے پر ایک غیر شریفانہ کیو لگ جاتا ہے۔"

بولا: "یہ خالص آبادی کا مسئلہ ہے۔ سارے لبنان میں اتنے لوگ نہیں بستے جتنے کراچی سلمہا کی گود میں پلتے ہیں۔"

شریفانہ ماحول کی دو گونہ وجہ سمجھ میں آگئی تو ولید کے اشارے پر کھانا آنا بلکہ برسنا شروع ہوا۔ یہ اس قسم کا ڈنر نہ تھا جس میں چار پانچ کھانے یکے بعد دیگرے مہمان کے پہلو سے اس کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ اس ڈنر میں مختلف رنگ و نسل کی چٹنیاں، مربّے اور اچار چھوڑ کر پورے چالیس کھانے تھے۔۔ اور چالیس کے چالیس کھانے بیک وقت نازل ہوئے۔ یعنی کوئی دس بیرے چار چار پلیٹیں اُٹھائے شش جہات سے میز پر چُننے لگے اور اس موسلا دھار سروس کے بعد جب بیرے چھٹ گئے تو میز پر جل تھل کا عالم تھا۔ پلیٹوں کا کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔۔ پوری چالیس پلیٹیں میز پر کیسے سما

گئیں؟ گزارش ہے کہ یہ ہماری پاکستانی ڈنر پلیٹیں نہ تھیں بلکہ چینی کی چالیس بالشتیا سی کشتیاں تھیں جن میں ہم وطن میں مہمانوں کو چلغوزے پیش کرتے ہیں یا پالتو تیتروں کو پنجروں میں دانہ کھلاتے ہیں۔ ہم سوچنے لگے کہ بیروت میں تیتروں کو کس چیز میں دانہ ڈالتے ہوں گے اور مہمانوں کو کس برتن میں چلغوزے پیش کرتے ہوں گے؟: بادام کے خول میں یا مونگ پھلی کے چھلکے میں؟ لیکن چالیس کشتیاں کتنی ہی بالشتیا کیوں نہ ہوں آخر چالیس ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو کشتی سے کشتی ٹکرانے لگی۔ لیکن دیکھا کہ دو بیرے اس خدمت پر مامور کر دیئے گئے ہیں کہ اگر کسی کشتی کا میز کے کنارے سے پاؤں پھسلے تو اسے سہارا دے کر پھر منجدھار میں ڈال دیں۔ ان بیروں کے تعاون کے بغیر دو بٹیر تو ان پلیٹوں سے آرام سے کھا سکتے تھے لیکن دو انسان آرام سے نہیں کھا سکتے تھے۔ ہم نے ولید سے پوچھا:

”آپ کو ان کھانوں کے نام بھی آتے ہیں؟“

بولا: ”چند ایک کے تو آتے ہیں لیکن سارے ناموں کا حافظہ جامعہ ازہر سے ادھر نہیں ملے گا۔“

رہا ان چالیس کھانوں کا ذائقہ تو شاید تیتروں اور ولیدوں کے لئے باعثِ کشش ہو مگر ہمیں بہت محظوظ نہ کر سکا۔ کسینو اور کاروں کے معاملے میں بیروت بے شک بے مثال

سہی لیکن کھانے کے معاملے میں نئیں ریساں شہر لاہور دیاں[۲۷]۔ چنانچہ ہم نے اپنے لاہور پر غائبانہ فخر کیا اور اسے بادِ صبا کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

دوسری صبح ہمیں بیروت سے رخصت ہونا تھا۔ جاگے تو مادام ناشتہ کی قاب میں چائے اور حسنِ سلوک سجا کر لائیں۔ اتنے میں ہماری کسینو کی ہم نشین بھی الوداع کہنے آئی۔ ہمیں سوٹ کیس میں کپڑے بند کرتے دیکھ کر ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے متعلق سوال کرنے لگی۔ جب ہمارے منصوبوں کی تفصیل سُنی تو رشک سے چور ہو کر ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں سیر جہاں کا شوق رو رو کر کہہ رہا تھا کہ

غالب اگر سفر میں مُجھے ساتھ لے چلیں

حج کا ثواب نظر کروں گا حضور کی

لیکن اس کے لئے زرِ مبادلہ کا انتظام بھی ہو سکتا تو جرات کا انتظام کیسے ہوتا؟

سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

---

[۲۷] کوئی مقابلہ نہیں شہر لاہور کا۔

اتنے میں عبدالرحمٰن کار لے کر آ گیا اور ہمیں ہوائی اڈے کو لے اڑا۔

سوئٹزرلینڈ: حسنِ ازل کی نمود

لبنان چھوڑنے کی سزا

بیروت ائیر پورٹ میں داخل ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو تین مقامات پر ہماری پیشی ہوئی۔ لیکن جس دربار میں بھی گئے، ذکر ہمارا نہ تھا ہمارے پاسپورٹ کا تھا۔ غیر ملکی سفر کا اصل ہیرو پاسپورٹ ہی ہے۔ مسافر تو مشکوک کردار کا سائڈ ہیرو بلکہ وِلن سمجھا جاتا ہے جسے ہر کوئی مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ خود ہمیں بارہا کُچھ ایسی ہی نظروں سے دیکھا گیا تا آنکہ ہمارے پاسپورٹ نے ہمارے چال چلن کی صفائی دی اور ہم پردیس میں سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہوئے۔ بے شک ہم شکل سے خاصے شریف النفس اور نجیب الطرفین نظر آتے تھے۔ لیکن اہلِ کسٹم کا دیانتدارانہ موقف یہ تھا کہ ہر منجھا ہوا سمگلر بظاہر نجیب و مجیب ہی نظر آتا ہے۔ بہر حال جب ہماری نیک چلنی پر سرکاری مہر

لگ چکی تو ہمیں اس مقام تک جانے کی اجازت مل گئی جسے ڈیپارچرز یا مقامِ رخصت کہتے ہیں لیکن ایک چھوٹی سے شرط کے ساتھ حکم ہوا:

"ذرا مبلغ نصف لیرا خزانہ لبنان میں جمع کراتے جائیں۔"

پوچھا: "یہ لبنان آنے کی سزا ہے؟"

ارشاد ہوا: "لبنان چھوڑنے کی۔"

ہم نے باسی سامُنہ بنایا تو حاکم بولا:

"ایسا مُنہ بنانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ پاکستان چھوڑنے پر بھی یہ جرمانہ ہوتا ہے اور بالکل اسی قدر۔"

پی آئی اے نے چھابڑی لگائی۔

اگلے ہال میں داخل ہوئے تو چاروں طرف مختلف فضائی کمپنیوں کے کاؤنٹر یعنی دفاتر تھے۔ قدرتاً ہماری نگاہ پی آئی اے کا نام تلاش کرنے لگی لیکن ناکام لوٹی۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا تو ایک کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہلالِ عید دکھانے کے انداز میں بولا:

"وُہ۔۔۔وُہ۔

"وُہ" کی سیدھ میں دیکھا تو ایک غیر پاکستانی ائیر لائن کے دفتر کے کونے میں پی آئی اے کی پھٹیچر سی پھٹی لٹک رہی تھی یُوں جیسے انٹر کان والے اپنے ریستوران کے کونے میں کسی کو چھابڑی لگانے کی اجازت دے دیں۔ بڑا صدمہ ہوا۔ جی چاہا کوئی پی آئی اے کارکن ملے تو شکوُہ و فریاد کر کے صدمہ ہلکا کریں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پی آئی اے کی پھٹی کے نیچے ایک پاکستانی ائیر ہوسٹس کھڑی ہے۔ تیزی سے اس کو یہ کہنے کے لیے کہ محترمہ، خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے اور السلام علیکم سے ابتدائے کلام کی۔ لیکن جواب میں چند ادق عربی الفاظ کا متبرک مگر ناقابلِ فہم سا چھینٹا ہمارے کانوں پر آ پڑا جس میں سے تلاش کے باوجود کوئی وعلیکم السلام قسم کی چیز بر آمد نہ ہوئی۔ پھر انگریزی آزما کر دیکھی لیکن اب کے جوابی بوچھاڑ ناقابلِ فہم ہی نہ تھی، کُچھ غیر متبرک بھی تھی۔ پتہ چلا کہ صرف یونیفارم پاکستانی ہے اندر لڑکی لبنانی ہے۔ ایسی لڑکی پی آئی اے کے کس کام آتی تھی: یہ راز خداوندانِ پی آئی اے کو معلُوم تھا یا خُود خداوند کو۔ اور اس وقت دونوں سے رابطہ مشکل تھا۔ چنانچہ ہم شکم میں شکوہ دبائے آگے چل نکلے۔

بہر حال ہمیں ٹکٹ تو خریدتا نہیں تھا، ہم تو صرف رشتہ وفا کے خیال میں پی آئی اے والوں کو دیکھ کر رُک گئے تھے لیکن جب دیکھا کہ رشتے کا دوسرا سِرا تھامنے والا کوئی

نہیں اور ہم ٹھوس عربی دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں تو مزید جنسِ وفا ضائع کئے بغیر سیر ھاڈیپارچر زہال کا رُخ کیا اور ناگہاں ایک دُنیائے رنگ و بو میں جانازل ہوئے۔

ایک بزرگانہ ہنہناہٹ

بیروت جیسی بین الاقوامی ائیر پورٹ کے ڈیپارچر زہال کی آبادی رنگ ورخ اور اوضاع واطوار کے اعتبار سے بڑی متفرق اور متلوّن ہوتی ہے۔ہاں بالکل عجائب خانہ لگتا ہے۔ کئی لوگوں کو بالمشافہ دیکھنے کے باوجود ان کے ویسا ہونے پر اعتبار نہیں آتا۔ کہتے ہیں کسی نے پہلی مرتبہ زرافہ دیکھا۔یعنی پاؤں سے شروع کر کے ٹانگوں سے ہوتے ہوئے گردن کے ساتھ ساتھ اُوپر ہی اُوپر دیکھتا گیا اور جب ایک مدّت کے بعد گردن کے سر ہونے کی نوبت آئی تو حیرت سے چلا اُٹھا: ”میں نہیں مانتا۔“

اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ ایک دراز ریش، جُبّہ پوش، درویش صورت اور آبنوس رنگ بزرگ کو دیکھیں جو اپنے دراز آستیں بازوؤں کو دو بے آستین، بے قباء، شباب آگیں، کافر ادالالہ رُخوں کی کمر میں ڈالے دُنیا و مافیہا سے بے پرواعین ڈیپارچر زہال کے بیچ انہیں گُدگُدا اور خود ہنہنا رہا ہو تو آپ مان لیں گے؟ ہم نے انہیں دیکھا تو ضرور لیکن ماننے سے انکار کر دیا۔

بیروت ائیر پورٹ پر پاکستان جزیرہ

اور اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دو اصلی اور ترو تازہ پاکستانی ائیر ہوسٹسیں ہال میں داخل ہو رہی ہیں۔ لبنان میں حُسنِ پاکستان کی موجِ نو بہار کا یُوں در آنا شاید ہم نہ مانتے کہ اچانک ہر دو نے مسکرا کر سلام کیا۔ ہم نے دِل میں کہا۔ ”ارے یہ تو ہماری پرانی رفیقائیں ہیں جو پرسوں کراچی سے ہمیں بوئنگ میں ساتھ لائی تھیں۔“

”السلام علیکم۔“ ہم نے آگے بڑھ کر اور کھل کر کہا۔ ”جب ہی تو میں کہوں۔ یہ زمین آسمان کیوں لگ رہی ہے!“

دو میں سے ایک بولی: ”اس لئے کہ پورے بارہ گھنٹے اس شہر کی زمین کو فخرِ قیام بخشا ہے۔“

کہا: ”سرِ تسلیم خم ہے۔“ اور سر خم کیا۔

”تو کہئے، بیروت میں کوئی بلبلیں اور قمریاں بھی ملیں؟“ یہ سوال نپل تقسیم کرنے والی نے پوچھا۔

”ملی تو نہیں، دیکھی ضرور ہیں۔“

”دیکھنے ہی کو مِلنا کہتے ہیں، سوائے اس کے کہ آپ انہیں پاکستان میں در آمد کرنے کے ارادے سے آئے ہوں۔“

ہم نے کہا: ”نہیں جناب اس جنس میں ہم بالکل خود کفیل ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے ہمیں اس ہال سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔“

ائیر ہوسٹسیں ذرا شرمائیں لیکن زیادہ مسکرائیں۔ تعریف عورت کی بڑی خوشگوار کمزوری ہے۔ انہوں نے بے باک امریکی انداز میں ہمیں برملا تھینک یو تو نہ کہا لیکن ان کی مسکراتی خاموشی میں (MANY THANKS[۲۸]) پنہاں تھے۔

اور اتنے میں چند اور پاکستانی مسافر ادھر آنکلے اور ڈیپارچر ہال کی وسیع دُنیا میں ایک چھوٹا سا پاکستانی جزیرہ تشکیل پانے لگا۔ ایسے عارضی جزیروں میں باتیں بلا تعارف ہی نہیں بے مطلب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ یقین کئے بغیر کہ مخاطب کون ہے، چھوٹی چھوٹی بے معنی گفتگوئیں چل پڑیں۔ لیکن باتوں باتوں میں ایک بامعنی بات سُنائی دی اور پتہ چلا کہ وُہ خاتون جو جزیرے کے مرکز میں کسی سے باتیں کر رہی ہے، مسز ”ش“

---

[۲۸] بُہت سارے شکریئے

کہلاتی ہیں اور وُہ لڑکی جو ذراہٹ کر مسز ''ش'' کو دیکھ رہی ہے، ان کی بیٹی ہے۔ مس ''ش'' اپنی ماں کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہے، سمجھ میں نہ آیا۔

مس ''ش'' مشکل بارہ سال کی لگتی تھیں یعنی ہرچند کہ ایک دو سال بعد شباب کے دروازے پر ایک قیامت کی دستک دینے والی تھیں تاہم سرِ دست ان کا قدم دہلیز سے بلاشک و شبہ باہر تھا۔ اس کے برعکس ان کی والدہ یعنی مسز ''ش'' دہلیز رسے گزر کر بہت سا فاصلہ طے کر چکی تھیں اور اب بڑی جانفشانی سے اپنے جملہ حربے۔۔۔ تنگ قبائیں بریدہ زلفیں، کولڈ کریمیں اور ہاٹ لپ سٹکیں۔۔۔ استعمال میں لاتے ہوئے اس فاصلے کے نشان مٹا رہی تھیں۔ لیکن اس عمل میں جزوی کامیابی ہی حاصل کر سکی تھیں۔ وُہ میک اپ سے مسلح ہو کر تقاضائے فطرت سے متصادم تو ہو گئی تھیں لیکن اس محارے میں بمشکل اپنے چہرے کا بھرم رکھ سکی تھیں۔ آپ کے پیٹ کا بھرم تو گلا اور قمیص پھاڑ پھاڑ کر فریاد کر رہا تھا کہ کُچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟ اور بظاہر جواب نفی میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسز ''ش'' اگر ایک زاویے سے قابلِ برداشت نظر آتی تھیں تو دُوسرے زاویے سے برداشت سے یکسر باہر تھیں۔

اتنے میں یکایک کسی نے کہا: ''وُہ دیکھیں کراچی سے بوئنگ آ پہنچا۔''

اور سب نگاہیں آہستہ آہستہ رُکتے طیارے پر جم گئیں۔ غور سے دیکھا تو یہ وُہی بوئنگ تھا جو دو روز پہلے ہمیں کراچی سے لایا تھا۔ اور پھر جیسا کہ دستور ہے، کُچھ مسافر اُترے۔ کُچھ سوار ہوئے۔ جہاز کا عملہ تبدیل ہوا۔ پرواز سے پہلے کی رسوم ادا ہوئیں۔۔۔ خوش آمدید، آکسیجن، حفاظتی بند، سونف اور سنگتریاں۔۔۔ اور طیارہ لبنان کی نیلگوں فضا میں بلند ہوا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ استنبول تھا۔

فراغت و کتاب۔۔۔

اور بوئنگ میں مسافروں کی تعداد نشتوں کے نصف سے بھی کم تھی۔ تقریباً ہر مسافر کے ساتھ کی سیٹ خالی تھیں، سوائے اس سیٹ کے جہاں مسز "ش" اور مس "ش" ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔ ہم تنہا تھے لیکن اس تنہائی سے ایسے ناخوش نہ تھے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس سے پہلے کی پروازوں میں بھی ہم نے اپنے ہم نشینوں سے کُچھ فیض نہیں پایا تھا۔ ہمارا تجربہ ہے کہ دس میں سے نو ہم نشینوں کے مقابلے میں ایک پسندّیدہ کتاب بستر ساتھی ہے۔ ہاں اگر خوش قسمتی سے وُہ دسواں ہم نشین وُہ جانِ آرزو میسر آ جائے تو کتاب کیا جان بھی قربان کی جا سکتی ہے۔ لیکن آج کے ہمسفروں میں ایسی جنس نظر نہ آئی کہ جاں نثاری کی نوبت آتی۔ چپکے سے ہم نے بیگ سے "دھنک پر قدم[۲۹]"

[۲۹] محترمہ ریاض الدین اختر ریاض الدین کی تصنیفِ لطیف

نکالی اور اپنی پرواز بھول کر مصنّفہ کی پروازوں میں کھو گئے۔ ساتھ ہی اپنی ایک دیرینہ مراد پالی یایُوں کہیں کہ اس کا دو تہائی پالیا:

فراغت و کتابے و گوشۂ چمنے

استنبول تک سفر پُرسکون گزرا، سوائے اس کے کہ مسز "ش" کئی بار اپنی نشست سے اُٹھ کر کسی دُوسرے مسافر کے ساتھ والی خالی سیٹ پر جا بیٹھیں اور اس طرح انہوں نے اپنے کئی ہمسفروں کو باری باری قدمے وسخنے لطفِ رفاقت بخشا۔ خُدا جانے یہ مسز "ش" کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا یا حکمتِ ایزدی کہ ہم اس رفاقت سے محروم یا محفوظ رہے۔ اتنے میں استنبول آ گیا۔ جہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے اُترے۔ استنبول کی ائیرپورٹ دیکھی۔ اپنے ترک بھائی بہنوں کی زیارت کی۔ انہیں مل کر مسرت ہوئی کہ ہمیں پاکستانی پاکر کِھل اُٹھے۔۔۔ ترک جذباتی طور پر پاکستانیوں سے بہت قریب ہیں، خوش دِل و خوش اختلاط، سادہ و روشن جبیں۔ نصف ساعت میں کوئی نصف درجن دوست بن گئے اور رخصت ہوئے تو ان کی دُعاؤں نے ترکی کی سرحدوں تک ہمارا ساتھ دیا۔

اُتر آنا تعارف پر مسز ش کا

استنبول سے جنیوا روانہ ہوئے تو ہم نے اپنی رفیقِ تنہائی۔۔۔ "دھنک۔"۔۔ کو پھر کھول لیا اور میکسکو کی مہ وشوں میں محو ہو گئے۔ پھر اچانک ہماری بائیں آنکھ کے بائیں کونے سے ہمارے دماغ کے پردے پر ایک پہاڑ سا ہیولا نمودار ہوا اور اسی لمحے ہمارے ساتھ کی خالی سیٹ کے مُنہ سے ایک کرب انگیزی چیخ نکلی۔ رُخ پھیر کر سیٹ کو دیکھا تو بے چاری مسز ش میں مبتلا پائی۔ مسز ش پوری طرح بیٹھ بھی نہ چکی تھیں کہ ہم سے مخاطب ہوئیں:

"السلام علیکم۔۔۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

زور کہاں پر نہ تھا، آپ پر تھا، یعنی میں دوسروں کے کوائف تو اکٹھا کر چکی ہوں، اب آپ کی باری ہے۔ ہم سوال کی بے تکلّفی سے فوراً چونکے۔ مسز ش کو قریب سے دیکھا تو چہرہ بھی قابلِ دید لگتا اور کبھی قابلِ رحم۔ بہر حال وعلیکم السلام کہا اور عرض کیا:

"جانا تو لندن ہے مگر آج جنیوا ہی میں ٹھہروں گا۔ اور دو دن بعد انگلستان جاؤں گا۔"

”سچ۔“ مسز ش نے کسی قدر چہک کر کہا۔ ”ہم بھی لندن جا رہے ہیں اور آپ کی طرح دو دن جنیوا ٹھہریں گے۔ سارے مسافروں میں سے صرف آپ کا پروگرام ہم سے ملتا ہے۔“

کہا: ”عجیب اتّفاق ہے۔“

مسز ش فوراً باضابطہ تعارف پر اُتر آئیں

”میں مسز ش ہوں۔ میرے ساتھ میری بیٹی گلشن ہے۔ وُہ بیٹھی ہے۔“

اس نام اور رشتے کا علم ہمیں پہلے سے تھا لیکن دستور کے مطابق وُہ سکہ بند تعارفی جملہ دہرایا۔

”آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔“

محترمہ بولیں اور ”آپ سے بھی، مگر آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔“

ہم نے نام عرض کیا لیکن شاید محض نام سے آپ کی تشفی نہ ہو سکی۔ پوچھنے لگیں۔

”آپ کام کیا کرتے ہیں؟ رہتے کہاں ہیں؟“

عرض کیا: ”فوجی ہوں اور فوجی کا کوئی مقام نہیں۔“

”یہی تو فوجیوں کی خوبی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔“

”محترمہ ہر گھاٹ کی آب وہوا خوشگوار نہیں ہوتی۔“

”لیکن واحد خوشگوار گھاٹ سے بھی تو آدمی اُکتا جاتا ہے۔“

”چلئے یونہی سہی، فرمائیں آپ یعنی آپ کے میاں کیا کام کرتے ہیں۔“

”کرتے تھے۔ پانچ برس ہوئے بے چارے اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

اور یہ مژدۂ جانفزا سناتے ہوئے مسز ش نے بڑی داد طلب گاہوں سے دیکھا، گویا مرحوم نے یہ قربانی ہماری خاطر ہی دی ہو۔ حالانکہ مسز ش کو دیکھتے ہوئے زیادہ قرین قیاس یہ بات تھی کہ مرحوم اپنی خاطر ہی جان سے گزر گئے ہوں گے۔ بہر حال ظاہر تھا کہ اگر محترمہ مرحوم کے نعم البدل کی تلاش میں ہیں تو نعم البدل کو اپنے پیشرو کی ہسٹری سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ پہلے تو رسمِ دُنیا کے طور پر ہم نے ایک حسرت بھرا سانس لیا۔ زیرِ لب اِنَّالِلّٰہِ پڑھی اور بالائے لب کہا۔

”بڑا افسوس ہے۔ کوئی حادثہ پیش آیا تھا یا قدرتی موت تھی؟“

بڑے اطمینان سے بولیں۔ ”بخار ہوا تھا۔ بیمار پڑ گئے اور مر گئے۔۔ اور ہاں، آپ بیگم کو ساتھ نہیں لائے؟“

بالفاظِ دیگر مسزش کہہ رہی تھیں کہ "کیا بیکار بے ربط اور بیہودہ سوال کر رہے ہو؟ اگر مرحوم کے انتقال کی خبر سُن کر تمہارے جذبۂ تاسف ہی کو چوٹ لگی ہے تو بڑے غلط جذبے کو چوٹ لگی ہے اور یہ کہ ہم نے اپنے پتّے میز پر رکھ دیئے ہیں۔ تم اپنے پتّے سیدھے کرو۔"

ہم نے مسزش کو بغور دیکھا تو ان کی پیشانی پر ایک دُھندلی سی تحریر نظر آئی۔ "مُشتری ہوشیار باش۔" بہرحال ہم نے سچائی سے کام لیتے ہوئے ان کے سوال کا جواب دیا۔

"جی بیگم تو نہیں آ سکیں۔"

یہ سُن کر کہ بیگم ہے، مسزش کو مایوسی ہوئی۔ لیکن واجبی سی ہی کیونکہ بیگم نے ساتھ نہ آ کر تلافی بھی کر دی تھی۔ کہنے لگیں۔

"تو آپ سیر کے دوران [۳۰] لونلی (تنہا) نہ محسوس کریں گے؟"

"اگر کریں گے تو برداشت کریں گے۔"

"فوجی بڑے سخت دِل ہوتے ہیں۔"

---

[۳۰] Lonely

جی چاہا کہ دِل نکال کر محترمہ کی ہتھیلی پر رکھ دیں اور کہیں کہ ذرا مُٹّھی میں دبا کر اس کی سختی کا اندازہ کر لیں۔ یہ غیر فوجی دِلوں سے بہت مختلف نہیں۔ لیکن اتنے میں دُوسری نشست سے مس ش کی آواز آئی جس میں خفیف سی جھنجلاہٹ بھی تھی۔

"امی۔ اب ادھر بھی آؤ۔"

اور مسز ش جیسے سکول سے بھاگے ہوئے بچّوں کی طرح پکڑی گئی ہوں، ناچار اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اب جنیوا ملیں گے۔۔۔" اور جنیوا اب کوئی پانچ منٹ ہی دور تھا۔

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں

لیکن مسز ش سے ملاقات تو بعد میں ہوتی رہے گی۔ آیئے ذرا طیارے کی کھڑکی سے سوئٹزرلینڈ کا فضائی نظارہ کریں۔

سبحان اللہ۔ یہ کسی قطعۂ ارض کی جھلک ہے یا حُسنِ ازل کی نمود! خُدایا تو نے کُن کہتے ہوئے کیا دو قسموں کی تخلیق کا حکم دیا تھا؟ سٹینڈرڈ اور ڈیلکس؟ عام اور خاص؟ میرے سامنے یہ وُہ زمین تو نہیں جسے دیکھنے کا میں عادی ہوں۔۔۔ یہ کافر کوُہساروں کے سانولے سرمئی سلسلے، یہ سبز و کبود وادیُوں کے ریشم میں لپٹے ہوئے نشیب و فراز، یہ

دِلربا بلندیاں، یہ پرفسوں پستیاں، یہ پہلوئے کوُہ کی سلوٹوں میں رنگ رنگیلی بستیاں، یہ سُرخ چھتوں والے بے شمار کاٹیج، یہ بکھری ہوئی بیر بہوٹیاں، یہ چھڑکی ہوئی روبیاں، یہ رنگ روپ کے بدلتے ہوئے سین جیسے قدرت کسی باتصویر کیلنڈر کے صفحے اُلٹ رہی ہو۔ اللہ یہ باغ وراغ تو نے کس کارخانے میں بنائے ہیں؟ یہ سبزۂ گُل کہاں سے آئے ہیں؟۔۔۔ میں ان سوالوں کے جواب میں کسی ملکوتی آواز کا منتظر تھا کہ ایک انسانی آواز آئی۔

”خواتین و حضرات ہم تھوڑی دیر میں جنیوا کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں۔ براہِ کرم اپنے حفاظتی بند۔۔۔“

ائیر ہوسٹس نے ہمارا خواب پریشان کر دیا۔ حالانکہ اس لڑکی سے ہمیں صرف نیکی کی توقع تھی۔ ناچار ہم حُسن و جمال کی دُنیا چھوڑ کر حفاظتی بندوں کی دُنیا میں لوٹ آئے۔

جنیوا ائیر پورٹ: جائیں تو جائیں کہاں؟

جہاز سے اُترے اور ائیر پورٹ کے لاؤنج میں پہنچے، جہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل کو جانا تھا۔ لیکن کونسی منزل؟ کون سا ہوٹل؟ کون سی سرائے؟

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ ایک آواز آئی۔ ”آپ کے ہوٹل کی تلاش ہمارا فرض ہے۔“

اور کیا دیکھتے ہیں پی آئی اے کی یونیفارم میں ایک سوستانی حسینہ، ایک فتنہ گر قدو گیسو، ہمارے کانوں میں جرمن لہجے میں انگریزی رس گھول رہی ہے۔ پھر ہمارا بازو تھامے ہمیں ایک کیبن کی طرف لے گئی جہاں تین چار لڑکیاں ٹیلی فونوں سے مسلح ہو کر جنیوا کے ہوٹلوں میں بیرونی مہمانوں کے لئے کمرے تلاش کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے ہماری خاطر ہمارے بیٹھے بیٹھے ٹیلی فون کی چھلنی سے سارا جنیوا چھان مارا۔ سینکڑوں کالیں، سینکڑوں ناکامیاں اور[۳۱] سینکڑوں مُسکراہٹیں، لیکن آخر ایک گہرا، ٹھنڈا اور پیارا سانس لے کر بولی:

"کائن پلٹس"[۳۲] (کوئی جگہ نہیں)۔

ہم مایوسی میں ایک اور آہ کھینچنے کو تھے کہ بولی: "ذرا آہ کو روکیں۔ میں کسی پانساں[۳۳] کو فون کرتی ہوں۔ شاید جگہ مل جائے۔"

پوری بیس پانساؤں کو فون کرنے کے بعد اکیسویں سے جواب ملا کہ دو کمرے خالی ہیں۔ ہم نے پوری بے صبری سے کہا:

---

[۳۱] CALLS

[۳۲] KEIN PLATS

[۳۳] گھریلو مہمان خانہ

"ایک ہمارا ہے، کرایہ خواہ کُچھ ہی ہو۔"

شاید کبھی کمخوابوں میں ملیں

ساتھ ہی ہم نے لڑکی سے قلم چھین کر ہاتھ کی ہتھیلی پر پانساں کا پتہ نوٹ کیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی تیز رو سی سواری مثلاً ہیلی کاپٹر یا راکٹ مل جائے مگر نہ ملی۔ ناچار ٹیکسی لی اور پیشتر اس کے کہ کوئی رقیبِ روسیاہ و برق رفتار وہاں پہنچ جاتا ہم ٹیکسی سے اُتر کر سیڑھیوں اور لفٹوں سے ہوتے ہوئے پانچویں منزل پر مالکہ پانساں، مادام پیکارڈ سے محوِ راز و نیاز ہو گئے۔ یعنی اپنا نام پتہ لکھایا، ان کا پوچھا اور کمرہ لے لیا۔ یہ مادامیں عام طور بھاری، بھدّی اور بھمبو سی مخلوق ہوتی ہیں لیکن مادام پیکارڈ مستثنیات میں سے تھیں۔ عُمر ایسی بالی نہ تھی یعنی مسز ش کی ہم عُمر ہوں گی، لیکن مسز ش کی ہم وزن یا ہم جثہ یقیناًنہ تھیں۔ مادام پیکارڈ کی پیمائشِ ثلاثہ[۳۴] فیصلہ کُن طور پر غارتگرِ صبر و شکیب تھی یعنی مسز ش کے ۴۰ - ۴۰ - ۴۰ کے مقابلے میں فقط ۳۵-۲۰-۳۵ تھی اور اگر موخرالذّکر اعداد کی ملکہ میں کسی کو بھدا پن نظر آئے تو آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں۔

---

[۳۴] (VITAL STATISTICS) چھاتی، کمر اور کولہوں کا ناپ انچوں میں

بہر حال ہم ابھی مادام پیکارڈ سے محوِ گفتگو تھے کہ ایک اور خاتُون ہانپتی کانپتی دروازے سے داخل ہوئی۔ جی ہاں، یہ مسز ش مع مس ش ہی تھیں جو بظاہر ہمارے نقشِ قدم بلکہ خطِ پرواز پر اُڑتی آگئی تھیں۔ مسز ش نے ہمیں دیکھا تو بولیں:

"کتنا عجیب اتّفاق ہے۔ آپ کو بھی اسی ہوٹل میں جگہ ملی جہاں ہمیں ملی۔"

اب اوّل تو ہمیں محترمہ کے ہوٹل میں نہیں، بلکہ محترمہ کو ہمارے ہوٹل میں جلہ ملی تھی کہ بحیثیت مسافر ہم چند منٹ سینیئر تھے۔ دُوسرے موصوفہ ہمارے پیچھے محض اتفاقاً نہیں، ذرا ارادۃً تشریف لائی تھیں لیکن ایک خاتون کو زِچ کرنا ہمارا منصب نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے مسز ش کی تائید میں کہا:

"جی ہاں، واقعی عجیب اتفاق ہے ورنہ میں سمجھتا تھا کہ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔"

بولیں "کیا کہا، کہاں ملیں؟ کمخوابوں میں؟"

ہمارا شعر ضائع ہو گیا تھا۔ دراصل مسز ش جملہ کاروبار بشمول عشق سلیس نثر ہی میں کر سکتی تھیں۔ ہم اپنے کوائف لکھوا چکے تھے لیکن باوجود شدید خواہش کے اپنے کمرے کو نہ جاسکتے تھے کہ مسز ش کا سلسلۂ کلام راستہ روکے کھڑا تھا۔ ادھر سامنے کی کھڑکی سے جھیل جنیوا کا جاں پرور نظارہ دامنِ دل کھینچ رہا تھا۔ جی چاہتا کہ کب کمرے میں جا

کر سامان رکھیں، کپڑے بدلیں اور جھیل کے کنارے پہنچیں۔ اتفاقاً ہماری نگاہ کے تعاقب میں مسز ش نے بھی جھیل جنیوا کی جھلملاتی جھلک دیکھی تو یکایک بولیں:

"سامان رکھنے کے بعد کہاں جایئے گا؟"

کہا: "جھیل کے بغیر کہاں جاسکتا ہوں۔"

بولیں: "ٹھیک ہے ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔"

لیکن مس ش نے فوری ترمیم کی:

"امّی، ہم بازار جائیں گے، ہم نے گھڑیاں خریدنی ہیں۔ جھیل بعد میں دیکھیں گے۔"

امّی بولیں: "نہ بیٹی ابھی چار ہی تو بجے ہیں۔ یہ جھیل دیکھنے کا وقت ہے۔ گھڑیاں تو شام کو بھی خریدی جاسکتی ہیں۔"

یہ سُن کر مس ش زبان سے چپ رہی لیکن اپنا پیچ و تاب نہ چھپا سکی۔ پیچ بدن کا اور تاب چہرے کی۔ دراصل مس ش کا منشا یہ نہ تھا کہ والدہ محترمہ کو جھیل کی سیر سے محروم رکھا جائے بلکہ یہ کہ ایک غیر محرم کی رفاقت سے پرہیز کرایا جائے اور ہم دِل و جان

سے مس ش کے ہم خیال تھے۔ مس ش جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بلحاظِ عمر لولٹیا[۳۵] سے بھی چھوٹی تھیں۔ یعنی جوانی کے گردابِ بلا سے خاصی دور، ساحل پر یا شاید ساحل سے بھی ذرا ہٹ کر ہلکی ہلکی نرم خیز ہوا میں بیٹھی تھیں اور مسز ش جیسے طوفان زدوں کے جذبات اور احساسات سے یکسر بے خبر۔ اگر ماں کی دُنیا پر اس کے دِل کی فرماں روائی تھی تو بیٹی کے دماغ پر آٹھویں جماعت کی کتاب الاخلاق چھائی تھی۔ چنانچہ اگر مسز ش اپنے دکھ کا مداوا کرنا چاہیں تو بیٹی مادری کوششوں کو شُبہ کی نگاہ سے دیکھتی اور سوچتی کہ شاید ماں کی تربیت میں کُچھ کمی رہ گئی ہے۔ چنانچہ اب ہر لمحہ اپنی والدہ ماجدہ کی اخلاقی پرورش کی فکر میں تھی۔ اور جہاں کہیں دیکھتی کہ بے چاری کے کردار میں جھول آگیا ہے اور اصلاح دیتی یا دینے کی کوشش کرتی۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے کہ ہمیں بیٹی سے اتفاق تھا اور ماں سے ہمدردی۔ بے شک ہمارے باب میں ماں مہربان تھی اور بیٹی نامہران۔ مگر ہمیں ماں کے کرم کی حاجت تھی نہ بیٹی کے ستم کی شکایت۔ چنانچہ ہم غیر جانبدار رہے اور ماں بیٹی کو بحث کرتے اور کوائف لکھاتے چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے کہ دیکھیں اس پانساں کے باطن کا کیا رنگ ہے۔

---

[۳۵] روسی ناول نگار نابوکاف NABOKOV کے مشہور انگریزی ناول LOLITA کی نوخیز ہیروئن

پھُول کے بدلے دِل حاضر ہے

کمرے میں داخل ہونے لگے تو پہلا تاثر حسرت کا تھا۔ دوسرا حیرت کا اور تیسرا عِشرت کا۔ حسرت اس بات کی کہ زندگی میں صرف دو راتیں سوئٹزلینڈ میں گزارنے کو ملیں اور وُہ بھی کِسی جگمگاتے ہوٹل کی بجائے بے ننگ و نام سی پانساں کی نذر کر دیں۔ حیرت اس بات پر کہ کمرے میں قدم رکھا تو معلُوم ہوا کہ کمرے کے اندرونی تیور تابناک ہوٹلوں سے بھی تیکھے ہیں۔۔۔ وُہی امیرانہ لوازم: اونی قالین، ریشمی صوفہ اور فومی بستر، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور بیسیوں متفرّق بٹن جن پر انگلی رکھتے ہی مختلف حاجتیں پوری ہونے لگیں۔۔۔ اور یہ سب کُچھ ایک کشادہ کنگ سائز کمرے میں جس کا ظرف عام ہوٹلوں کی نسبت محلات سے مشابہ تھا اور عشرت اس وجہ سے کہ صوفے پر بیٹھے تو گویا میڈم پیکارڈ نے اپنی چاند سی بانہوں میں لے لیا۔ اور بستر میں داخل ہوئے تو جیسے کسی گداز آغوش میں منتقل ہو گئے۔ نہانے کے لئے غُسل خانے میں گئے تو چیزوں کو چھونے سے جھجھکنے لگے کہ میلی نہ ہو جائیں۔ یہ سوئستانی ناقابلِ برداشت حد تک صفائی پسند ہیں۔ نہا کر چائے پینے لگے تو محسوس ہوا جیسے زندگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا مادام پیکارڈ نے آبِ حیات اُبال کر پتّی ڈالی تھی اور ہائے وُہ مادام کی نفاستِ زوق کہ چائے کے ساتھ دو پلیٹوں میں کُچھ اشیائے نقل لے آئی تو تیسری میں فقط ایک تازہ پھُول رکھ

لائی۔ اس ادائے خاص کا ایک ہی جواب تھا کہ پلیٹ واپس کرتے ہوئے اسمیں دِل رکھ دیجئے لیکن ایسی فضول خرچی بھی کیا! چھوٹا سا شکریہ ادا کر دیا۔۔۔ ہم نے بڑے ہوٹلوں میں رہنے والوں کی زبوں حالی پر ایک دو پُر خلوص آہیں بھریں اور چھڑی ہاتھ میں لے کر جھیل جنیوا کی سیر کو نکل پڑے۔

ایک اجنبی پیازی کانوں والا

باہر نکلے تو دروازے پر مسز ش کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔۔۔ ارادۃً۔۔۔ قریب ہی مس ش اپنے نو خیز نتھنے پھلائے اور تیکھی تیوری چڑھائے کھڑی تھیں۔۔۔ احتجاجاً۔۔۔ اور جب روش پر چل نکلے تو مس ش پھُرتی سے ہم دونوں کے درمیان چلنے لگیں۔۔۔ احتیاطاً!

بہر حال دورانِ رفتار میں ماں بیٹی کے محلِ وقوع کا دماغ نہ تھا کہ ہمارے سامنے جھیل جنیوا کے پانی کی قلزم نما وسعت تھی جس کی سطح پر تہ آب سے اُمنڈتا ہوا فلک بوس فوارہ ایک کوہ پیکر رباب کی شکل میں بیک وقت سر بلند اور سر نگوں ہو رہا تھا۔ جھیل کے کنارے پہنچے تو کنارے سے لپٹ جانے کو چاہا۔ پھُولوں کے ہجوم میں بیٹھنے کو سکوں بخش خیابانی نشستیں، چلنے کو جنوں بخش مستانی روشیں اور دیکھنے کو طراوت بخش سوستانی دوشیزائیں۔ نشستوں، روشوں اور دوشیزاؤں کے رنگ روپ کا پھر وُہی عالم کہ ہمارے

دست و پا الگ رہے، اگر چاندنی بھی چھو جائے تو رنگ میلا ہو۔ سوئٹزلینڈ میں فطرت ہر شے کا اپنے ہاتھوں سے میک اَپ کرتی ہے۔

ایک چوبی روش اندرون آب کو جاتی تھی۔ اسی پر ہو لئے اور مرکز میں ایک کھلے چبوترے پر جنگلے سے لگ کر دور دور تک جنیوا اور جنیوا کی جھیل کا نظارہ کرنے لگے۔ نیچے پانی میں دیکھا تو گزوں تک نگاہ اُترتی چلی گئی مگر کیا مجال جو سطحِ آب اور بطنِ آب کے درمیان کُچھ غیر آب نظر آئے۔ یعنی از قسم کا غذ یا برگ و گیاہ۔ فقط جنگلے کے ساتھ راج ہنسوں کا جوڑا غسل کے بعد آرائشِ جمال میں محو تھا اور اس عمل میں مادہ نے دو فالتو پَر نذرِ آب کر دیئے تھے جو ننھّی ننھّی بادبانی کشتیوں کی طرح تیرنے لگے تھے اور بجائے خود حُسن کے نقطے نظر آتے تھے۔ اور پھر ایک امریکن ٹورسٹ بی بی گلے میں لگائے ہوئے پانچ کیمروں میں سے ایک سے ہماری پارٹی کی شست لینے لگی لیکن بٹن دبانے سے پہلے مُسکرا کر بولی:

"آپ کی پوشاک کس قدر رنگ بھری ہے۔ کیا میں آپ کی تصویر لے سکتی ہوں؟"

یہ سوال مس اور مسز ش سے کیا گیا تھا۔ سوال سُن کر ماں بیٹی نے ایک دُوسرے کو فخریہ نظروں سے دیکھا اور مسز ش بولی۔ "ضرور۔"

اس پر امریکن فوٹو گرافر نے مسز ش سے کہا:

"شکریہ۔ اور اگر زحمت نہ ہو تو آپ اپنے خاوند کے دائیں ہاتھ کھڑی ہو جائیں اور آپ کی بیٹی ان کے بائیں ہاتھ۔"

"خاوند!" ہم نے بالکل بلا ارادہ اپنے گلے کی گہرائی میں دہرایا۔ یعنی اضطرار میں لفظ خاوند کا غرارہ کر لیا لیکن کوئی بامعنی آواز باہر نہ نکلنے دی۔ ہرچند کہ ہمارے چہرے پر بلشBLUSH آنے کی عمر نہ تھی، تاہم ہمارے گوش ور خسار تیز پیازی ہو گئے۔ اب فوٹو گرافر کی تردید ماں بیٹی کا کام تھا کہ ہم شریکِ گفتگو نہ تھے لیکن مسز ش نے اس غلط رشتے کے اعلان پر کوئی واضح احتجاج نہ کیا اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا بلش دونا پیازی ہو گیا۔ مس ش نے اس صورتِ حال پر اپنے دودھ کے دانت پینا شروع کئے جس پر مسماۃ فوٹو گرافر خوش ہو کر بولی:

HOLD THAT SMILE[36]

اور بٹن دبا کر تصویر لے لی۔۔۔ اگر یہ تصویر رنگین فلم پر لی گئی تھی تو یقیناً اسے کسی امریکی نمائش میں انعام ملا ہو گا۔ کیا ایک ایسی تصویر شاہکار نہ ہو گی جس میں ایک ہنستی

---

36 ذرا تھامنا اس مسکراہٹ کو

ماں اور دانت پیستی بیٹی کے درمیان ایک پیازی کانوں والا اجنبی، لفظ خاوند کے غرارے کر رہا ہو؟

جھیل کی سیر ہو چکی تو بازار کی سیر کی باری آئی۔ ہمیں تفریحاً مسز ش کے ساتھ شاپنگ میں اعتراض نہ تھا اور مسز ش کو اشتیاقاً ہمارے ساتھ مل کر شاپنگ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن ہمیں مس ش کو مزید اذیت دینا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے ماں بیٹی سے کھڑے کھڑے ایک فرضی دوست سے ملنے کا بہانہ کیا۔ مسز ش نے دوست کے وجود اور محلِّ وقوع کے متعلق جرح کرنا چاہی لیکن ہم ہاتھ ہلاتے خدا حافظ کی آڑ لیتے، تیز تیز قدم اُٹھاتے چل نکلے حتیٰ کہ ہم اپنے مجازی کنبے کی کششِ ثقل سے باہر نکل گئے۔

چیلنج بنام جملہ خرگوشانِ عالم

بازار میں داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی اور دکانوں کا ظاہر و باطن رنگارنگ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ یہ روشنیاں بیروت اور کراچی کی طرح بصارت پر گراں نہ تھیں اور غور سے دیکھا تو وجہ معلوم ہو گی۔ روشنیاں متحرک نہ تھیں، ساکن تھیں۔ متحرک اور ساکن روشنیوں میں وہی فرق ہے جو مار کُٹائی سے بھرپُور اور مہر و محبّت سے لبریز فلمی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ بے شک یہ سوستانی خوش ذوق ہیں اور سکون کے قدردان ہی نہیں نگہبان بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر دانی

میں کُچھ سرکاری اشارہ بھی ہو گا ورنہ کوئی سر پھرا دکاندار اپنی دکان کے ماتھے پر دو چار وضعدار قُمقُموں کی بجائے برق و رنگ کا ایک باولا رقص برپا کر سکتا تھا۔ اور یہ سوِس کاریگروں کے لئے کُچھ مشکل بھی نہیں۔ جن لوگوں کی چابکدستی آہن و سنگ میں جان ڈال کر انہیں دُنیا کی حسین ترین گھڑیوں میں بدل سکتی ہے وُہ تانبے کی تار سے بجلی گزار کر ایک جنوں خیز نیان سائن بھی تیار کر سکتے ہیں۔ کراچی میں یہی کام ہمارے ٹھٹھیرے کر رہے ہیں اور بے روک ٹوک کر رہے ہیں۔

لیکن آیئے سوِس گھڑیوں کی بات کریں۔ سوئٹزلینڈ کے بازاروں میں سب کُچھ ہے لیکن خدا جانے یہ احساس کیوں غالب رہتا ہے کہ یہاں گھڑیوں کے سوا کُچھ بھی نہیں اور یہ ہونا بھی چاہیئے۔ عام لوگوں کو معلُوم نہیں کہ سوئٹزلینڈ میں گھڑیوں کی شرح پیدائش دُنیا کی کسی ذی روح مخلوق سے کم نہیں اور یہ چیلنج اہلِ چین و ہندی کے لئے نہیں، جملہ خرگوشانِ عالم کے نام بھی ہے جن کی کثیر العیالی کے بڑے بڑے درباروں میں چرچے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ کو خرگوشوں کے خاندانی منصوبوں سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تاہم ذرا سوچ کر بتائیں کہ دُنیا بھر میں ایک سال میں تخمیناً کتنے خرگوش تولّد ہوتے ہوں گے؟ ایک کروڑ؟ دو کروڑ؟ چلو چار کروڑ؟ بس؟ تو خدا آپ کا بھلا کرے سوئٹزلینڈ والے ایک سال میں پوری سات کروڑ گھڑیوں کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن اگر مغربی پاکستان سوئٹزلینڈ کو گھڑیوں کا ٹھیکہ دے دے تو ہر پاکستانی شہری ہو یا

دیہاتی اپنی ہر سالگرہ پر نئی گھڑی باندھ یا لگا سکتا ہے۔ لیکن افسوس جب تک ایران، سعودی عرب اور کویت کا جملہ تیل متفقّہ طور پر اپنا رُخ بدل کر کسی پاکستانی چشمے کے رستے نکلنا شروع نہیں کرتا، ہمیں سوئٹرزلینڈ کے ساتھ یہ تجارتی معاہدہ ملتوی رکھنا پڑے گا۔ البتّہ اس تیل کے پیشِ نظر جو ہمارا اپنا گاؤں بل کسر[۳۷] پیدا کرتا ہے، ہم نے ایک پیاری سی سنہری ملمع والی گھڑی خرید لی۔ ملمع والی اس لئے کہ ہمارے تیل کے چشموں کی محدود پیداوار بھی ملک کو سونے سے نہیں بھر سکتی، فقط ملمع ہی کر سکتی ہے۔

اہلِ جنیوا کی انگریزی کمزور ہے

گھڑی تو خیر ہم نے کامیابی سے خرید لی لیکن چند دُوسری اشیا خریدنے میں ہمیں خاصی دقّت پیش آئی۔ یہ نہیں کہ جنیوا میں چیزیں نایاب تھیں۔ ذرا انگریزی کمیاب تھی۔ بلکہ اکثر لوگ خاصی معقول انگریزی بول بھی رہے تھے۔ صرف ان لوگوں یا دکانداروں کی انگریزی جن سے ہمیں کام تھا۔ خاص طور پر کمزور تھی۔ بنیان خریدنے کیلئے جب ہماری تمام انگریزی بے نیلِ مرام ضائع ہو چکی تو ناچار اپنی قمیص کے بٹن کھول کر بنیان

---

[۳۷] مصنّف کا گاؤں بل کسر جو چکوال سے ۱۲ میل مغرب میں ہے اور جہاں تیل کے متعدد چشمے ہیں

دکھانا پڑی۔ اور خدا کا شکر ہے صرف بنیان ہی کی ضرورت تھی۔ اس اصول کے ماتحت کھانے کے لئے ہمیں یوں تو ڈائننگ ہال کی بجائے کچن میں جانا پڑتا مگر بھلا ہو خدا کے اس برگزیدہ بندے کا جس نے یورپ میں سیلف سروس ایجاد کی ہے۔ اب کھانے کو کھانے سے پہلے نام سے مخاطب نہیں کرنا پڑتا، بلکہ بِلا تعارف اور براہِ راست اپنے ہاتھ سے دیگچے سے پلیٹ میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہی ہم نے کیا اور اس کا پہلا فائدہ یہ نظر آیا کہ جسے مچھلی سمجھ کر اُٹھایا تھا، مچھلی ہی تھی، بھنڈی نہ تھی۔ سیلف سروس سے پہلے مینو[۳۸] سے آرڈر کرنے کا کئی بار نتیجہ یہ نکلا کہ تجریدی آرٹ کیطرح جس کو سمجھا تھا اناناس[۳۹] وُہ عورت نکلی۔

ایک رات پہلے نیند سے۔۔۔

رات دیر سے پانساں کو لوٹے تو مسز ش اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں اور محض اتفاقاً کیونکہ ہمیں دیکھتے ہی فرمانے لگیں:

---

[۳۸] (MENU) فہرستِ طعام

[۳۹] یہ مصرع سیّد محمدؐ جعفری کا ہے۔

”کیا عجیب اتفاق ہے! اگر آپ ایک منٹ پہلے یا بعد میں گزرتے تو ہماری مڈ بھیڑ نہ ہوتی۔“

پھر وُہ ذرا سی رُک گئیں جس کا مطلب یہ تھا کہ مڈ بھیڑ تو ہو ہی چکی ہے لہٰذا تھوڑی سی گفتگو بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہم نے کُچھ کہے بغیر سر تسلیمِ خم کیا۔ بولیں:

”تو اتنی دیر تک کیا ہوتا رہا“؟

عرض کیا: ”کیا ہونا تھا؟ جدھر بازار لے چلا چلے گئے۔“

”کوئی رہنما نہ ملا؟“

”کوئی ہم زبان تک نہ ملا۔“

ہمارا خیال تھا مسز ش نے تفصیل پوچھی تو بنیان کی خرید کا قصہ سُنائیں گے اور شب بخیر کہیں گے۔ لیکن مسز ش کے دِل میں تو ایک سنگین سا شک کھول رہا تھا۔ ہمہ تن سوال بن کر:

کہنے لگیں۔

”آپ تو ایک دوست کو ملنے گئے تھے؟“

ہمیں اپنا بہانہ یاد نہیں رہا تھا اور ہم پہلے دروغ گو نہ تھے جس کے حافظے نے خطا کی ہو۔ بہر حال اب ایک اور دروغ کے بغیر چارہ نہ تھا۔ کہا:

"اچھا، وُہ دوست؟ وُہ جھوٹا نکلا۔ وعدہ کر کے نہ آیا۔"

"نہ آیا یا نہ آئی؟"

تو یہ بات تھی! ہم تو ایک ایسے دوست کے متعلق جھوٹ بول کر پریشان ہو رہے تھے جس کا وجود ہی نہ تھا اور مسز ش کو اس کی تذکیر و تانیث کی پڑی تھی بہر حال ہمیں پہلی مرتبہ سچ بولنے میں فائدہ نظر آیا تو بے تحاشا قسم کھالی:

"خدا گواہ ہے عورت نہ تھی۔" اور دِل میں کہا: "کہ اناس بھی نہ تھی۔"

عورت کے شکوک کا آخری علاج قسم ہے اور مسز ش کیلئے بھی کارگر ثابت ہوئی کہ موصوفہ نے بلا تاخیر ہماری معصومیت کا پروانہ جاری کر دیا اور فرمایا:

"مُجھے ایک فوجی سے یہی توقع تھی۔"

پتہ چلا کہ فوج میں نوکری کرنے کا کُچھ تو فائدہ ہے۔ ہم نے کمر سے جھک کر بیک زبان شکریہ اور شب بخیر کہا اور اپنے کمرے کو چل پڑے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے

پیچھے دیکھا تو مسز ش بدستور دروازے پر آخری آشیر باد دینے کو کھڑی تھیں۔ آشیر باد لی اور مسز ش کو دُعا دے کر سو گئے۔

اگلی صُبح ایک نرم اور گرم بستر کی نشیلی نیند سے بیدار ہوئے تو چھوٹی چھوٹی متفرق عیاشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی عیاشی تو دیر خیزی تھی، شاید یہ عیاشی ہم سے پہلے کسی سُست مزاج بادشاہ کو بھی نصیب ہوئی ہو لیکن یقیناً کسالت مآب ہماری طرح محظوظ نہ ہوئے ہوں گے کہ تخت نشینی سے پہلے نہ ہماری طرح فوج میں نوکری کی ہو گی اور نہ پورے بیس برس مُرغے کی پہلی اذان کے ساتھ جاگ کر پریڈ کی ہو گی اور حقیقی عیاشی وُہی ہے جو پریڈ کے بعد نصیب ہو۔ دُوسری عیاشی بستر میں نیم دراز ہو کر ناشتہ خوری تھی اور وُہ بھی میڈم پیکارڈ کے ہاتھوں۔ اگر آپ اس کی فلمی مثال چاہیں تو راک ہڈسن اور جینالولو برجیدا کا تصور کر لیں، لیکن ظاہر ہے کہ ہماری جوڑی ذرا اسپیریر تھی۔ اور آخری عیاشی اس معطر و مقطر پانی سے غسل تھا۔ غسل خانے سے نکلے تو ہماری تازگی چمپے کی اس کلی کی مانند تھی جو ابھی ابھی شبنم سے مُنہ دھو کر فارغ ہوئی ہو۔

اس لاشریک کے علاوہ ہمارا کوئی مربی نہیں

آخر تیار ہو کر باہر نکلے تو دروازے پر مسز ش، مع مس ش، سیر پر تلی کھڑی تھیں۔ مس ش نے حسبِ معمول ہمیں دیکھتے ہی کھلی عداوت کا مظاہرہ کیا یعنی ہماری طرف پُشت کر

کے، ماں کو حفاظتی اوٹ میں لے کر اس کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ لیکن مسز ش حسبِ توقع اپنی بیٹی کے اس پار سے ازراہِ تلطف ہم سے مخاطب ہوئیں:

"آج کہاں کی سیر کا ارادہ ہے؟"

اب ہمارا ارادہ خواہ کہیں کا تھا، شین ماں بیٹی کے ساتھ جانے کا نہ تھا کہ ہم خلقِ خُدا کے درمیان عموماً اور ماں بیٹی کے درمیان خصوصاً فساد کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے پھرتی سے ایک ایسی سیر کا بہانہ گھڑا جس میں مسز ش کے حجم کی خاتُون کی شمولیت ممکن ہی نہ ہو اور فی البدیہہ کہا:

"جی۔ آج کوہِ الپس پر چڑھنے کا ارادہ ہے۔"

مسز ش نے ایک لمبے وقفے کے لئے ہمیں دیکھا اور پھر وُہی سوال کیا جس کیلئے ہمیں تیار ہونا چاہئے تھا:

"ساتھ کوئی دوست بھی ہو گا؟"

اور اس کا جواب گزشتہ رات سے ہماری جیب میں تھا۔ ہم نے خضوع میں خشوع ملا کر کہا: "قسم ہے اس کی جس نے پہاڑ اور دریا پیدا کئے ہیں کہ بھرے جنیوا میں اس لاشریک کے سوا ہمارا کوئی دوست نہیں۔ اس مہم پر تن تنہا جائیں گے۔"

ہماری قسمت پھر نشانے پر بیٹھی اور مسز ش کے لبوں سے پھر وُہی دُعائیہ تبسّم پھوٹا۔ الغرض ہم دُوسری آشیر باد لے کر پانساں سے باہر نکلے اور پیشتر اس کے کہ ماں بیٹی لفٹ سے اُتریں، ہم جنیوا شہر کی سیر کرانے والی تفریحی بس میں بیٹھ گئے اور یہی ہمارا اصلی پروگرام تھا۔

مزاج شریف، مس سارہ ٹیلر پی ایچ ڈی

یہ تفریحی بسیں ہم جیسے کم فرصت اور سبک کیسہ سیلانیوں کے لئے نعمت ہوتی ہیں۔ چند ٹکوں میں گوناگوں مقامات کی سیر، رنگارنگ ساتھیوں کی ہم نشینی اور ایک آتش بیاں گائیڈ کی زبانی رواں دواں تبصرہ۔ ہم نشینوں اور مقامات کے رنگ ورُخ سے تو ہم خاصے متاثر ہوئے لیکن رہنما کی آتش بیانی نے ہمیں کُچھ چکرا سا دیا۔ کیونکہ فاضل مبصّر اپنی فرانسیسی زبان سے انگریزی بولتے ہوئے ہر "ر" کو "غ" بنادیتا تھا۔ لہٰذا اسے سمجھنے کے لئے تمام متاثرہ الفاظ میں ہر "غ" کی جگہ "ر" رکھنا پڑتی تھی اور جتنی دیر میں ہم ایک "غ" کی جگہ "ر" فِٹ کرتے وُہ دس "غ" آگے نکل جاتا۔ اس دوڑ میں ہم ہی واحد پسماندہ نہ تھے، ساتھ کی نشست پر بیٹھی ہوئی ایک عینک پوش انگریز لڑکی بھی دو چار "غ" پچھڑی ہوئی تھی اور مبصّر سے شاید ہم اتنے برہم نہ تھے جتنی وُہ غریب کہ اپنی مادری زبان کے قتل کی چشم دید گواہ تھی اور جب ہم نے ایک دُوسرے کی برہمی کی

تائید کی تو ہمارے درمیان مشترکہ مظلومیت کی بنا پر رشتۂ مودت استوار ہونے لگا۔ مزید تعارف پر معلُوم ہوا کہ محترمہ لندن یونیورسٹی میں اقتصادیات کی بڑی فاضل قسم کی طالبہ ہیں یعنی پی ایچ ڈی کے کنارے کھڑی ہیں۔۔۔ خیر وُہ تو ظاہر ہی تھا، عینک جو لگی ہوئی تھی۔۔۔ جواب میں جب ہم نے بتایا کہ ہم بھی پنجاب یونیورسٹی کے فاضل اقتصادیات ہیں اور یہ کہ اب رہے سہے علم کی پیاس بجھانے انگلستان جارہے ہیں تو ہماری عِلم دوست ہم نشین نے وفودِ شوق سے ہم سے ہاتھ ملانے کے لئے دستِ ناز آگے بڑھایا لیکن دستِ ناز بڑھتا بڑھتا ہمارے جوابی ہاتھ کو مس کرتا، ہماری گردن سے جا ٹکرایا۔ یہ نہیں کہ ہمیں اس ساعدِ سیمیں کو اپنی گردن میں حمائل کرنے میں کوئی تامّل تھا۔ فقط یہ کہ یہ منشائے یار نہ تھا۔ یار کا نشانہ محض ضعفِ بصارت کی وجہ سے چُوکا تھا اور ہم کسی کی معذوری کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بصد ادب، محترمہ کی کلائی کو اپنی گردن کے قریب جا تھاما اور پھر مصافحہ کا معروف عمل بجالائے۔ اس اثنا میں محترمہ نے بھی دور کی عینک اتار کر نزدیک کی زیبِ چشم کر لی اور ہمارے مختلف اعضاء کو اپنی اصلی جگہوں پر اور باہم مربوط دیکھ کر خفیف سا تبسّم کیا۔ جواب میں ہم نے ازراہِ ممنونیت سر خم کیا اور اپنا نام عرض کیا۔ پتہ چلا کہ آپ سارہ ٹیلر ہیں۔ لیکن ہمارے لئے سارہ ہیں۔ یعنی وُہ منزل جو مہینوں میں طے ہوا کرتی ہے ہمیں لطفِ خاص سے ایک لمحے میں طے کرادی گئی۔ اس رعایت پر ہم نے تھوڑا سا ناز کیا اور پھر

اس ناز کا خمیازہ بھگتنا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم بتدریج مس سارہ ٹیلر، پی ایچ ڈی کی ٹھوس علمی صحبت کی دلدل میں پھنس رہے ہیں اور تابزانو پھنس چکے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اس وقت اتنے علم کے پیاسے نہ تھے جتنے کوکا کولا کے۔ چنانچہ مس ٹیلر کی بخشی ہوئی بے تکلّفی کو استعمال میں لاتے ہوئے اسے پہلے نام اور پیار سے مخاطب کیا اور کہا:

"سارہ، قطع کلام معاف، مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ آؤ کُچھ پئیں۔"

"کُچھ پینا" انگریز کی کمزوری ہے، انگریز کا عیش کا تصوّر فقط اس قدر ہے کہ اس کے ہاتھ میں گلاس ہو جس میں وسکی ہو تو بہتر ورنہ کوئی مائع ہو کوئی بہنے والی شے ہو۔ سارہ بولی:

"ونڈرفل آئیڈیا، مگر یہاں کُچھ پینے کو ہے بھی؟"

میں نے دِل میں کہا: "جانِ من، تو ہاں کر سہی اور ذرا لیکچر بند کر۔ پھر دیکھ ہم کیسے تمہاری خاطر آسمان سے بگ بگ کوک توڑ کر لاتے ہیں۔" لیکن ہمیں ایسی افلا کی مہم پر جانے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ عین اسی وقت ہماری بس لیگ آف نیشنز مرحومہ کے عالی شان مزار کے پاس پہنچ کر تھمنے لگی اور تھم چکی تو ہمارے مبصّر نے بس سے اُتر کر جملہ مسافروں کو زیارت کی دعوت دی۔ بس سے اُترے تو سب سے پہلے کیفے ٹیریا نظر آیا۔ دُوسرے مسافر تو لیگ کی داستانِ عروج و زوال سُنتے ہوئے مبصّر کے پیچھے چل

پڑے اور ہم سارہ کو ہاتھ سے تھامے بار پر گئے جہاں اس کے دُوسرے ہاتھ میں گلاس اور مُنہ میں تنکا دے کر مزید لیکچر بازی کا سدِّباب کر دیا۔ بلکہ موقع پا کر اسے ایک متبادِل شکار یعنی بار میڈ سے باتوں میں لگا کر چُپکے سے باہر نکل آئے تا کہ ہم بھی لیگ آف نیشنز کے تاریخی ہالوں میں ذرا جھانک لیں اور سند رہے کہ بین الاقوامی کفن چوروں کا وُہ عظیم الشّان اڈّا بچشم خود دیکھ آئے ہیں جہاں تقسیمِ قبور کا بیوپار ہوا کرتا تھا۔۔۔ موجودہ زمانے میں یہ منڈی نیویارک میں لگتی ہے۔۔۔ ہمارا خیال تھا کہ لیگ کے مزار پر نے چراغے نے گلے کی کیفیت ہو گی لیکن دیکھا تو اس کے ہزار قمقمہ فانوس جگمگا رہے تھے اور اس کے ہزار گُل چمن لہلہا رہے تھے۔ بخدا یہ مزار نہ تھا۔ بازار تھا اور اس بازار کے بیوپاری اپنے اسلاف سے کہیں زیادہ چابک دوست تھے۔ یعنی بیوپار تقسیم قبور ہی کا تھا مگر لین دین کی کتابوں کو صحت و محنت، تخفیفِ اسلحہ اور بہبودِ عامّہ کے عنوان دے رکھے تھے۔ آخر اس مزار بازار آثار کی زیارت سے فارغ ہوئے اور دُوسرے مسافروں کے ساتھ بس میں بیٹھے۔ چلنے سے پہلے ڈرائیور نے مُڑ کر دیکھا تو ایک نشست خالی پائی۔ جی ہاں یہ نشست ہماری ہمسائی مس ٹیلر ہی کی تھی اور ہمیں معلُوم تھا کہ موصوفہ کہاں ہیں کیوں ہیں؟ اور یہاں کیوں نہیں، لیکن چُپ رہے۔ ڈرائیور نے ایک دو دفعہ خاصے صبر کے ساتھ اور پھر چار پانچ دفعہ نہایت بے صبری سے ہارن دیا۔ لیکن دونوں صورتوں میں نتیجہ ٹیلر کے بجائے صفر ہی نکلا۔ آخر ہم نے ترس کھا کر ڈرائیور کو مس ٹیلر کا محلِ وقوع بتایا۔ بلکہ اُتر کر اس کے ساتھ کیفے ٹیریا تک

گئے۔ آگے مس ٹیلر ایک خود ساختہ بلیک بورڈ کے ذریعے کیفے کے جملہ سٹاف کو ان کے اپنے ملک کی مصنوعات کے اعداد و شمار سمجھا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو محترمہ کو یاد آیا کہ کبھی ہم میں ان میں بھی پیار تھا۔ آرام سے شاگردوں سے معافی مانگتے اور باقی پھر کہتے ہوئے کسی ندامت کی معذرت کے بغیر ہمارے ساتھ چل پڑیں۔ ڈرائیور نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا اور کُچھ زیرِ لب بھنبھنایا بھی مگر مس ٹیلر پر یہ کلامِ نرم و نازک بے اثر نکلا۔ البتہ کسی قدر گرمجوشی سے اس خاکسار کا شکریہ ادا کرنے لگیں کہ کس شاندار کیفے سے تعارف کرایا۔ خدا جانے وُہ بددُعائیں جو کیفے کے سٹاف کے مُنہ سے نکلی ہوں گی ہمارے کھاتے میں لکھی گئیں یا مس ٹیلر کے حساب میں۔

بس چلی اور ساتھ ہی مس ٹیلر کی زبان بھی چلنے کو تھی کہ ہم نے ایک معروف دفاعی چال چل دی یعنی مس ٹیلر کو ایک طویل فوجی لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ حریف کو اپنی پسند کے میدان میں لڑنے پر مجبور کیا جائے۔ چال کامیاب رہی کہ جواب میں مس ٹیلر سوائے "اچھا؟" اور "پھر؟" کے کوئی جارحانہ آواز نہ نکال سکی۔ اگر خدانخواستہ Initiative (اقدام) مس ٹیلر کے ہاتھ آ جاتا تو ظاہر ہے کہ ہمیں موصوفہ کے ریپٹ فائر کے مقابلے کا حوصلہ نہ تھا۔ ادھر ہمارا گولہ بارود یعنی فوجی لطیفہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ریڈ کراس کی خوبصورت عمارت آ گئی۔

جنیوا ریڈ کراس کی جائے پیدائش ہے۔ ہمیں اس کے دیکھنے کا شوق تھا اور مبصّر کو دکھانے کی بے تابی۔ چنانچہ ایک بار پھر اُترے۔ عمارت کے اندر گئے اور وُہ پنگھوڑے

دیکھے جن میں ریڈ کراس نے پچھلی صدی میں آنکھیں کھولی تھیں۔ پر اُن کارناموں کی روئداد سنی جو اس نے جوان ہو کر انجام دیئے تھے۔ ابتدا میں بے شک موصوفہ کے ہاتھوں جملہ ریوڑیاں اپنوں ہی میں تقسیم ہوتی رہیں تاہم جنہوں نے بھی کھائیں بے چارے ریوڑیوں کے محتاج اور مستحق ضرور تھے اور محض اس لئے کہ چند ریوڑیاں غلط تقسیم ہو گئی تھیں اسے شاباش سے محروم رکھنا گوارانہ ہوا۔ چنانچہ ہم نے ریڈ کراس کو شاباش دی، اس کے گال سہلائے، سر پر ہاتھ پھیرا اور درازیٔ عمر کی دُعا دی۔

سوئستانی لڑکیاں اشتعال آور ہیں

ریڈ کراس سے فارغ ہونے کے بعد بس نے اپنا سفر شروع کیا اور ہم نے اپنا باقی ماندہ لطیفہ چھیڑا اور اگلے سٹاپ تک مس ٹیلر کو سر اُٹھانے کی مہلت نہ دی۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد بس رُکی کہ سامنے جنیوا یونیورسٹی کی عمارت تھی۔ یہ گویا مس ٹیلر کی جاگیر تھی۔ یہاں پہنچ کر نہ صرف ہمارا لطیفہ ختم ہو گیا بلکہ ہماری بالادستی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور مس ٹیلر کی عملداری شروع ہو گئی۔ اب ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ شاگردانہ نیازمندی کے ساتھ مس ٹیلر کے جلو میں چلتے جائیں اور سُنتے جائیں اور جب سُننا شروع کیا تو ہمیں بصد حیرت پہلی دفعہ معلُوم ہوا کہ مس ٹیلر دِلچسپ باتیں بھی کر سکتی ہے۔ جاتے جاتے ہم نے کہا: ''آپ تو یونیورسٹی سے واقف معلُوم ہوتی ہیں، ذرا اس کا دِلچسپ ترین شعبہ تو دکھایئے۔'' لیکن پیشتر اس کے کہ مس ٹیلر کوئی جواب دے

پا تیں سامنے سے منی سکرٹ میں ملبوس دو سوئستانی دوشیزائیں آتی دکھائی دیں اور یہ تقاضائے بشریت ہم مس ٹیلر کو خیالی گولی مار کر انہیں دیکھنے لگے۔ ہمارے پاس سے گزریں تو ہماری نگاہیں ان کے گھومتے کولہوں کے ساتھ گھوم گئیں لیکن اس نظر پیچھے اور قدم آگے کی حالت میں مس ٹیلر سے ہماری ٹکّر ہوگئی اور ہم گرتے گرتے سنبھلے۔ اس پر مس ٹیلر بولی:

"اللہ نگہبان! اب دوسرا شعبہ کون سا دکھاؤں؟"

اور یہ کہہ کر مسکرادی۔ گویا مس ٹیلر ہم سے سچ مچ دِل لگی کر رہی تھی جس کی بظاہر وُہ نااہل نظر آتی تھی۔ ہمیں یہ فضا موافق محسوس ہوئی تو ہم نے اسی مضمون میں تھوڑی سی شرارت ملا کر اسے طول دیا اور کہا:

"سارہ۔۔۔ مُجھے معلُوم نہ تھا کہ یہ شریف شرمیلی سوئستانی لڑکیاں اس قدر اشتعال اَور۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ بے باک ہو سکتی ہیں؟"

بولی: "صحیح لفظ تو اشتعال آور ہی ہے۔ آپ ناحق شیر گرم مطلب نکال رہے ہیں۔"

معلُوم ہوا مس ٹیلر اپنی عینکوں اور آدم سمتھ کے باوجود دِل رکھتی ہے۔ کہا:

"چلو اشتعال آور ہی سہی لیکن تعجّب کی بات ہے نا؟"

بولی: ”ابھی آپ نے سوئٹرزلینڈ میں دیکھا ہی کیا ہے؟ ذرا ان شریف اور شرمیلی دوشیزاؤں کو کسی میلے ٹھیلے میں دیکھیں، خصوصاً ان کے پنجسالہ میلے میں جو پچھلے سال ہو چکا ہے۔ اس میں جوان جوڑے تو خیر رقص میں رنگ اور رس ملاتے ہی ہیں، سوئس بوڑھیاں بھی ناچ ناچ کر ڈھیر ہو جاتی ہیں اور آخر رہڑے پر لاد کر گھر پہنچائی جاتی ہیں۔“

ہم نے کہا: ”تو ایسا دلچسپ میلہ پانچ سال کے بعد کیوں لگتا ہے؟ ہر سال کیوں نہیں لگتا۔“

بولی: ”صحیح وجہ تو معلُوم نہیں لیکن غالباً اس لئے کہ بوڑھیاں پچھلے رقص سے بحال ہونے کے لئے پانچ سال لیتی ہیں۔“

ہم مس ٹیلر جیسی ویران شکل لڑکی کی حسِ ظرافت پر۔۔۔ جس کا اسے خود احساس نہ تھا۔۔۔ کُچھ حیران، کُچھ فرحاں جھومتے جھومتے چلے جا رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں: سامنے سے مسز ش آ رہی ہیں۔ ہمارا جھومنا ایک زاویئے پر ہی منجمد ہو کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ ہمارے پاؤں تلے کی زمین یکلخت سات ہزار فٹ بلند ہو جائے کہ ہم پہاڑ کی چوٹی سے مسز ش کو علیک سلیک کریں۔ لیکن زمین، یہ ارض، پر ہمارے پاؤں کے تلے سے ہی نکلنے لگی۔ بمشکل اپنے آپ کو تھام کر مسز ش کے حملے کا انتظار کرنے لگے۔ ایک فاصلے سے ہی آواز آئی:

"السلام علیکم۔ پہاڑ کی سیر ہو رہی ہے؟"

سچ تو یہ ہے کہ مسز ش کا بغیر تمہید کے یُوں گلہ شروع کر دینا ہمیں بہت بھایا لیکن اس ڈر سے کہ یہ گلہ کہیں تماشا نہ بن جائے ہم نے مضمون بدلنے کی کوشش شروع کی اور کہا:

"وعلیکم السلام۔ آئیں ان سے ملیں۔ یہ ہیں مس ٹیلر اور مس ٹیلر یہ ہیں مسز ش۔"

مس ٹیلر نے مشین کی طرح کہا: "HOW DO YOU DO?"[۴۰]

مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن اس اثنا میں مسز ش اپنے دِل میں غالباً ایک موثر گالی کو آخری شکل دے رہی تھی۔ جب دے چکی تو پنجابی میں بولی:

"فٹے مُنہ عینکو دا"

اور انگریزی میں اضافہ کیا: I Don't know english[41]

مس ٹیلر کا ہاتھ چند ثانیے ہوا میں معلق رہنے کے بعد بتدریج اور بے نیلِ مرام سرنگوں ہو گیا۔ پھر مسز ش کا روئے سخن ہماری طرف تھا:

"یہ برف پہاڑ کی چوٹی سے اکٹھی کر لائے ہیں؟"

---

[۴۰] مزاج کیسے ہیں۔

[41] میں انگریزی نہیں جانتی۔

”بس میں ملی تھی۔“

”تو آپ نے کوہ الپس کی چوٹی بس میں بیٹھ کر ہی سر کی؟“

یہاں ایک جھوٹ کا مقام تھا اور ہم نے فوراً گھڑا:

”بات یہ ہے مسز ش کہ میں ہوٹل سے نکلا تو بارش ہو رہی تھی سو، پہاڑ پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور تفریحی بس میں شہر کی سیر کو نکل پڑا۔“

”دریافت طلب بات صرف اتنی ہی ہے کہ ہمارے فوجی دلیر کا ارادہ بارش نے بدلا یا اس عینکو نے؟“

”بارش نے، مسز ش، بارش نے۔“۔ ہم نے تاکیداً کہا۔ ”عینکو غریب کی ساخت ایسی نہیں کہ کسی کا ارادہ بدل سکے۔“

مسز ش یہ سُن کر کھل اٹھی اور بولی:

”سچ؟ یہ دِل کی بات کہہ رہے ہو؟“

اور ہم نے کسی جھجک کے بغیر اپنا پرانا فارمولا دہرایا:

”قسم ہے اس کی جس نے پہاڑ اور دریا پیدا کئے ہیں کہ۔۔۔“

اگر کراماً کاتبین نے بے چارے مردوں کے ان چھوٹے چھوٹے جھوٹوں کو جو خواتین کے سامنے ذاتی دفاع کی خاطر بولنے پڑ جاتے ہیں، نظر انداز نہ کیا یا بعد میں اور محشر نے بطور سپیشل کیس رعایت نہ دی تو اگلی دُنیا میں بہت کم مرد منطقہ معتدلہ کی جانب نظر آئیں گے۔۔۔ خیر یہ تو اگلی دُنیا کی بات ہے اور اگلی دُنیا میں دیکھی جائے گی۔ اس دُنیا میں ہمارے جھوٹ کا نہایت خوشگوار اثر ہوا اور مسز ش کے لبوں پر وُہی دیرینہ مسکراہٹ پھیل گئی لیکن عین اسی وقت چھوٹی مس ش، چیں بچیں دکین آ گیں کہیں سے بیچ میں آ ٹپکی۔ پہلے اس نے حاضرین کو ایک غضب آلود نگاہ سے دیکھا اور پھر اپنی خندہ بلب ماں کو بازو سے پکڑ اپنی تفریحی بس کی طرف کھینچ لے گئی کیونکہ ایک عرصے سے ایک بے چین بیٹی کی ماں اور ایک بے صبر ڈرائیور کی مسافرہ لا پتہ تھی جو تلاشِ بسیار کے بعد ہم سے باتیں کرتی پائی گئی۔ یعنی کُچھ اسی طرح جیسے تھوڑی دیر پہلے ہمارے ڈرائیور نے مس ٹیلر کو کیفے ٹیریا میں لیکچر پلاتے پایا تھا۔

مرنے میں تیزی کی کیا ضرورت ہے؟

جب مسز ش کی بس چل پڑی اور آنکھوں سے سالم او جھل ہو گئی تو ہم نے اطمینان سے مس ٹیلر کی طرف رجوع کیا اور چاہا کہ مسز ش کی زیادتی کی معافی مانگیں لیکن مس ٹیلر کو کسی زیادتی کا عمل یا احساس نہ تھا۔ اس پر پھر علم اقتصاد طاری تھا۔ ادھر ہماری بس ایک

کشادہ چوک سے نکل کر تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنے لگی جہاں قدم قدم پر تاریخ ہمارا دامن تھام رہی تھی۔ ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گائیڈ بولا:

”نپولین اس گھر میں ایک رات مہمان رہا تھا۔ غوسو اس چوبارے میں پیدا ہوا تھا۔“

مس ٹیلر نے پھُرتی سے اصلاح دی: ”غوسو سے اس کی مراد روسو ہے۔“

گائیڈ نے اپنا کام جاری رکھا: ”آئن سٹائن اس کوچے میں ٹہلا تھا۔ ملٹن نے اس کھڑکی سے جھانکا تھا۔“

مشاہیر اس تیزی سے ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے کہ ایک دُوسرے میں تمیز مشکل تھی۔ پھر قدم قدم پر مجسمے اور چپے چپے پر کتبے جنہیں ہم نے دیکھا اور پڑھا اور پھر خدا جانے کیوں لیکن دفعتاً غیب سے خیال آیا کہ ہم بے شک آج کُچھ نہیں لیکن کیا معلُوم کل کلاں ہم سے بھی کوئی کارِ نمایاں سرزد ہو جائے اور اچانک شہرت کے آسمان پر چمکنے لگیں تو کیوں نہ اہلِ جنیوا کو نوٹ کراتے جائیں کہ ہم کِن گلیوں سے گزر رہے ہیں۔ بلکہ ملٹن والے مکان کے سامنے خالی جگہ دیکھ کر پانچ منٹ کے لئے خاص طور پر ستا لئے کہ بعد میں میونسپلٹی کو مقامِ یادگار کے تعین میں دقت نہ ہو۔ لیکن آہ! یہ دِل کی بات اہلِ جنیوا تک کس طرح پہنچاتے؟ مس ٹیلر یا موسیو گائیڈ کی معرفت؟ مگر کیوں کر؟ زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے؟۔۔۔ لیکن اے اہلِ وطن، آپ تو اُردُو سمجھتے

ہیں اور ہمارے دِل کی آواز بھی سلیس اُردُو میں نکل رہی ہے۔ آپ ہی براہِ انصاف و کرم موزوں وقت پر انہیں ہماری راہوں کی نشاندھی کر دیجئے۔ ویسے جنیوا جانے میں زحمت محسوس ہو تو مت جائیں۔ وطنِ عزیز میں بھی ہم نے کافی آثار چھوڑے ہیں۔ ایک عمر جی ایچ کیو اور چکلالہ کے درمیان گزار دی ہے اور جو باقی ہے وُہ اپنے گاؤں جا کر بروالا کھیت میں گزارنے کی تمنّا ہے۔ سو ہماری گزر گاہوں کی یہاں بھی کمی نہ ہو گی۔۔۔ لیکن قارئین الطاف قریں، جانے دیں فی الحال ان آنجہانی باتوں کو۔ اگر شہرت کو بعد از مرگ ہی آنا ہے تو ہمیں اس کے لئے کوئی خاص جلدی نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم آپ زندہ ہیں اور زندگی کے تقاضے یادگاری تختوں سے کہیں زیادہ ولولہ انگیز ہیں۔ لہٰذا سر دست تو آیئے خود زندگی ہی کو یادگار بنا دیں اور اس کا ایک طریقہ تو وہی ہے جو غالب کا فرمودہ اور آزمودہ ہے:

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم

قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم [42]

[42] آؤ کہ ہم تم مل کر آسمان کا دستور بدل ڈالیں اور شراب کے پیالے کو گردش میں لا کر تقدیر کا مُنہ پھیر دیں (غالب)

گُڈ بائی خرد بین کی کیا لگتی ہے؟

آخر ہمارا تفریحی سفر ختم ہونے کو آیا اور بس جھیل جنیوا کا پُل عبور کر کے ہماری پانساں کے سامنے بس سٹیشن پر رُکی۔ مس ٹیلر رخصت ہونے لگی تو ہمارا خیال تھا کوئی میٹھا سا الوداعی کلمہ کہے گی جو ہمارے دِل میں ایک یادگار بن کر اُتر جائے گا لیکن مس سارہ ٹیلر پی ایچ ڈی اکنامکس بولی تو یہ بولی:

"بائی دی وے، تمہیں معلُوم ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی دولت کا کیا راز ہے؟"

ہم کیوں تو چپ رہے لیکن زیرِ لب لاحول پڑھی اور زیرِ لب ہی شکایت بھی کی: "او عینکو، یہ جدائی کی گھڑی ہے۔ یہ وقت سوئٹزرلینڈ کے راز بیان کرنے کا نہیں بلکہ دِل کے راز کھولنے کا ہے۔"۔ مگر عینکو نے ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر الوداعی گفتگو جاری رکھی:

"سوئٹزرلینڈ میں کوئلے اور دھاتوں کی کمی ہے۔ لٰہذا سوئٹسانیوں نے شروع ہی سے ایسی صنعتوں کو توجّہ دی ہے جن میں دھاتیں کم اور کاریگری زیادہ استعمال ہوتی ہو مثلاً گھڑیاں، کلاک، خرد بین اور۔۔ گُڈ بائی۔"

جو گُڈ بائی خرد بین کے ساتھ واقع ہو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں مزید شوقِ ملاقات کی کتنی مقدار ہو گی۔ چنانچہ ظالم نے یہ روایتی جملہ بھی نہ دہرایا کہ

"SEE YOU IN ENGLAND"[43] اور ہاتھ ہلاتی چل دی۔۔۔ عورت کو دماغ دینا مگر دِل چھین لینا فطرت کا تمسخر ہے۔ مس ٹیلر اس تمسخر کا شکار تھی۔ اب ہمیں مسز ش یاد آئی اور آپ کو بھی یاد آنا چاہیئے۔ مسز ش میں کُچھ اور خوبی تھی یا نہیں ایک ضرور تھی، انٹیلکچوئل[44] نہ تھی۔ انٹیلکچوئل عورت بڑی فرحت کش جنس ہوتی ہے۔ ایسی عورت سے بڑھ کر دُنیا میں ایک ہی بڑی کوفت ہے: نان انٹیلکچوئل[45] مرد! وُہ دردِ سر ہے یہ دردِ جگر ہے۔ لیکن خُدا کا شکر ہے کہ اس نے اکثر عورتیں جذباتی اور اکثر مرد غیر جذباتی پیدا کئے ہیں۔ اگر مس ٹیلر کی طرح عورتیں جذبات سے عاری ہوں تو اس چند روزہ زندگی سے رنگینی رخصت ہو جائے اور مرد جذبات میں ڈوبے رہیں تو دُنیا کا مسافر خانہ پاگل خانہ بن جائے۔ بہر حال مس ٹیلر چل دی تو ہمیں فراغت اور خود مختاری کا احساس ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو ایک پیارے سے ریستوران میں لنچ کھایا۔ پھر

---

[43] اب انگلستان میں ملاقات ہو گی۔

[44] INTELLECTUAL

[45] NON INTELLECTUAL

حسبِ خواہش مگر بے مقصد بازار گردی کی اور کُچھ بے مقصد خریداری بھی کہ باوجودیکہ حکیمِ مشرق کی سفالِ ہندوالی تاکید یاد تھی، تاہم شیشہ گرانِ فرنگ کا مال دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا۔ بازار میں چلتے ہوئے جنیوا کی ٹریفک کو بڑی فیاضی سے نمبر دیئے کہ ہر چند کہ تیز مزاج تھی، حفظِ مراتب کا خیال رکھتی تھی اور معزز راہروں کو۔۔۔ جن میں ہم بھی شامل تھے۔۔۔ راہ دینے کے لئے مؤدبانہ رک جاتی تھی۔ اس قسم کے ادب سے ہم پنڈی اور لاہور کے پیادہ رو محروم ہیں۔ شام ہو گئی تھی۔ کُچھ تھک بھی گئے تھے۔ پانساں کو لوٹ چلنے کی سوجھی۔

پانساں پہنچے تو وہاں مادام پیکارڈ کے علاوہ ہو کا عالم تھا کہ جملہ مسافر ابھی سیر سے نہ لوٹے تھے۔ مادام نے حسبِ عادت ہمیں تبسّم میں کھلی ہوئی خوش آمدید کی اور ایک بے داغ سینی میں بے وقت کافی کا سیٹ آراستہ کر کے کمرے میں لے آئی اور دستِ خاص سے ایک اور پھر دوسرا پیالہ دیا۔ جب ہم نے دیکھا کہ ساقی کو شوق ہے کرم بے حجاب کا تو ہمیں اچانک خیال آیا کہ اگر اسی لمحے مسنزش آ جائے تو ساقی اور اس کے کافی نوش کا کیا بنے گا؟ کیونکہ اب ہم میں مزید جرح کی تاب نہ تھی۔ جتنی جھوٹی قسمیں یاد تھیں، اپنی صفائی میں پہلے ہی صرف ہو چکی تھیں۔ ہم نے مادام پیکارڈ کو اعتماد میں لے کر اس مسئلے کا حل اور کُچھ فنّی امداد طلب کی تو مادام بولی:

"اس مسئلے کا ایک گھٹیا حل تو یہ ہے کہ میں تمہیں کمرے میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیتی ہوں۔ اور عظیم الشّان حل یہ ہے کہ مسز ش کے آنے سے پہلے ہی باہر نکل چلتے ہیں۔ آج میری شام بھی آف OFF ہے۔"

مادام کی فیاضانہ دستگیری کو ٹھکرانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن موصوفہ کا مسز ش کے خلاف اس گرمجوشی سے شریک سازش ہو جانا بھی ہمارے فہم سے ذرا بالا تھا۔ لیکن عورتوں کے کاموں میں شامل ہونے سے پہلے اگر ان کا سمجھنا بھی لازم ہوتا تو کوئی کام شروع ہی نہ ہو پاتا۔ چنانچہ ہم کسی تشرع کا مطالبہ کے بغیر مادام کے ساتھ ہو لئے اور اس شب موصوفہ کی ماہرانہ رہنمائی میں لطف و سرور کے نئے نئے عقدے وَا ہونے لگے۔ ریستورانوں اور رقص گاہوں کی رنگین روشنیوں سے گزر کر ان کے رازہائے دروں تک رسائی ہوئی تو سیر فرنگ کا نروان حاصل ہونے لگا۔

فرنگ میں نروان بڑ کے نیچے بیٹھنے سے نہیں، کسی بہشت شمائل کے سایۂ گیسو میں رقص کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور قصّہ مختصر کہ ہر سو رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم۔۔۔ یورپ میں دماغ اسی شخص کا ہے جس کا بازو تھامے کوئی غارتگر صبر و شکیب رواں ہو اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس شب ہمارے بازو کا استعمال بھی کُچھ اسی نوع کا تھا۔۔۔ آخر بعد از نیم شب پانساں کو لوٹے تو مسز ش کے کمرے کی شمع گُل ہو چکی تھی۔

سو ایسی ہنگامہ خیز رات کے بعد اپنے کمرے تک بے محاسبہ پہنچ جانا اور اپنے بستر سے بے محابا ہم آغوش ہو جاناوُہ عیش تھاجو تجمّل حسین خان کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔

جاں نثاری سے پہلے پرواز کا وقت آگیا

اس نشاطِ شبینہ کی سرمستی دوپہر تک رہی اور نشہ اُترا تو یاد آیا کہ آج تو لندن جانا ہے۔ تیزی سے رختِ سفر باندھا۔ میڈم پیکارڈ سے رخصت لی اور شین ماں بیٹی سے آنکھ بچا کر پانساں سے باہر نکلے۔ ائیر پورٹ پر پہنچے تو پی آئی اے کی سروقد اور مودراز سوئستائی گراونڈ ہوسٹس بصد معذرت عرض پرواز ہوئی:

"کراچی سے آنے والا بوئنگ ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ لہٰذا ازراہِ کرم یہ چٹ قبول فرمایئے اور ائیر پورٹ کے ریستوران میں دکھا کر تناول فرمایئے۔"

ہمیں مفت کے لنچ کی ایسی خوشی نہ تھی کہ جہاز کی تاخیر کا شکوُہ کہیں زیادہ تھا لیکن اس ساحرہ کے اظہارِ معذرت سے دل گداز ہو گیا اور جا کر کھا لیا۔

لوٹ کر آئے تو سامنے اوقاتِ آمدورفت کے برقی بورڈ پر پی آئی اے کا بوئنگ مزید ایک گھنٹہ لیٹ دکھائی دیا۔ دل میں ایک احتجاج اُبھرا لیکن پھر وہی دِلآرام ایک چٹ اور مسکراہٹ لے کر نمودار ہوئی اور بولی:

"میں گڑگڑا کر معافی کی طلبگار ہوں۔ یہ چٹ قبول کریں اور بار پر جا کر اپنی پسند کا مشروب نوش فرمائیں۔"

کوئی اور ہوتا تو چٹ ہم اس کے مُنہ پر دے مارتے کہ ہمیں صرف لیٹ ہونے ہی کا شکوہ نہ تھا۔ پی آئی اے یعنی اپنی قومی ہوائی کمپنی کی سرِعام رسوائی کا رنج بھی تھا۔ لیکن یہ چِٹ باز حسینہ کوئی عام حسینہ نہ تھی، خود جانِ تواضع تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ظالم حسین ہی نہ تھی ایک عجیب ہوشرُبا چارم CHARM بھی رکھتی تھی۔ یہ چارم قدرت کا چیدہ تحفہ ہے۔ یہ حُسن کے بغیر بھی وارد ہو تو آفت ہوتا ہے لیکن جب حُسن کے ساتھ نازل ہو جیسا کہ اس ہوسٹس میں تھا تو اسد اللہ خان قیامت ہے! یہی وجہ ہے کہ اقدامِ قتل کی بجائے دُعائے زندگی دے کر ہم نے اس کافرہ سے تیسری چٹ بھی لے لی اور چوتھی چٹ کے لئے سمرقند و بخارا بخشنے پر تُلے بیٹھے تھے کہ جہاز آ گیا اور ہم برژنیف سے ٹکر لئے بغیر لندن کو پرواز کر گئے۔

لندن: تجدیدِ ملاقات

تاریخ ہوائی جہاز میں بھی اپنے آپ کو دہراتی ہے

جنیوا سے لندن تک کا سفر مختصر بھی تھا اور بے ہنگامہ بھی۔ یہ نہیں کہ مختصر وقت میں کوئی کارآمد واردات نہیں ہو سکتی۔ مثلاً مسز ش ہی اپنی نشست سے اُٹھ کر حسبِ سابق خیر سگالی کا چکر کاٹ سکتی تھیں اور چیدہ چیدہ مسافروں کو اپنی عارضی رفاقت کا سرور بخش سکتی تھیں، لیکن خلافِ توقع موصوفہ نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی اور۔۔۔ بقول ائیر ہوسٹس۔۔۔ یہ نہیں کہ وُہ خود آمادۂ جنبش نہ تھیں، بے حد تھیں، فقط یہ انکی جفاکار نیم بالغ بیٹی انہیں مانع خرام تھی۔ یعنی ظالم نے مادر مجبور کے حفاظتی بند کا سرا مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ ماں دُختر آزاد ہو کر جہاز نوردی نہ شروع کر دے۔ نتیجتاً بے چاری شکم بجولاں ماں سر پھیر کر پیچھے آزاد ہمسفروں پر حسرت کی نگاہ بھی نہ ڈال سکتی تھی۔

ہاں سامنے کی کھڑکی سے تیرتے بادِلوں اور اڑتے سارسوں کے قافلے دیکھ کر اپنی قید کی گھڑیاں ہلکی کر سکتی تھی۔ خیر یہ واقعہ تاریخ میں پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے قبل آگرے کے قلعے میں ایک باپ کے ساتھ بھی کُچھ ایسا ہی سلوک ہو چکا تھا۔

خوشدامن برطانیہ ناراض معلُوم ہوتی ہے

پھر اچانک لندن کے قرب کا اعلان ہُوا اور کھڑکی سے لندن کے برج و بام نظر آنے لگے:

چند دس سال قبل کے جانے پہچانے مگر بے شمار اَن دیکھے اَن جانے۔ تھوڑی دیر بعد ہیتھرو ائیرپورٹ پر اترے تو پرانے تعلقات کے باوجود اسے پہچان نہ سکے اور یہ اجنبیت ائیرپورٹ کے در و دالان اور راہ و رسم تک ہی محدود نہ تھی۔ اس کے مزاج میں بھی، جو کبھی دوستانہ ہوا کرتا تھا۔ ایک واضح بیگانگی بلکہ مخاصمت سی تھی۔ وُہ مہر و وفا کے پُتلے یعنی کسٹم اور امیگریشن کے کارندے، اب بچھو کے ڈنک کی طرح علامتِ استفہام بنے بیٹھے تھے۔ سارے آنے والوں کے لئے نہیں، صرف کالوں کے مقابلے میں اور کالوں میں سے بھی پاک و ہند سے آنے والے مسافروں کے خلاف۔ حیرت ہوئی۔ سوچا کیا وجہ ہے؟ بلکہ ایک پاس سے گُزرتی ہوئی میم سے دبی زبان سے پوچھا بھی کہ میڈیم:

اب وُہ الطاف نہیں ہم پر عنایات نہیں

بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

میڈیم بے رُخی سے دیکھتی ہوئی جواب دیئے بغیر گزر گئی۔ اگرچہ اس کی خاموشی باآوازِ بلند کہہ رہی تھی کہ خوشدامن برطانیہ پاک و ہند کے سمدھیانے ہی میں رہ کر مہربان ہوتی ہے کہ داماد سے زیادہ اسے داماد کے خزانوں سے محبّت ہے۔ لیکن خانہ دامادوں سے اسے پیار نہیں کہ اس سودے میں گوری بیٹی ہی ہاتھ سے نہیں جاتی۔۔۔ اور اس کے جانے کا ایسا رنج بھی نہیں۔۔۔ انگریزی زر بھی جاتا ہے جس کا رنج بے شک گراں ہے۔ پاک و ہند کے مسافر لاکھ کہیں کہ اے زرِ پرستانِ برطانیہ، ذرا تاریخ دیکھو۔ تمہارے پونڈوں کے نوٹوں میں ہمارے پسینے کی بُو ہے اور اے عشوہ گرانِ انگلشیہ تمہارے عارضوں کی سرخی میں ہمارے جگر کا لہو ہے لیکن انہیں تاریخ یاد دِلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وُہ کہتے ہیں: ”کون سی تاریخ؟ برطانیہ کی سرکاری ہسٹری میں تو ایسی کسی واردات کا ذکر نہیں۔ وہاں تو صرف انگریزی خون پسینے کی باتیں ہیں۔“

تلخ نوائی معاف دراصل ہماری خفگی اپنے لئے نہ تھی۔ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی خاطر تھی جنہیں دروازے پر گستاخانہ جرح کے لئے روک لیا گیا تھا ورنہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے آپ کو یاد ہو گا کہ ہم تو ہز میجسٹی کے اپنے مہمان تھے۔ چنانچہ ہم سے چار و ناچار

ایک درمیانہ درجے کے وی آئی پی کا سا سلوک کیا گیا۔ ادھر ہم جنگلے کے پاس پہنچے، ادھر سامنے سڑک کے کنارے باوردی شوفر نے کالے رنگ کی کار روکی۔ جس سے ایک معتبر سا انگریز نکلا اور سیدھا ہم تک پہنچا۔ پھر حسبِ معمول ایک پلاسٹک کی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے مخاطب ہوا:

"میرا خیال ہے آپ ہی مسٹر خان ہیں؟"

یہ ہمارا گائیڈ تھا۔ ہم نے اس کے خیال کی تائید کی اور اس کے اشارے پر ہمارے کاغذات پر مؤدبانہ مہریں ثبت ہونے لگیں۔ یہ ہو چکا تو ہمیں بملاحظہ کار تک لے جایا گیا۔ کار میں داخل ہوتے ہوئے پیچھے دیکھا تو مسز ش کا الوداعی بازو بلند ہو رہا تھا جسے بیٹی ش پھرتی سے پست کرنے میں مصروف تھی۔ بہرحال اس کمسن آمرہ کو اپنی ماں کے بازو پر اختیار سہی ہمارے بازو پر اختیار نہ تھا۔ چنانچہ جواب میں ہم نے اپنا بازو پورے پاکستانی جوش سے لہرایا لیکن مسز ش ابھی برطانوی نکیرین کے سامنے اپنے نامہ اعمال کی انگریزی ہی بنا رہی تھی کہ ہماری کار شہر کو چل دی۔

ہم انسان نہیں پیالے نہیں

کوئی آٹھ بجے شام کا وقت تھا سُورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ ننّھی ننّھی بوندیں پڑ رہی تھیں اور موسم خوشگوار تھا۔ چنانچہ طبیعت میں بندریج خفگی کی جگہ شگفتگی لینے لگی۔ ائیرپورٹ سے باہر نکلے تو گائیڈ نے ایک لفافہ پیش کیا اور استدعا کی کہ اسے ابھی کھول کر پڑھیں کہ اس میں کل اور اگلے چند روز کا پروگرام ہے۔ یہ بات ہمیں بابوانہ سی لگی کہ چلتی گاڑی ہی میں فائل کھول کر بیٹھ جائیں۔ لیکن ناچار لفافہ کھولا۔ اس میں دو کاغذ تھے۔ پہلا ایک مس پیرس کی طرف سے محبّت نامہ تھا کہ ڈئیر کرنل سے شروع ہوتا تھا اور لکھا تھا کہ فدویہ کو برطانوی ادارے کی طرف سے آپ کی پروگرام آرگنائزر ہونے کی عزّت اور خوشی نصیب ہوئی ہے اور اب آپ سے ملاقات کے لئے چشم براہ ہوں۔ لیکن ملاقات سے پہلے کیا آپ کل صُبح چار بجّے کی گاڑی سے ایڈنبرا جانا پسند نہ کریں گے؟ میرا خیال ہے ضرور پسند کریں گے کہ سکاٹ لینڈ کا حُسن آج کل جوبن پر ہے۔ چنانچہ یہ ریل کا ٹکٹ ارسالِ خدمت ہے۔ آپکے رات کے قیام کے لئے گریٹ ناردرن ہوٹل میں، جو کنگ کراس سٹیشن کے پہلو میں ہے، کمرہ ریزرو کر دیا گیا ہے۔ آپ کو ہوٹل سے گاڑی تک جانے میں صرف چند قدم چلنا ہوگا۔۔ اور آخر میں بارام قیام اور پُر لطف سفر کی دُعاؤں کے بعد ہماری مخلص مس پیرس کے دستخط تھے۔ جسے

گائیڈ مس پارس کہنے پر مُصر تھا۔ انگریزی الفاظ کے متعلق ہمارا تجربہ ہے کہ ان کے ہجّوں کے بجائے تلفّظ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ ہمیں پارس اور زیادہ پسند آیا کہ شاید موصوفہ اسم بامسمی ہوں۔۔۔ دُوسرے کاغذ میں سکاٹ لینڈ کے مختلف لوگوں سے ملاقاتوں اور مصروفیتوں کم تفصیل درج تھی۔ کُچھ سوچنے کے بعد ہم پر منکشف ہوا کہ ہم گھر سے مہمان ہو کر آئے ہیں لیکن سلوک ہم سے ذرا معزز سے ہرکاروں کا سا کیا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی منزل پر قدم رکھا نہیں اور اگلے سفر کا سامان تازہ ہو چکا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اس غلطی کا اسی وقت ازالہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ گائیڈ سے کہا:

"دیکھو میاں۔ ہم سات روز سے سفر میں ہیں۔ اتنی فوری گردش ہمیں موافق نہیں کہ اور بہت کُچھ ہونے کے علاوہ ہم انسان بھی ہیں، پیالہ و ساغر نہیں۔ سمجھے؟"

غالباً کُچھ نہ سمجھا لیکن ہم نے سلسلہ کلام جاری رکھا:

"اور باقی رہی مس پارس، تو اسے تمہاری معرفت بعد از سلام محبّت واضح ہو کہ ہم فی الحال ایک دو روز لندن ہی میں قیام کریں گے اور تازہ دم ہو کر کسی وقت اسے ملنے کو بھی آئیں گے اور پھر آرام سے مزید گردش اور پیار کی باتیں کریں گے۔۔۔" اور دِل ہی دِل میں سوچا: "کیا عجب کہ آج کل مس پارس کا حُسن بھی سکاٹ لینڈ کی طرح جوبن پر ہو۔"

گائیڈ سر تسلیم خم کرنے میں ذرا ہچکچایا لیکن ہمارے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا اور ہمیں ہوٹل میں اُتار کر رخصت ہو گیا۔

انگریزی بولنے سے میمیں مطیع ہوتی ہیں

گریٹ ناردین ہوٹل لندن کے پاش ہوٹلوں میں سے تو نہیں لیکن اس کا ایک اپنا قدیمانی انداز اور رئیسانہ ماحول ہے۔ جدید ہوٹلوں میں اور اس میں وُہی فرق ہے جو گلبرگ کے بنگلوں اور قلعۂ معلیٰ کی محلات میں ہے۔۔۔ اور ہمیں یہ ماحول بہت بھایا کہ ہم بھی وطن میں دیسی رؤسا میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ وطن میں دیسی شرفا کے لئے بہترین ہوٹل لنڈے کے گرد و نواح ہی میں پائے جاتے ہیں۔

ہر چند کہ ہماری شہرت برطانوی میزبانوں کی معرفت ہوٹل کے رجسٹروں تک پہنچ چکی تھی تاہم ہم نے ہوٹل کے استقبالیہ سے اپنا اور اپنے پاسپورٹ کا تعارف کرایا۔ ریسیپشن کلرک سے کہ ایک شیریں دہن ساحرہ تھی، فوری بے تکلفی کے ساتھ ایک دِل لگی کی بات کی۔ کمرے کو جاتے ہوئے پورٹر سے سرپرستانہ گفتگو کی۔ کمرے میں پہنچ کر روم میڈ سے مشفقانہ علیک سلیک کی اور کمرے کے ٹیلی فون سے ”سروس“ سے چند سوال کئے۔ اس اثنا میں ہم نے جو کُچھ کہا کہ ہو جائے، ہو گیا اور جو کُچھ چاہا کہ آ جائے آ گیا۔ گویا ہم ان لوگوں سے باتیں نہیں کر رہے تھے، الہ دین کا چراغ رگڑ رہے

تھے۔ ہمارے کام سوئٹزر لینڈ اور لبنان میں بھی رُکے تو نہ تھے۔ لیکن اس آسانی اور روانی کے ساتھ کبھی چلے بھی نہ تھے۔ وجہ ڈھونڈی تو وجہ یہ تھی کہ ہم زبانِ یار بھی اتنی ہی آسانی اور روانی سے بول رہے ہیں جیسے خود یار بولتا ہے۔ اور فقط بولتا کیا؟ انگریز کی غلامی برابری اور آقائی کے دنوں میں ہمیں انگریزی پر اس قدر عبور حاصل ہو گیا تھا کہ انگریزی میں بولنے کے علاوہ لڑ بھی سکتے تھے اور پیار بھی کر سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تھوڑی دیر پہلے گائیڈ لاجواب ہو کر اور کورنش بجالا کر سر نموڑائے چلا گیا تھا۔ اور اب روم میڈ ہماری انگریزی سُن کر حیرت سے پوچھنے لگی تھی کہ کیا ہم کبھی کیمبرج میں بھی رہے تھے؟ جس کے جواب میں ہم نے کسی قدر بے پروائی سے کہہ دیا "او یس" اور اس میں کُچھ مبالغہ ضرور تھا لیکن جھوٹ نہ تھا کیونکہ پہلی مرتبہ جب ہم انگلستان آئے تھے تو پورے دو گھنٹے کیمبرج میں گزارے تھے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کیمبرج کے قیام کا سوال ہم سے روم میڈ ہی نے پوچھا۔ کسی پڑھے لکھے انگریز کو ایسی خوشگوار غلط فہمی کی توفیق نہ ہوئی۔۔۔ لیکن خیر وُہ انگریزی بھی بُری نہیں ہوتی جس سے نچلے درجے کے انگریز اور میمیں مطیع ہو جائیں۔ چنانچہ اس رات ہم ایک فتح مندّی کے احساس سے سوئے اور ساری رات روم میڈیں ہمارے پاؤں دابتی رہیں، خواب میں۔

دُوسرے روز ناشتے سے فارغ ہو کر لونج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ ایک انگریز ہمارانام لیتے ہوئے ہم تک پہنچا۔ معلُوم ہوا ہمارا گائیڈ ہے جو کل والے گائیڈ سے مختلف ہے اور یہ کہ اُس کا نام جو کُچھ بھی تھا، اِس کا نام نارمن گولڈ ہل (NORMAN GOLDHILL) ہے اور مزید یہ کہ ہمیں مس پارس تک لے جانے کو آیا ہے کیونکہ موصوفہ کا جیا ہماری ملاقات کے لئے بیقرار ہے۔ ہم نے مصلحتاً یہ نہ پوچھا کہ مس پارس نے پچھلی رات بھی اختر شماری ہی میں کاٹی تھی یا یہ درد کی ٹیسیں آج صُبح دفتر میں آکر اُٹھی تھیں اور اس کے ساتھ ہو لئے۔

کیا خُدا نے حسینوں کو ملازمت کیلئے پیدا کیا ہے؟

ہوٹل سے نکل کر لندن کی گلیوں سے گزرے۔ ٹیوب ٹرین سے سفر کے لئے زیرِ زمین گئے اور بطنِ زمین سے۔۔۔ تقریباً چند اماموں کی طرح۔۔۔ بجلی کی کرنوں کی سیڑھی لگا کر روئے زمین پر آئے اور آکسفورڈ سٹریٹ کی بھیڑ میں مدغم ہو کر برطانوی ادارے کے دفتر کو چلے۔ یہاں پہلی بار احساس ہوا کہ ہم لندن آ گئے ہیں اور وُہ یُوں کہ جونہی حواس پر اس شہر کے لمس و بو اور رنگ و آہنگ کا عمل ہوا، دس سال پہلے کا لندن ہمارے لاشعور میں جاگ اُٹھا۔ یُوں لگا جیسے اس کے در و بام نے ایک مختصر سی ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد اپنے مانوس چہروں سے نقاب الٹ دیئے ہیں۔ پھر بتدریج چند اور

دُھندلی یادوں میں رنگ بھرنے لگا۔۔۔وُہ سامنے ریستوران جس میں نادر ٹوانہ[۴۶] کی میز پر ہر شب ایک نئ اور نادر مہ رُخ شریکِ طعام ہوتی تھی۔ وُہ بوٹس کی پکاڈلی والی دکان جس کے سامنے منجملہ عشاقِ لندن، راجہ شیر محمّد خان[۴۷] انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارا کرتے تھے اور وُہ گرین پارک کے نیم تاریک گوشے جو ایلین کی بوئے پرہن سے شب بھر معطّر رہتے تھے۔۔۔ ہم ان گلرنگ و مشکبو یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک گولڈ ہل نے یہ کہہ کر ہمیں چونکا دیا:

”سر یہ سامنے میزبان ادارے کا دفتر ہے۔“

ہم یاروں کی طرب گاہ سے نکل کر سرکاری عمارت میں داخل ہوئے۔ اندر ہمیں ایک کھلے دیوان خانے میں بٹھایا گیا جہاں ہم جیسے کئ نووارد غیر ملکی مہمان اپنی اپنی میزبانوں سے فرداً فرداً رُشد و ہدایت حاصل کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک نگاہ دوڑائی تو رنگ رنگ کے مہمان اور رنگ رنگ کی میزبانیں نظر آئیں۔ مہمانوں کے رنگوں کی قوسِ قزح میں نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کا گلابی تھا۔ ہانگ کانگ اور ملایا کا ہلکا زرد، ہندوستان کا سانولا، پاکستان کا سلونا اور مختلف افریقی ممالک

---

[۴۶] ملک نادر خان ٹوانہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

[۴۷] راجہ شیر محمّد خان بار ایٹ لاء۔ لائل پور

کا نیم سیاہ سے لے کر مطلق سیاہ تک، حتیٰ کہ آخری مہمان کے قرب وجوار میں تاریکی کا یہ عالم تھا کہ حکم کا یکّہ بھی لو دینے لگتا تھا۔ لیکن اس ظلمت میں ہر مہمان کے پہلو میں ایک ایک سُرخ و سپید میزبان میم آبِ حیات لئے محوِ تواضع تھی اور میزبان بھی ہر عمر کی۔ مرصع مگر از کارِ رفتہ بوڑھیوں سے لے کر شباب سے بے تاب دوشیزاؤں تک۔۔۔اب دیکھنا یہ تھا کہ ہماری اپنی میزبان مس پارس جو ہماری آمد کی خبر سُن کر کسی لمحے لونج میں آنے والی تھی، سن و سال اور خدوخال کے پیمانے میں کہاں فِٹ ہوتی ہے۔

آخر مس پارس آئی اور بے تابانہ آئی، مہربانانہ آئی مگر دِلربایانہ نہ آئی کہ ہر چند کہ نوخیز تھی بلاخیز نہ تھی، یعنی شکل کی مقبول تو تھی مگر محبوب نہ تھی، اگرچہ ملاقات کے لئے اس سے موزوں تر شکل ممکن نہ تھی۔ کاروبار میں حُسن مداخلت کرنے لگے تو کاروبار روانی سے نہیں چلتا۔ حسینوں کو خُدا نے ملازمت کرنے کے لئے نہیں، فقط پیار کرانے کے لئے پیدا کیا ہے۔

مس پارس نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے آواز میں گلوکوز کھول کر کہا:

”مُجھے بہت افسوس ہے آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔“

یہ مس پارس کی تواضع کا مبالغے کا صیغہ تھا ورنہ ہمیں آئے ہوئے فقط ایک منٹ ہوا تھا۔ مس پارس حُسنِ تمام کی دعویدار نہ سہی، حُسنِ کلام کی شہریار ضرور تھی۔ بولی:

"اور مُجھے کل کے خط کی بھی معذرت مانگنا ہے۔ ہائے میں نے کتنی حماقت کی! سکاٹ لینڈ کہیں بھاگ نہیں چلا تھا۔ میں سچ مچ نادم ہوں۔۔۔ پلیز مُجھے معاف کر دو۔"

ہم نے دِل کی اتنی اتھاہ گہرائی سے نکلی ہوئی معذرت پہلے نہیں سُنی تھی۔ اگر ہمارے پہلو میں بھی دِل تھا۔۔۔ اور یقیناً تھا۔۔۔ تو جواب میں ہم دو ہی باتیں کر سکتے تھے۔ یا تو گھگھیا کر کہتے کہ "خُدارا، مس پارس ہمیں شرمندہ نہ کرو اور ہمیں کانٹوں پر مت گھسیٹو۔" اور یا بولے بغیر اسے سینے سے لگا لیتے اور اس کے لب و رخسارے سے عرق انفعال کے موتی چُن لیتے۔ لیکن اضطرار میں کانٹوں والے فقرے کی ہم سے انگریزنہ بن سکی اور سینے سے لگانے کی ہمت نہ پڑی اور مُنہ سے نکلا تو یہ یتیم سا فقرہ جو کسی ممنون بیرے یا خانسامے کی زبان سے نکل سکتا تھا: "نو نو۔ مس پارس۔ تھینک یو۔"

ظاہر ہے کہ ان انگریزی الفاظ سے نہ ہمارے جذبات ٹپکتے تھے اور نہ کیمبرج یونیورسٹی برستی تھی لیکن مس پارس نے تھوڑے لکھے کو بہت جانا اور سراپا تشکّر ہو کر بولی:

"تو آپ نے میری خطا معاف کر دی؟ اوُہ آپ کتنے اچھے ہیں! آیئے اب آپ کا پروگرام بنائیں۔ بیٹھیں۔ اِدھر اس صوفے پر، یہ آرام دہ تو ہے؟"

صوفہ تو بالکل مس پارس کی طرح ملائم گداز اور آرام بخش تھا لیکن یہ مقام صوفے کی توصیف کا نہ تھا بلکہ مس پارس کی تعریف کا۔ اتنے میں ہماری انگریزی بھی ذرا بحال ہو گئی۔ چنانچہ کہا:

"مس پارس۔ مُجھے معلُوم نہ تھا کہ میری رہنمائی کے لئے حکومت برطانیہ نے لندن کی SWEETEST (سب سے پیاری لڑکی) چُن رکھی ہے۔"

مس پارس اس غیر متوقع تعریف کی تاب نہ لا سکی۔ جواب میں پہلی کوشش پر کُچھ ہکلا سی گئی۔ پھر ذرا سُر خا گئی اور آخر کوشش پر ہماری طرح کُچھ کہہ سکی تو وُہی جو کوئی ممنون بیرن یا خانسامن[۴۸] کہہ سکتی تھی:

"او گاش۔ تھینک یو۔"

ویسے مس پارس کی شانِ کریمی سے بھی ظاہر تھا کہ اگر ہمارے چہرے پر کسی قسم کے موتی تھے تو فی الفور چُن لینا چاہتی تھی۔ بہر حال فریقین کے لب و عارض کے گوُہر تو ناچیدہ ہی رہے لیکن پروگرام کی تشکیل نہایت مہر بھری فضا میں ہوئی۔ جہاں ہم نے اصرار کیا، مس پارس سراپا لطف و کرم بن گئی اور جہاں مس پارس نے ضد کی ہم سراپا

---

[۴۸] بیرا اور خانساماں کی یہ بالکل خانہ ساز مؤنثیں ہیں۔ اگر آپ کو ان سے اتفاق نہیں تو مصنّف کو آپ سے کوئی گلہ نہیں

تسلیم و رضا ہو گئے، گو آخر میں پتہ چلا کہ ہم نے تو کسی بات پر اصرار کیا ہی نہ تھا۔ یعنی جو رضا مس پارس کی تھی وُہی ہمارے پروگرام کی تقدیر بن گئی۔ آخر اُٹھے تو مس پارس نے کسی قدر تپاک سے دوبارہ مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ مس پارس کا ہاتھ ہمارے ہاتھ ہی میں تھا کہ ہم نے ازراہِ شوخی کہا:

"مس پارس، سونا تو ہم پہلے مصافحے ہی پر ہو گئے تھے۔ اب ہیرا بنانے کا ارادہ ہے کیا؟"

حیران ہو کر بولی: "اگر SOMEBODY (کوئی) آپ کو چھُو جائے تو آپ سونا بن جاتے ہیں؟"

عرض کیا: "سم باڈی تو نہیں۔ صرف پارس سے چھو جانے سے سونا بن جاتے ہیں۔"

"یعنی میرے چھونے سے؟"

"جی ہاں۔۔۔ آپ پارس جو ٹھہریں۔"

"آپ کسی قسم کا مذاق تو نہیں کر رہے۔"

"بالکل نہیں۔ ہماری کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ پارس سے چھو کر لوہا بھی سونا بن جاتا ہے۔"

”میں تو بیسیوں لوگوں سے ہاتھ ملاتی ہوں۔ وُہ کیوں نہیں سونا بن جاتے؟“

”ہم نے تو آپ کے ملاقاتیوں میں سے صرف گولڈ ہل ہی دیکھا ہے اور وُہ سونا ہی نہیں سونے کا پہاڑ ہے۔“

مس پارس کا دھیان گائیڈ کے نام کی طرف نہیں گیا تھا اور اب جو گیا تو ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگی۔۔۔ بولی:

”آپ بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ یُوں لگتا ہے جیسے آپ WOO[۴۹] کر رہے ہوں۔“

”نہیں محترمہ، میں فقط ہدیۂ تحسین پیش کر رہا ہوں۔ جسے ہم WOO کرتے ہیں, اس کے لئے تو ہم باقاعدہ قلعے تعمیر کرتے ہیں۔“

”آہا قلعے! سچ؟“

”جی ہاں، قلعے۔ اور پھر انہیں آباد کرنے کے لئے اسے لے بھاگتے ہیں۔“

”اوئی کس قدر رومانٹک بات ہے۔“

---

[۴۹] woo اظہارِ عشق بغرضِ شادی یا بلاغرضِ شادی۔

"جی ہاں۔ اور آخر کار خانیوال جنکشن پر پکڑے جاتے ہیں۔"

مس پارس نے خانیوال جنکشن کی تشریح چاہی تو ہم "باقی پھر" کہہ کر تشریح پی گئے کیونکہ ہم اتنا جلد یہ رومان پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور ساتھ ہی ایک مسحور و مسرور مس پارس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا پروگرام اُٹھایا اور رخصت ہوئے۔۔۔ عورت کی اصلی کمزوری سونا، ریشم یا آئس کریم نہیں، تعریف ہے۔ اگر یُوں نہ ہوتا تو پرنس علی خان کے علاوہ کوئی عشق نہ کر سکتا۔ وارث شاہ کی ہیر کا ہیرو کوئی سہگل یا آدم جی ہوتا اور ہمارے یار قیس کا نام کتابوں میں نہ ملتا۔ پروگرام کی رُو سے ہمیں اسی شام اپنی مستقل قیام گاہ پارک کورٹ ہوٹل میں منتقل ہونا تھا اور دُوسرے روز التم پلیس جانا تھا۔

گمنامی بڑی نعمت ہے

ہمارا نیا گھر یعنی پارک کورٹ ہوٹل ہائیڈ پارک کے شمال میں واقع ہے اور عام اچھے ہوٹلوں میں سے ایک ہے لیکن ہمارے لئے ذرا خاص ہو گیا کہ داخل ہوتے ہی مینجر سے علیک سلیک ہوئی تو شریف آدمی نے ہمیں پاکستانی پا کر سینے سے لگا لیا۔ اس ناگہانی تپاک کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا موصوف ہماری راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل کی مینجری سے فارغ ہو کر لندن آئے ہیں۔ ساتھ ہی انہیں یقین سا تھا کہ پنڈی میں ہمیں کہیں دیکھا تھا۔ اِدھر ہمیں عین الیقین تھا کہ انہیں کبھی دیکھا تھا نہ سُنا۔

لیکن یہ تردید کا نہیں تصدیق کا مقام تھا، چنانچہ ہم نے بھی برابر کا زور لگا کر انہیں سینے سے بھینچا اور ان کی پنڈی کی چند یادیں جو ایسی کہنہ نہ تھیں اور تازہ کر دیں۔ جب ہوٹل کے ملازمین نے اپنے باس کو اور ہمیں ہوں یکجان دیکھا تو ان پر ایک واضح رقت طاری ہو گئی۔ چنانچہ ریسپشن والی لڑکی نے وجد میں آ کر ہمیں بلا ضرورت ڈبل کمرہ دے دیا جس کی کھڑکیاں پانچویں منزل سے ہائیڈ پارک پر کھلتی تھیں۔ پورٹر نے موج میں آ کر ہمارا سامان اُٹھایا اور تقریباً ہمیں بھی اُٹھا لیا کہ ہماری کمر پر مؤدبانہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہمیں لفٹ کے ذریعے کمرے کے دروازے تک پہنچا دیا جہاں روم میڈ نے کمرہ کھولا اور ہمیں اندر قدم رکھنے کو کہا۔ پھر کمرے کے سامان کا باقاعدہ معائنہ کرایا اور دورانِ معائنہ ازراہِ تواضع بستر کی ایک فرضی شکن کفِ دست سے ہموار کر دی۔ غسل خانے میں ایک صابن کی ٹکیہ کو جو شمالاً جنوباً پڑی تھی ازراہِ تکلف شرقاً غرباً رکھ دیا اور بار سے لٹکتے ہوئے تولئے کے سر پر ازراہِ شفقت ملائم سا ہاتھ پھیرا۔۔ بعد میں ہم نے مینجر کے سامنے اس ملازمہ کے سگھڑ پن کی ازراہِ ممنونیت طویل داد دی۔

رات ڈنر کے لئے ڈائننگ ہال میں گئے۔ غالباً ادھر ہی کا اشارہ تھا کہ ہمارے داخلہ ہوتے ہی چند بیروں کی خدمات ہم پر مرکوز ہونے لگیں۔ لیکن ہم اس فالتو تواضع سے گھبرا گئے اور دامن بچا کر ہال کے کونے کی میز پر جا بیٹھے اور سٹیورڈ کے کان میں کہا:

”بڑے میاں، ہمیں معمولی سی توجّہ اور تھوڑی سی روٹی کافی ہے۔ ہمیں تماشا نہ بنائیں۔ کُچھ تماشا دیکھ لینے دیں۔“

ہمارا تجربہ ہے کہ زندگی کا لطف تماشا بن کر نہیں تماشائی بن کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مرکز توجّہ بننے کے لئے یا تو بہت بڑے کردار کی ضرورت ہے یا بہت بڑے مداری پن کی۔ پہلی صورت میں بڑی ریاضت اور دُوسری صورت میں بڑی ہاتھ کی صفائی درکار ہے۔ پھر تحسین ہضم کرنے کے لئے ایک وسیع ظرف اور نفرین برداشت کرنے کے لئے ایک عمیق ڈھٹائی کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں بڑے کٹھن کام ہیں۔ سو شہرت کی ہوس مردود ہے اور گمنامی کی تمنّا محمود۔ شہرت سنگِ گراں گھسیٹنے کا عمل ہے اور گمنامی مانند نسیم گزرنے کا نام۔۔۔ چنانچہ ہم گمنامی کی نعمت سے مالامال ہو کر گوشۂ فراغت میں بیٹھ گئے اور ہماری نگاہ ڈائننگ ہال کی رونق اور اس کے رونق آفرینوں کا بے محابا تماشا کرنے لگی۔

پینی نے آم کھایا

کھانا پکانے کے معاملے میں انگریزوں سے زیادہ بدمذاق قوم دُنیا بھر میں نہیں۔۔۔ ان بے ہنروں سے کام کے آلو پیاز بھی نہیں پک سکتے۔۔۔ مگر کھانا کھانے کا اہتمام! اللہ اکبر! آلو پیاز کھانے کے لئے بھی پہلے تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔ پھر اسے سنہری

پھُولوں اور روپہلی ٹرافیوں سے سجاتے ہیں۔ پھر خود سفید قمیصوں، سیاہ سوٹوں اور سیاہ تر ٹائیوں میں سجتے ہیں۔ پھر ہال کے ایک کونے سے موسیقی کے معنبر چشمے اُبلتے ہیں اور جب کہیں آلو پیاز کا نوالہ ان کے حلق سے دُوسری جانب ڈھلتا ہے۔۔۔ اور یہ سطور لکھتے ہوئے ہیں وُہ پرانا واقعہ بھی یاد آتا ہے جب راولپنڈی میں ہمارے انگریز پڑوسی کی چھ سالہ بیٹی پینی ہمارے گھر آنکلی۔ ہم صحن میں بیٹھے آم کھا رہے تھے۔ پینی کو بھی ایک آم پیش کیا تو اس نے شکریے کے ساتھ قبول کیا مگر کھانے سے پہلے ہمارے نوکر کو حکم دینے لگی:

"بیرا چوکی لاؤ۔"۔۔بیرا کرسی لے آیا۔

"بیرا، ٹیبل لاؤ۔"۔۔بیرا میز لے آیا۔

"بیرا، ٹیبل کلاتھ لگاؤ۔"۔۔بیرے نے میز پوش بچھا دیا۔

"بیرا، پلیٹ لاؤ۔"۔۔بیرے نے تھالی رکھ دی۔

"بیرا، نائف اور سپون لاؤ۔"۔۔بیرا چھری اور چمچ لے آیا۔

"بیرا، نیپکن لاؤ"---بیرا ہانپتا کانپتا نیپکن بھی لے آیا۔

اور جب کہیں چھ سالہ پینی نے بیرے کے گلے سے چھری ہٹا کر آم کے شکم پر رکھی۔ اس کے مقابلے میں ہمارے آم کھانے کے جملہ اوزار دو ہاتھ تھے اور ایک مُنہ --- اور ہاں، ایک غسل خانہ بھی۔

تو ہر چند کہ اس ہوٹل کے بیرونی ٹھاٹھ ایسے امیرانہ نہ تھے، اس کے اندرونی انداز اور خصوصاً ڈائننگ ہال کے تیور خاصے شاہانہ تھے۔ وُہ در و دیوار پر جگمگاتے قمقمے، وُہ راہ و روش پر مہکتے گلدستے، وُہ میزوں اور مائدوں پر جھلکتے شیشے، چمکتی چاندی اور دمکتی چینی۔ لیکن ہماری دلچسپی کا مرکز نہ یہ بے جان چھری کانٹے تھے، نہ بے روح پلیٹیں اور پیالیاں بلکہ یہ جاں نواز کھانے والے اور روح پرور کھانے والیاں۔۔۔ دُنیا کی رونق سامان نہیں، انسان ہیں۔ اگر اس ہال سے انسان منہا کر دیئے جاتے تو یہ زرق برق بھانڈے فقط مٹّی کا ڈھیر تھے، یُوں جیسے کوئی چاند پر جا نکلے۔۔۔ اور انسان بھی رنگ رنگ کے جس میز کی طرف نگاہ اُٹھتی کبھی مہر سے ٹکراتی، کبھی ماہ سے لیکن کثرت تعداد کی وجہ سے ان چاند تاروں کو ایک دُوسرے سے الگ کرنا یا پہچاننا ممکن نہ تھا۔ گو چند روز کے قیام کے بعد اس کہکشاں کے اجزا آشناؤں، نیم آشناؤں اور اجنبیوں میں بٹنے لگے لیکن یہاں کسی آشنائی کو دوام نہ تھا کہ یہ مسافر خانہ تھا۔ آج آئے اور کل گئے۔ نتیجتاً ہر صُبح ناشتے کے وقت نئے خورشید طلوع ہوتے اور زندگی میں ایک نیا نکھار در آتا۔ عرض کیا

ہے نا کہ دنیا کی رونق سامان نہیں، انسان ہیں، یعنی آپ ہیں۔ یقین جانیں کہ دِل جس سے زندہ ہے وُہ تمنّا تمہیں تو ہو۔

اگلے روز پروگرام کے مطابق ہمیں التم پلیس جانا تھا۔ التم پیلیس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ایک پرانا شاہی محل ہے جو لندن سے بارہ میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ کبھی ہنری ہشتم اور ان کی سات بیویوں میں سے چہارم اور پنجم کے استعمال میں رہا تھا۔۔۔ بظاہر ایک وقت پر ایک بیوی کے ساتھ۔۔۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان دِنوں اس کے ایوانوں اور ان راتوں اس کے شبستانوں کے رنگ و بو کا کیا عالم ہو گا۔ لیکن ایک روز جب ہنری نے آنکھیں موندلیں تو وُہ سرور و سوز نہ جوش و خروش تھا۔ بلکہ یکایک تاریخ نے بھی آنکھیں بدل لیں اور پھر یہ عمل محکمہ آثاری قدیمہ کی توجّہ کا شکار ہو گیا۔۔۔ یہ محکمہ کسی آباد گھر میں بھی قدم رکھ دے یا اپنی تختی لٹکا دے تو وہاں سے عبرت ٹپکنے لگتی ہے۔۔۔ مگر صدیوں کے بعد اس کی قسمت نے پلٹا کھایا اور صرف چند سال ہوئے کہ لندن کے ایک متمول سوداگر نے اسے خرید کر شاہی کھنڈروں کی بنیادوں پر دوبارہ محل تعمیر کرایا اور پھر بجائے اس کے کہ اپنے پیشرو کی سُنت پر چل کر دو چار بیویوں کے ساتھ وہاں رہنے لگتا، نیا نکور محل برطانوی فوج کے شعبۂ تعلیم کو تحفے میں دے دیا۔۔۔ جی ہاں، سخاوت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔ بہر حال التم پیلس میں اگلے دو روز کے لئے ہماری میزبان رائیل ایجوکیشن کور تھی۔ جس کے مقامی سربراہ کرنل فورڈ تھے۔

ٹرین رستہ بھول سکتی ہے۔

دُوسرے روز گولڈ ہل ہمارا الٹم کا ٹکٹ لئے ہوٹل میں پہنچا اور شتابی سے ہمارا سامان اُٹھائے، ہمیں چمکارتے، پچکارتے اور ذرا ادب سے دھکیلتے باہر ٹیکسی تک لے گیا کہ گاڑی سے چھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ گولڈ ہل بڑا ایسا آدمی تھا۔ ہمارے میزبان ادارے کے گائیڈ اور بھی تھے لیکن گولڈ ہل کا اندازِ رہنمائی بالکل نرالا تھا۔ جب کوئی مہمان گولڈ ہل کے سپرد کیا جاتا تو وُہ یُوں سمجھتا جیسے کسی ایک سالہ بچّے کو بچّہ گاڑی میں بیٹھا کر اس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو دیر تک ہمیں گولڈ ہل سے اس سوال کی توقع رہی کہ کیا دودھ کی بوتل، نپل اور خشک لنگوٹ بھی ساتھ رکھ لیا ہے یا نہیں۔ گولڈ ہل سے ملاقات کے پہلے چند لمحوں ہی میں بے تکلّف ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔۔۔ چیئرنگ کراس سٹیشن پر گاڑی میں بیٹھے اور گولڈ ہل کو الوداع کہنا چاہا تو رخصت ہونے کی بجائے آرام سے ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پوچھا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"آپ کے ساتھ۔"

"ہماری سرپرستی کے لئے؟"

"آپ کی رہنمائی کے لئے۔"

"مگر ہم ایک مدّت سے بالغ ہیں۔"

"ایک اجنبی بالغ بھی رستہ بھول سکتا ہے۔"

"چلو یونہی سہی مگر ایک ٹرین کیسے رستہ بھول سکتی ہے؟"

"اگر آپ صحیح سٹیشن سے آگے یا پیچھے اُتر گئے تو؟"

"تو یُوں سمجھو کہ ہماری بلوغت فضول اور انگریزی مجہول ہے!"

"بلوغت اور انگریزی کے باوجود یہ حادثہ ہمارے ایک پاکستانی مہمان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ بلکہ وُہ آپ سے عمر میں دس سال اور علم میں دس جماعت آگے تھے۔ وُہ پی ایچ ڈی تھے۔"

"وُہ فلاسفر ہوں گے۔ میں سپاہی ہوں۔ فلاسفر فقط سوچتا ہے، سپاہی دیکھتا بھی ہے۔"

"اور گائیڈ سوچتا دیکھتا اور کُچھ کرتا بھی ہے۔"

ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی التم پلیس سٹیشن پر پہنچی جہاں انسٹی ٹیوٹ کے ایک افسر میجر جنکن کار لے کر آئے ہوئے تھے۔ گولڈ ہل نے ہمیں بازو سے تھام کر باقاعدہ ان کے حوالے کیا۔۔۔ شاید رسید بھی لی ہو۔۔۔ اور جب تک

ہم گائیڈ کی گود سے میجر کی گاڑی میں منتقل نہ ہو چکے، گولڈہل بے چارا، جیسے مامتا کا مارا، کھڑا دیکھتا رہا اور جب ہماری کار چل پڑی تو ہاتھ ہلانا شروع کیا جو خدا جانے کب تک ہوتا رہا۔ آخر ہم موڑ کاٹ کر او جھل ہو گئے اور کرنل فورڈ کے دفتر کو روانہ ہوئے۔

کار میں جاتے ہوئے میجر جنکن کو ذرا غور سے دیکھا تو خاصا بوڑھا نظر آیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ آپ دُوسری جنگِ عظیم کے بعد یعنی آج سے کوئی پچیس برس قبل میجر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے اور مختلف پاپڑ بیلنے کے بعد اب کُچھ عرصے سے غیر فنّی حیثیت میں انسٹی ٹیوٹ میں آخری پاپڑ بیل رہے تھے۔ متفرق کام انجام دیتے تھے۔ مثلاً مہمانوں کا استقبال وغیرہ۔ بوڑھے تھے مگر زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ جاتے جاتے کوئی حسین چہرہ دیکھ لیتے تو بڑی بلند آواز سے ہائے وائے کرتے۔ پھر کسی کو ہاتھ ہلاتے تو کسی کو آنکھ مارتے لیکن ان کی عمر سے زیادہ ان کی شکل کی بناوٹ ایسی تھی کہ خواتین بُرا ماننے کی بجائے مسکرا کر رہ جاتیں۔ ایک جگہ ایک نوجوان لڑکی کے قریب گاڑی ٹھہرالی اور اسے کہا "لفٹ چاہیے؟"

خدا جانے یہ لڑکی میجر جنکن کو پہلے سے جانتی تھی یا کیا، بولی:

"اگر آپ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تو میں اپنی نانی بھیج دیتی ہوں۔ وُہ آپ کے لئے بہتر کمپنی ثابت ہو گی۔"

میجر بولا: ”بہت اچھا۔ بشرطیکہ تمہاری نانی ساٹھ سال سے اُوپر نہ ہو۔“

اس پر لڑکی اور میجر نے مل کر قہقہہ لگایا اور ظاہر ہے کہ ہمیں بھی اس قہقہے میں شریک ہونا پڑا۔

وہ ذرا قبض کے ساتھ مسکراتے ہیں

آخر پیلس کے بیرونی دروازے پر پہنچے۔ کرنل فورڈ کا دفتر شاہی محل کے سینکڑوں ایکڑ باغات کے ایک کونے میں تھا۔۔۔ محل باغات کے مرکز میں تھا۔ اور صرف آفیسرز میس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔۔۔ کار سے اتر کر دفتر کی طرف بڑھے تو کرنل فورڈ چند قدم پیشتر ہمارے خیر مقدم کو آئے۔۔۔ دیکھا تو ان کے چہرے پر شوقِ ملاقات کی ایک خوشخط تحریر نظر آئی، یوں جیسے ہمارا انتظار کرتے کرتے ہی کرنیل بن گئے ہوں اور ہائے اس شخص کی وُہ خودرو استقبالیہ مسکراہٹ! ظالم نے بس ایک مسکراہٹ کے عوض یعنی مفت میں ہمارا دِل جیت لیا۔ ہمیں آج تک سمجھ نہیں آیا کہ بعض لوگ ملاقات پر خندہ پیشانی کی بجائے کج رُخی سے کیوں پیش آتے ہیں حالانکہ کج رُخی کے لئے بڑے تردّد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی پہلے مُنہ بگاڑنا پڑتا ہے۔ پھر نتھنے پھُلانے پڑتے ہیں اور آخر میں پنجے جھاڑنے پڑتے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر اچھی خاصی درندگی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ بخلاف اس کے خوش خلقی کیلئے کسی چیر پھاڑ کی ضرورت نہیں۔

فقط ایک خانہ ساز مسکراہٹ بس ہے۔ وُہ لوگ جنھیں غصّہ روانی سے اور مسکراہٹ قبض کے ساتھ آتی ہے، دراصل بڑے روگی ہوتے ہیں۔ یہ روگ عام طور پر باسوں اور ساسوں کو لگتا ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ متاثرہ ماتحت اور بہویں اپنے اپنے مریضوں کو لال پھُندنے والی اونچی مخروطی ٹوپی پہنا کر ان کے سامنے ڈگڈگی بجائیں اور بجاتی رہیں تا آنکہ یا تو باس اور ساس مُنہ پھاڑ کر قہقہے مارنے لگیں اور یا غصّے سے چیخ کر اپنا سر پھوڑ لیں۔

ارے ملکہ ہی تو ہے نا

ذکر کرنل فورڈ کی خوش مزاجی کا تھا۔ مصافحے کے بعد کرنل صاحب کے دفتر میں خاصے ادق علمی موضوعات پر بحث ہونے لگی لیکن شاید یہ کرنل صاحب کی خوش کلامی کی تاثیر تھی کہ ہر عقدہ خود بخود وا ہوتا محسوس ہوا۔۔۔ معاً ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ اگر سکولوں اور کالجوں سے تمام سڑیل استادوں کو پنشن یا دھکے دے کر چلتا کیا جائے اور ان کی جگہ خوش مزاج استاد اور خوش ذائقہ استانیاں بھرتی کر لی جائیں تو حساب اور الجبرا جیسے خشک مضامین میں بھی نم پیدا ہو جائے۔۔۔ کرنل صاحب سے باتیں کرتے کرتے پانچ بج گئے اور دفتر بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ کرنل صاحب ازراہِ مروّت ہمارے ساتھ پیلس تک چلے گئے جہاں ہمارا سامان پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ محل

کے وسیع باغات میں ایک چھوٹی سی ندّی کے کنارے پگڈنڈی پر جارہے تھے کہ کرنل فورڈیکایک بولے:

"کرنل خان۔ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اگلے ہفتے ہز میجیٹی، دی کوئین التم پیلس تشریف لارہی ہیں تو کیاتم حیران نہیں ہوگے؟"

اگراس کے جواب میں ہم صرف یہ کہتے کہ "جی ہاں حیرت توہوگی" تو کرنل فورڈ کادِل ٹوٹ جاتا۔ کرنل فورڈ کی خواہش یہ تھی کہ یہ پاکستانی ملکہ کی آمد کی خبر سن کر حیران ہونے کے علاوہ بھڑک اُٹھے اور رائل ایجوکیشن کور کی خوبیٔ قسمت پر رشک کر کر کے بے حال ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے کپڑے تو نہ پھاڑے اور نہ ہی بال نوچے لیکن حسبِ توفیق پھڑکے اور کہا:

"صرف حیرت؟ مجُھے یقین ہے آپ خواب کی باتیں کررہے ہیں۔"

کرنل فورڈ ہماری بے یقینی سے بہت خوش ہوئے اور بالکل بچّوں کی طرح بولے:

"مجُھے معلُوم تھا تم نہیں مانوگے مگر ہے سچ! اور ہاں تمہیں ایک بات اور بتاؤں مگر سُن کر چونک نہ اُٹھنا"

"ارشاد۔"

"ملکہ جمعہ کے روز پچھلے پہر چہل قدمی بھی کریں گی۔ معلُوم ہے کہاں؟"

"نہیں۔۔۔ کہاں؟"

"بالکل اسی پگ ڈنڈی پر جس پر ہم تم چل رہے ہیں!"

یہ کہہ کر کرنل فورڈ علامت تعجّب کی طرح سیدھا اکڑ کر بے حرکت کھڑا ہو گیا۔ ہمیں انگریزی میں اچھی طرح چونکنے کا طریقہ تو نہیں آتا تھا لیکن کرنل فورڈ کی نقل اتارتے ہوئے ہم بھی یک لخت رُکے۔ آنکھیں تا بحدِ امکان کھولیں، دیدوں کو چکرایا اور کہا:

"اونو۔"

فورڈ بولے: "او یس اور میں کہتا ہوں ذرا سوچو تو کہ تمہارے پاؤں کے نیچے وُہی پگڈنڈی ہے جو کل ملکہ کے پاؤں تلے ہو گی۔"

ہم نے دِل میں کہا: "ارے ملکہ ہی تو ہے نا۔ کوئی شہناز تو نہیں۔" لیکن کرنل فورڈ کی دلجوئی کی خاطر سینہ ابھار اور ذرا جھوم کر اپنی فرضی خوش بختی پر ناز کیا جس سے کرنل صاحب کی بظاہر تشفی ہو گئی اور آگے چل پڑے۔ انگریز ناقابلِ فہم جانور ہے۔ بادشاہ، ملکہ اور انکے بیٹوں بیٹیوں کی خواب گاہوں اور غسل خانوں میں جھانک کر اپنے اخباروں میں بڑے ملذذ سیکنڈل گھڑتا ہے لیکن ان کے قرب پر ناز بھی کرتا ہے۔ لیکن

انگریز کی زندگی میں یہ واحد تضاد نہیں، مثلاً ایک طرف تو یہ نت نئی ایجادیں کرتا ہے اور دُوسری طرف بے وقوفی کی حد تک قدامت پرست ہے۔ اِدھر ساتویں آسمان کی خبر لاتا ہے اور اُدھر اپنی قسمت پوچھنے کے لئے ہر پاکستانی کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا ہے کیونکہ وُہ ہر پاکستانی کو پامسٹ سمجھتا ہے۔۔۔ آپ لندن میں کسی میم کا ہاتھ تھام کر کہیں کہ مس تیری تقدیر میں شہزادہ لکھا ہے تو ممنون ہو کر آپ کا مُنہ چوم لے گی اور کہے گی۔ "اک بار پھر کہو ذرا۔۔۔ نیز اور کیا لکھا ہے؟"

ضروری انتباہ: اس مقام پر بعض نو دار پاکستانی پامسٹ قند مکرر کے لالچ میں کہہ دیتے ہیں کہ پہلے شہزادے کے علاوہ ایک اور شہزادہ بھی لکھا ہے یہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ میمیں بے وقوف تو ہیں لیکن اتنی بے وقوف نہیں کہ یکے بعد دیگرے دو شہزادوں کا یقین کر لیں۔ چنانچہ ہونٹ بھینچ کر ہاتھ کھینچ لیتی ہیں۔ سو ایک وقت میں ایک شہزادے ہی کی بشارت دینا چاہئے۔

انگریزی ہیر کو بھی کھیڑے لے گئے

پیلس میں گئے تو کرنل فورڈ نے کہا: "آؤ تمہیں تمہارا کمرہ دکھائیں۔"

اور یہ کہہ کر ہمیں دُوسری منزل پر لے چلے جہاں کمرہ نمبر ا ہمارے لئے ریزرو تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو اس کے شاہانہ طول و عرض اور ساز و سامان سے ذرا مرعوب ہوئے۔ اس پر کرنل نے موقع پا کر مزید ضرب لگائی:

"کرنل خان۔ یہ ہے تمہارا بیڈ روم جو کبھی این بولین کا بیڈ روم تھا۔"

اور ساتھ ہی ہمیں آنکھ ماری۔ انگریز کے دِل میں اب ایک شاہی سیکنڈل کروٹ لے رہا تھا اور ہم نے کہا:

"کرنل فورڈ، مُجھے این بولین کے ہم کمرہ ہونے پر بھی کافی فخر ہے۔ کیا یہ بستر بھی جس پر خاکسار شب بسر کرے گا وُہی تو نہیں جس پر موصوفہ سوتی تھیں؟"

بولے: "میرے خیال میں تو نہیں لیکن اگر آپ ایسا سوچنے میں راحت محسوس کرتے ہیں تو کوئی آپ کو روک بھی نہیں سکتا۔ اس ملک میں سوچنے کے خلاف کوئی قانون نہیں۔"

یہ کہہ کر کرنل فورڈ نے قہقہہ لگایا اور پھر بڑھ کر ہمارے کان میں سرگوشی کی:

"مگر این بولین تھی سچ مچ ناشپاتی، کوئی شخص ہنری پر الزام نہیں دھر سکتا۔"

یہ کہہ کر فورڈ نے آنکھیں بند کیں، اپنے لبوں کو ایک ہوائی بوسے کی شکل میں بھینچا اور کھولا اور ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ ہم نے اس مرصع خواب گاہ اور منزہ بستر کا جائزہ لیا۔ بیشک یہ این بولین کا بستر نہ تھا لیکن این بولین کے قابل ضرور تھا اور ایک طرح اسے این بولین سے بھی نسبت تھی۔ یہ خیال آیا اور خدا جانے کیا سوجھی کہ ایک لمحے کے لئے ہم کپڑوں سمیت اس پر دراز ہو گئے۔ لیٹے لیٹے اپنے آپ سے سوال کیا کہ یہ حرکت کیوں کر رہے ہو تو اندر سے جواب ملا کہ میاں تم رانجھے کے ہم وطن ہو۔ خالی سیج پر سو جانا اہلِ دِل کی پرانی ریت ہے۔ چنانچہ چند لمحے اور لیٹے رہے کیونکہ ہمیں یہ ڈر نہ تھا کہ ہیر کی طرح این بولین بھی اپنی سہیلیوں کو لے کر گستاخ اجنبی کی مرمت کو آ نکلے گی۔ بلکہ ہماری انگریزی ہیر کو چار سو سال پہلے ہی ہنری کھیڑا لے جا چکا تھا۔

شام پیلس کے باہر ایک غیر شاہی مکان میں کھانا تھا۔ کھانے کا وقت ساڑھے آٹھ بجے شام تھا۔ ہم سوا آٹھ بجے میس سے باہر نکلے تو سُورج اور اس کی روشنی کا یہ عالم تھا گویا ہم رات کے کھانے پر نہیں، ظہر کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ پھر کوئی ساڑھے دس بجے کھانا کھا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ مغرب میں سُرخ و کبود شفق پھُول رہی ہے۔ سُورج اور گھڑیوں میں یہ نااتفاقی ہم نے پاکستان میں نہ دیکھی تھی۔۔۔ آخر محل کو لوٹے۔ لیکن اگر محل کے باہر ہمیں اوقاتِ انگلستان سے مقابلہ تھا تو محل کے اندر ہمیں تاریخِ انگلستان کا سامنا تھا۔ سوئے تو خواب میں پہلے این بولین سے معاملہ رہا۔ پھر ہنری ہشتم

سے مصافحہ ہوا اور جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔ صبح بستر سے نکلے تو جہاں قدم رکھتے، معلُوم ہوتا کہ پاؤں شاہی خاندان پر ہی پڑ رہا ہے۔ غسل خانے کا کواڑ کھولا تو خیال آیا، ہنری نے اسی کونے سے جھانکا ہو گا۔ غسل کے ٹب میں لیٹتے ہوئے دیوار کا سہارا لیا تو سوچا این بولین نے بھی یہیں ٹیک لگائی ہو گی، یہاں لیٹی ہو گی، یہاں چلی ہو گی، یہاں۔۔۔ ہمارا سر چکرا گیا۔ غالباً این بولین نے زندگی میں ہنری کو وُہ چکر نہ دیئے ہوں گے جو مر کر ہمیں دیئے۔ لیکن شاہی خواب گاہ میں سونے کا کُچھ خراج تو ادا کرنا پڑتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر پیلس سے باہر نکلے تو میجر جنکن اپنی کار سمیت ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تقریب یہ تھی کہ اور چیزوں کے علاوُہ ہمیں برطانوی فوج کی مرکزی لائبریری دکھائی جائے۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہماری ولایت یاترا کا برطانوی فائلوں میں یہی بہانہ لکھا تھا کہ ہمیں برطانوی نظامِ کتب خانہ کا مطالعہ کرایا جائے گا، سو ابتدا اس فوجی کتب خانے سے ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ہم بھی فوجی تھے۔

شام پیلس کے باہر ایک غیر شاہی مکان میں کھانا تھا۔ کھانے کا وقت ساڑھے آٹھ بجے شام تھا۔ ہم سوا آٹھ بجے میس سے باہر نکلے تو سُورج اور اس کی روشنی کا یہ عالم تھا گویا ہم رات کے کھانے پر نہیں، ظہر کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ پھر کوئی ساڑھے دس بجے

کھانا کھا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ مغرب میں سُرخ و کبود شفق پھُول رہی ہے۔ سُورج اور گھڑیوں میں یہ نااتفاقی ہم نے پاکستان میں نہ دیکھی تھی۔۔۔ آخر محل کو لوٹے۔ لیکن اگر محل کے باہر ہمیں اوقاتِ انگلستان سے مقابلہ تھا تو محل کے اندر ہمیں تاریخِ انگلستان کا سامنا تھا۔ سوئے تو خواب میں پہلے این بولین سے معاملہ رہا۔ پھر ہنری ہشتم سے مصافحہ ہوا اور جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔ صبح بستر سے نکلے تو جہاں قدم رکھتے، معلُوم ہوتا کہ پاؤں شاہی خاندان پر ہی پڑ رہا ہے۔ غسل خانے کا کواڑ کھولا تو خیال آیا، ہنری نے اسی کونے سے جھانکا ہو گا۔ غسل کے ٹب میں لیٹے ہوئے دیوار کا سہارا لیا تو سوچا این بولین نے بھی یہیں ٹیک لگائی ہو گی۔ یہاں لیٹی ہو گی، یہاں پھسلی ہو گی، یہاں۔۔۔ ہمارا سر چکرا گیا۔ غالباً این بولین نے زندگی میں ہنری کو وُہ چکر نہ دیئے ہوں گے جو مر کر ہمیں دیئے۔ لیکن شاہی خواب گاہ میں سونے کا کُچھ خراج تو ادا کرنا پڑتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر پیلس سے باہر نکلے تو میجر جنکن اپنی کار سمیت ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تقریب یہ تھی کہ اور چیزوں کے علاوہ ہمیں برطانوی فوج کی مرکزی لائبریری دکھائی جائے۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہماری ولایت یاترا کا برطانوی فائلوں میں یہی بہانہ لکھا تھا کہ ہمیں برطانوی نظامِ کتب خانہ کا مطالعہ کرایا جائے گا۔ سو ابتدا اس فوجی کتب خانے سے ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ہم بھی فوجی تھے۔

فوجی کتب خانے میں گئے تو باہر سے گودام نظر آیا۔ میجر جنکن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو جواب ملا:

"فکر نہ کریں۔ یہ اندر سے بھی گودام ہی ہے۔ کتابوں کا گودام!"

اندر گئے تو گودام کی وسعت کے باوجود اس کی ترتیب میں سلیقہ نظر آیا اور ذرا حیرت ہوئی۔ کیا میجر جنکن نے شرارتاً اسے گودام کہہ دیا تھا؟ ہماری نگاہوں میں دوسرا سوال ابھرتے دیکھا تو کہنے لگا:

"یہ سلیقہ خود رو نہیں بلکہ لائبریرین کے حُسنِ مذاق کا نتیجہ ہے۔ آیئے آپ کو لائبریرین سے ملائیں۔"

مس کاٹن کھلے فرنٹئیر کی قائل ہیں

یہ کہہ کر میجر جنکن نے ایک کیبن پر دستک دی۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک وسیع چمکدار میز کے پیچھے ایک کشادہ کرسی پر ایک بھرے بدن کی خوش شکل خاتُون بیٹھی ہے۔ ہم نے پہلے تو شتابی سے اپنے تصوّر کی اصلاح کی جس کی رو سے ہم نے اس کرسی پر ایک گنجا سا عینکو مرد لائبریرین بٹھا رکھا تھا، جیسا کہ ہم پیچھے اکثر پاکستانی لائبریریوں میں دیکھ آئے تھے۔ میجر جنکن نے تعارف کرایا۔

"مس لوسی کاٹن۔ برطانیہ کی سب سے حسین، سب سے ذہین اور سب سے سڈول لائبریرین اور ہمارے پاکستانی مہمان کرنل خان۔"

مس کاٹن نے بوڑھے جنکن کی شرارت کو ایک مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے ہم سے مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ جب ہم نے تصوّر سے نکل کر حقیقت کو قریب سے دیکھا تو معلُوم ہوا کہ لباس مجاز میں سمائے نہیں سماتی۔ مس کاٹن کا سینہ مس کاٹن سے دو قدم بڑھ کر خیریت مزاج پوچھتا تھا۔ پھر موصوفہ کے ساتھ لائبریری کا چکر لگایا تو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے اور خصوصاً بالمشافہ کلام کرتے وقت، بے حد جسمانی احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً اس لئے کہ محترمہ خود اس ضمن میں خاصی بے احتیاط واقع ہوئی تھیں۔ خدا جانے کسی سے چھو جانے کے معاملے میں انہوں نے کوئی حد مقرر کر رکھی تھی یا اسے کھلا فرنٹیر سمجھتی تھیں، بہر حال یہ مس کمٹن کا داخلی معاملہ تھا۔ سرحد کے اس پار کاردِ عمل کُچھ ایسا ناگوار نہ تھا۔ اور ہمارا خیال نہیں کہ کسی نے مس کاٹن کو حد پار کرنے پر احتجاجی نوٹ بھیجا ہو۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ مس کاٹن کی لائبریری بھی تکنیکی لحاظ سے مس کاڈن کی طرح بے عیب تھی اور جس طرح۔۔۔ بقول مشتاق احمد یوسفی۔۔۔ موصوفہ کی ذاتی فہرستِ مضامین کا آسانی سے مطالعہ کیا جا سکتا تھا اسی طرح لائبریری کی ہزارہا کتابوں

کو اس خوبصورتی سے مضمون وار ترتیب دیا گیا تھا کہ پہلی کوشش ہی پر مطلوبہ مقام پر انگلی رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے لائبریری کے حسنِ انتظام کی دِل کھول کر داد دی۔ اس پر مس کاڈن جامے میں پھُولی نہ سمائی۔ ثبوت یہ کہ ہمیں جامے کے کسی نامعلُوم مقام پر بخیہ اُدھڑنے کی آواز آئی۔ پھر مزید تعریف کے لئے موصوفہ نے ایک اور لیڈنگ سوال کر دیا۔

”تو لائبریری پسند آئی؟“

”جی ہاں، بہت لیکن لائبریرین سے زیادہ نہیں۔“

”سچ؟ لائبریرین میں کیا خوبی دیکھی ہے؟“

”حُسنِ انتظام، حسنِ کلام، حسنِ۔۔۔“

”بس بس بس! آپ مذاق کر رہے ہیں۔ کیا معلُوم پاکستان میں آپ کی لائبریرین کوئی پراسرار مشرقی حسینہ ہو۔“

”محترمہ وُہ مشرقی تو ہے اور شاید پراسرار سے بھی خالی نہیں، لیکن سات بچّوں کا باپ ہے، گنجا ہے، بائی فوکل چشمہ پہنتا ہے اور ناک کی چونچ پر رکھتا ہے۔ آگے آپ خود اس کے حُسنِ کرشمہ ساز کی پیمائش کر لیں۔“

”تو مرد ہے؟ کیا عورتیں وہاں لائبریرین نہیں ہوتیں؟“

”جہاں تک میرا علم ہے، ہماری حسیناؤں نے ابھی تک لائبریری کا رُخ نہیں کیا۔“

”تو آپ کی حسیناؤں کا رُخ کس طرف ہے؟“

”ہماری اصلی حسینائیں تو صاحبوں اور سیٹھوں کے حرم میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر کھا کھا کر اشوک کا سٹوپا بن جاتی ہیں۔ ایک محدود سی تعداد سینما یا ائیر لائن میں کھپ جاتی ہے۔ یہ کھاتی بھی ہیں اور کام بھی کرتی ہیں لہٰذا سدا بہار رہتی ہیں۔“

”تو آپ کے یہاں بیگمیں، ائیر ہوسٹسیں اور ایکٹرسیں ہی ہوتی ہیں۔ گھریلو بیویاں نہیں ہوتیں؟“

”کیوں نہیں؟ باقی ننانوے فیصد کا یہی تو شغل ہے اور انہی کے دم سے ہمارے چولہے آباد ہیں۔ میں سمجھا آپ صرف حسینوں کا استعمال پوچھ رہی تھیں۔“

”لیکن وُہ لائبریرین کیوں نہیں بنتیں؟ میرے خیال میں تو لڑکیوں کے لئے یہ بہترین کام ہے۔ مُجھے دیکھیں۔“

”آپ کے سوا کُچھ دیکھ ہی نہیں رہا اور دیکھنے کے بعد گزارش ہے کہ اگر آپ پاکستان میں ہوتیں تو لائبریری کی بجائے گلبرگ کے کسی بنگلے میں ہوتیں۔“

پیشتر اس کے کہ لوسی ہم سے گلبرگ کے معنی پوچھتی، جنکن ہماری گفتگو میں مخل ہوا۔

"لوسی تم پاکستان کی تیاری کرو۔ اتنے میں ہم ذرا لنچ کھالیں۔ دیر ہو رہی ہے۔"

لوسی سے رخصت لی۔ ریستوران قریب تھا۔ داخل ہوئے اور جنکن نے بیرے کو صرف آنکھ مار کر آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے دو دو سینڈوچ اور ایک ایک گلاس بیئر کا رکھا ہے۔ میجر جنکن نے تو سینڈوچ کے ساتھ وُہی سلوک کیا جو ہر روز کرتا تھا اور پھر غٹ غٹ بئیر پینے لگا لیکن ہم نہ بئیر کو ہاتھ لگا سکتے تھے کہ بظاہر حرام تھی اور نہ سینڈوچ کو کہ باطن مشکوک تھی۔ عام انگریزوں کے لنچ کا ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ پتہ چلا کہ کمپنیوں کے پالتو ڈائرکٹروں کو چھوڑ کر برطانوی عوام [۵۰] سینڈوچ یا فش اینڈ چپس [۵۱] پر ہی جیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ ان کم بختوں نے فش اینڈ چپس کھا کھا کر ہی کبھی ایمپائر بنالی تھی اور آج بھی ایسی خوراک پر پانچ بڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ شاید تھوڑا اور سادہ کھانے ہی میں کوئی راز ہو۔ لیکن یہ فلسفے کا معاملہ تھا اور فلسفہ ہمارا کمزور پوائنٹ ہے۔ بہر حال ہمارا فوری پرابلم کسی سلطنت کی بنیاد رکھتا نہ تھا بلکہ پیٹ بھرتا تھا اور اب وُہ کھانا جو ہمارے سامنے رکھا تھا، ناکافی ہی نہ

---

[۵۰] SANDWICH

[۵۱] FISH AND CHIPS مچھلی اور آلو کے ٹکڑے

تھا، غیر اسلامی بھی تھا۔ تو ہم نے اس بے لذّت گناہ سے ہاتھ کھینچ کر اپنا حصّہ بھی جنکن کے آگے ڈال دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میجر جنکن کا چہرہ دیکھا تو معلُوم ہوا کہ ایک ممنون انگریز کی شکل کیسی ہوتی ہے۔ اور خود ایک بے وقت کی راگنی گا کر دعوتِ کام و دہن کا فیصلہ کیا لیکن ایک بھرپُور ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ انگریزی کھانوں میں بہترین کھانا یا تاش کی اصطلاح میں ترپ کھانا ناشتہ ہی ہے اور تاش ہی کا اصول ہے کہ جہاں تک ہو وہاں ترپ کا پتّا چلو۔

این بولین کی خواب گاہ میں دُوسری آخری اور تاریخی رات گزارنے کے بعد اگلے روز التم کو الوداع کہی اور صُبح کی ٹرین سے لندن کے چیئرنگ کراس سٹیشن پر پہنچے۔ آگے گولڈہل کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک تسلّی آمیز ہنسی ہنسا۔ تسلّی غالباً اس بات پر کہ ہم راہ میں گم یا اغوا نہیں ہو گئے تھے۔ ہم سے بے ضرورت مصافحہ کیا۔ شاید یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ ہم گوشت پوست کے ساتھ لوٹے تھے، محض ہیولا لے کر نہیں آ گئے تھے۔ پھر یکایک ہمارا سوٹ کیس اُٹھا کر ٹیکسی کی طرف بھاگ پڑا اور ہمیں بھی ساتھ بھاگنے کا مشورہ دیا۔

ہم نے کہا: ”بھاگیں کیوں؟“

بولا: ”آپ کی اگلی گاڑی چھوٹنے والی ہے، کہیں رہ نہ جائیں۔“

”کہاں کی گاڑی۔“

”مانچسٹر کی۔“

”ابھی الثم سے لوٹے ہیں اور مانچسٹر کی گاڑی تیار ہے؟ کیا تکلیف ہے مانچسٹر کو؟“

”تکلیف مانچسٹر کو نہیں، مس پارس کو ہے۔ کہتی ہے پروگرام طے ہو چکا ہے۔“

ٹھہریئے ملک الموت صاحب۔ مُجھے ٹائی لگا لینے دیجئے

یہ کہہ کر گولڈ ہل نے ہمیں مس پارس کا مانوس بادامی لفافے والا محبّت نامہ دیا جس میں سو معذرت کے بعد ایک حکم تھا کہ سیدھے مانچسٹر جایئے۔ وہاں سے چسٹر جایئے اور چسٹر کی چھاؤنی میں ایک فوجی لائبریری دیکھئے کہ وہاں کے فوجیوں کو آج اور کل کا دن ہی موافق ہے۔۔۔ کاش مس پارس کو یہ احساس بھی ہوتا کہ کُچھ چیزیں ہمیں بھی موافق آ سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شریفانہ وقفے کے بغیر ایک کے بعد دوسری لائبریری دیکھنا۔ آخر لائبریری ہی تھی نا کوئی بیوٹی شو تو نہ تھا۔ بلکہ حیرت ہوئی کہ ان باہمی تعلقات کے پیشِ نظر جو دو دن پہلے قائم ہوئے تھے، مس پارس نے خود ہی ہمارے آرام کا خیال کیوں نہ رکھا۔ بے شک پالا اسے فوج سے پڑا تھا تاہم کوئی مارشل لاء تو نہیں لگ رہا تھا۔ حکومت بدستور ملکہ الزبتھ کے ہاتھ میں تھی لیکن مس پارس کا بھی

قصور نہ تھا۔ خرابی یہ ہے کہ انگریزی زندگی بجائے خود مارشل لاء ہے۔ ہر کام کرنے کا ایک مقررہ وقت اور ایک مسلمہ دستور ہے۔ ان کے ہاں دو کاموں کے درمیان تصوّرِ جاناں کیلئے وُہ لمبے وقفے نہیں جن کے ہم عادی ہیں، نہ اوقات کار WORKING HOURS کے دوران ہی ذکرِ جاناں کا دستور ہے جو ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ بڑے سنگ دِل اور بے مروّت لوگ ہیں۔ یہ خود تو پیدا ہی وقت و دستور کی بیڑیاں پہن کر ہوئے ہیں۔ کم بخت اپنے مہمانوں کو بھی پہنا دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ معزّز مہمان کسی آزاد ملک اور کسی کھلی فضا میں پروان چڑھنے کے بعد گھر سے نکلا ہے۔ جہاں وقت اوّل تو ناپا ہی نہیں جاتا اور ناپا بھی جائے تو منٹوں اور سیکنڈوں کے پیمانے سے نہیں بلکہ گھڑیوں اور پہروں کے حساب سے اور جہان کا دستور وُہی ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اگر غالب انگلستان کا چکر لگا آتے تو کبھی کوہکن کو یہ طعنہ نہ دیتے کہ سر گشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا۔ بے چارا فرہاد تو فقط تیشے بغیر نہ مر سکا تھا انگریز تیشہ کھانے کے بعد بھی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک ٹائی نہ لگا لے اور ملک الموت کے نام تعارفی کارڈ نہ حاصل کر لے۔ قصّہ کوتاہ وقت و دستور کی انگریزی پابندیوں نے ہماری مہمانی سے گلیمر خارج کر دیا۔ ویسے ہمیں اپنے میزبانوں سے ایسی خوش فہمی بھی نہ تھی۔ ہم نے تو مس پارس سے پریت لگاتے ہی اپنے سے کہہ دیا تھا کہ

ڈر پیا لگدا یاری بے پرواہ نال اے

چنانچہ ہم خاموشی سے گولڈ ہل کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر یوسٹن سٹیشن کو روانہ ہوئے۔ جہاں مانچسٹر کی گاڑی ہمارے لئے چلّا رہی تھی۔ جونہی ہم نے ڈبّے میں قدم رکھا، مزید چیخیں ضبط کر کے سٹیشن سے چل نکلی اور اس تیزی سے کہ ہم گولڈ ہل کی آخری نصیحت بھی نہ سُن سکے۔

خیر نال کتھوں آئے او

ہمارے ڈبّے میں تین اور مسافر بھی تھے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ تینوں انگریز تینوں خوش شکل اور تینوں خوش لباس لیکن خدا کی مرضی تینوں گونگے! بڑا رحم آیا اگرچہ یہ دیکھ کر قدرے خوشی بھی ہوئی کہ اخبار پڑھ سکتے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر غریب اخبار پڑھتے رہے اور پھر ان میں سے ایک کسی کام کے لئے اُٹھا لیکن اتفاقاً دُوسرے کے پاؤں سے ٹکرا کر لڑکھڑایا اور تیسری کی نشست پر گرتے گرتے سنبھلا۔ اس پر فی الفور تینوں اشاروں کی بجائے زبان سے گڑگڑا کر ایک دُوسرے سے بامحاورہ معذرت کرنے لگے۔ ہم نے دِل میں کہا: ارے، یہ تو مُنہ میں زبان رکھتے ہیں لیکن اس کے استعمال کے لئے تعارف یا کسی حادثے کے محتاج ہیں۔ اور وُہ تو اچھا ہوا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی حادثہ ہو گیا ورنہ مسلسل خیریت کی صورت میں یہ زندگی بھر ایک دُوسرے کا مقاطعہ کئے بیٹھے رہتے۔ سوچا، نہ ہوا وُہ پاکستانی ریل کا ڈبّہ اور کوئی پنجاب کا

سٹیشن کہ اجنبی داخل ہوتے ہی بالجہر السلام علیکم کہتا اور جملہ حاضرین باجماعت وعلیکم السلام سے جواب دیتے۔ پھر ایک کہتا

"جی آیاں نوں۔"

دوسرا پوچھتا: "خیر نال کتھوں آئے او؟"

تیسرا کہتا: "چکوال توں؟ فیر تے آپنے وطنی او۔ کی حال اے چکوال دا، تے کی حال اے خان سرفراز[۵۲] دا؟"

پھر جب تک سفر ختم نہ ہوتا سوال اور جواب بھی ختم نہ ہوتے۔ بات بات پر ڈبّہ قہقہوں سے گونج اُٹھتا اور پتہ چلتا کہ کوئی زندہ دِل اور صاف باطن لوگ سفر کر رہے ہیں۔ انگریزی گاڑیوں اور خصوصاً اس کے فسٹ کلاس ڈبّوں کے مسافر تو کسی ایسے مردے کے سوگوار لگتے ہیں جس کا تابوت بریک میں جا رہا ہو۔ یہی تابوت یہ لوگ سینما میں بھی لے جاتے ہیں۔ مثلاً ہماری لندن کی وُہ پہلی شب کہ گولڈ ہل ہمیں کرزن سینما میں فلم SECRET CEREMONY دکھانے لے گیا جو ایک ایسی فلم تھی یعنی نابالغوں کے لئے ذرا قبل از وقت سمجھی جاتی تھی لیکن بالغوں کے لئے بڑی بروقت

---

[۵۲] راجہ محمّد سرفراز خان۔ چکوال کے ہر دلعزیز، خوش اوقات اور مخیر رئیس۔ چکوال کا تصور ان کے بغیر نامکمل ہے۔ افسوس کہ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔

اور سبق آموز تھی۔ اس فلم کے جملہ مناظر اور مکالمے بیڈ روم اور غسل خانے کے متعلق اور متصل ہی فلمائے گئے تھے اور کئی ایک مقامات پر تو فوٹو گرافر صاحب نے وہاں جا جھانکا تھا جہاں جھانکنے کی خواہش تو بر حق ہے مگر اسے دبانے کی کوشش بھی حتیٰ المقدور لازم ہے۔ مضمون کے لحاظ سے اس فلم میں ایسی وارداتوں کی کمی نہ تھی جن کو دیکھتے ہی ایک درد مند دِل سے "ہائے مر گیا" کی مخلصانہ ہوکیں اٹھتیں۔ لیکن حرام ہے جو ہزاروں تماشائیوں میں سے کسی ایک کے مُنہ سے ہائے کی ہ بھی نکلی ہو۔ سب کُچھ ہوتا دیکھتے رہے اور سب کُچھ پی گئے۔ بس ذرا زور سے دانت بھینچ لئے اور کرسی کے بازو مضبوطی سے پکڑ لئے۔ کہاں ہوتا اپنا بھاٹی گیٹ کا سینما کہ ادھر ہیروئن کو ہیرو ذرا نگاہِ شوق سے دیکھتا اور اُدھر سیٹیوں کا آرکسٹرا گونج اُٹھتا۔ اور پھر ہال کے کونے کونے سے جہاں سوز آہوں کا دھواں بلند ہوتا اور گریبان چاک ہونے لگتے۔ انگریزی زندگی ایسے ہنگاموں سے محروم ہے۔ وُہ جو فلمی شاعر نے زندگی کے ساز کے متعلق کہا ہے کہ بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔ دراصل انگلستان کی زندگی کے متعلق ہے ورنہ وطن میں تو زندگی کا ساز شکستہ ہونے پر بھی کھڑکتا رہتا ہے۔

خدا خدا کر کے آخر مانچسٹر کا سٹیشن آیا اور ہم گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر اس انتظار میں کھڑے ہو گئے کہ اگر کوئی استقبال کرنے آیا ہے تو کر لے۔

ہاضمہ، جو سنہری تمغے کا مستحق نکلا

اور استقبال کرنے خود قیامت آئی۔ اگرچہ تعارف پر پتہ چلا کہ باربرا پار کنسن ہے۔ ظالم مہ لقا ہی نہ تھی شریں ادا بھی تھی، سرو قامت ہی نہ تھی، محشر خرام بھی تھی۔ اس فتنہ رخ و رفتار کو دیکھ کر جملہ مسافروں میں وُہ ہلچل پیدا ہوئی جیسے سچ مچ عرصہ محشر میں ہوں لیکن اوروں سے زیادہ ہم اس کی زد میں تھے کہ یہ فتنہ رواں خطِ مستقیم میں ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ پھر ہمارے قریب تھم کر گویا ہوا:

"مُجھے یقین ہے آپ ہی کرنل خان ہیں۔ میں مس پار کنسن ہوں، باربرا پار کنسن۔"

ساتھ ہی باربرا نے اپنا بے آستین بازو لمبا کر کے ہمیں دعوتِ مصافحہ دی۔ ہم نے اپنا ہاتھ باربرا کے ہاتھ میں دیا تو اس کی گرفت میں ہاتھ کی بجائے اپنے سینے کے شمال مغربی کونے میں محسوس ہوئی۔ یہ ہمارا استقبال نہ تھا۔ استحصال تھا۔ ہم نے اپنے میزبانوں کو اپنے نمائندوں کے حسنِ انتخاب پر ایک دو موقعوں پر پہلے بھی فُل نمبر دیئے تھے لیکن باربرا پار کنسن دیکھی تو سونے کا تمغہ دینے کو جی چاہا۔ آخر وُہ تو سونے سے بھی زیادہ قیمتی جنس پر ہاتھ ڈال چکی تھی۔ ہم نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"میرا نام ہی خان ہے۔ اور کیسے مزاج ہیں آپ کے مس پا کنسن۔"

”فائن۔۔امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہو گا۔“

”سفر بھی گوارا تھا لیکن منزل کُچھ زیادہ خوشگوار معلُوم ہوتی ہے“

”سچ؟ مانچسٹر اتنا پسند ہے آپ کو؟“

”جی ہاں، لیکن منزل میں مانچسٹر کے علاوہ بھی کُچھ شامل ہے۔“

باربرا پارکنسن ہماری بات کا کنایہ پا کر مسکرائی اور بولی:

”مہمان کو ایسے شگفتہ موڈ میں پانا کس قدر لطف کی بات ہے!“

”آپ سے مل کر کسی مہمان کا موڈ مرجھایا بھی رہ سکتا ہے؟“

”یہ تو مہمان ہی جانئیں۔“

یہ الفاظ اور ہنسی باربرا کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلے۔ پھر اس پہلو سے مطمئن ہو کر کہ اجنبی سے خراج وصول کر لیا ہے، مضمون بدل کر بولی:

”چلیں، آپ کو کھانا کھلائیں۔ ڈیڑھ بج رہا ہے لیکن پہلے سامان ہوٹل میں رکھ آئیں۔“

سٹیشن سے نکل کر گرینڈ ہوٹل پہنچے جہاں ہمارے لئے ایک کمرہ ریزرو تھا۔ سامان رکھا اور کھانے کے لئے کسی موزوں ریستوران کی تلاش میں تھے۔ باربرا بولی۔

”مُجھے یقین ہے آپ ہندوستانی کھانا پسند کریں گے؟“

کہا: ”مُجھے یقین ہے کہ میں پاکستانی کھانا پسند کروں گا۔“

بولی: ”میں سمجھی۔ میں معافی چاہتی ہوں۔“

اور ہم نے ہنس کر کہا: ”معاف کر دیا۔ صرف آئندہ را احتیاط۔“

تھوڑی دور جا کر کار ایک ریستوران کے سامنے رُکی جس کی پیشانی پر لکھا تھا: ”نور محل: لذیذ ہندوستانی کھانوں کا مرکز۔“ لیکن اندر سے خالص پاکستانی تھا: مالک جسیم الدّین، باورچی تلمیند الرّحمٰن، بیرا غوث الحسن اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے طغرے ان پر مستزاد! گویا جو کُچھ نقشے کے متعلق کہا گیا تھا اور محل کے متعلق بھی کہا جا سکتا تھا۔

قلب او مومن دماغش کافر است

کھانے کے لئے آرڈر دینے کا وقت آیا تو ہم نے قیادت سنبھالنا چاہی۔ آخر پاکستانی کھانوں کا ہم سے بڑا رمز شناس کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مینو ہاتھ میں لئے ہم باربرا کو مختلف پکوانوں کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے لگے، لیکن دیکھا کہ باربرا ہماری تقریر سے کُچھ محظوظ نہیں ہو رہی۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگی میں آپ کو مایوس تو نہیں کرنا چاہتی لیکن پاکستانی کھانوں کے متعلق آپ کا علم ذرا مبتدیانہ سا لگتا ہے اور پھر اس انگریز

لونڈیا نے انہی موضوعات کو جن پر ہم مدھم سی روشنی ڈال چکے تھے، پوری فلڈ لائٹ میں نہلا دیا۔ معلُوم ہوا باربرا گزشتہ تین برس سے نور محل کی سرپرستی کر رہی ہے اور اگر اب تک نور محل کے کسی راز سے نا آشنا ہے تو وُہ راز آشنائی کے قابل ہی نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باربرا نے داخل ہوتے ہی بیرے کو نام لے کر پکارا تھا اور جواب میں وُہ بھی محرمانہ کورنش بجالایا تھا اور ہمیں کونے کی اس میز تک لے گیا تھا جو بظاہر باربرا کی پسنّدیدہ نشست تھی اور جس پر ایک روپہلی شمعدان میں موم بتی جل رہی تھی۔۔۔ ہم یُوں بھی باربرا کے مہمان تھے۔ باربرا کے طعام شناس پس منظر سے مرعوب ہو کر خاموش بیٹھ گئے پھر اس کے اشارے پر بیرے حرکت میں آ گئے اور میز کراں تا کراں بھرنے لگی۔ ہم اچھے کھانے کے قدرداں ہیں لیکن پُرخوری ہمارا شیوُہ نہیں اور اس میز کو تو پُرخوری کی نیّت کے باوجود خالی کرنا ہمارے شکم و دہن کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد جب ہم نے کھانے سے ہاتھ کھینچا تو میز کا چہرہ بدستور پُررونق تھا۔ لیکن باربرا اپنے جملہ اوزاروں کے ساتھ ہنوز سرگرمِ عمل تھی اور بڑی چابکدستی سے مختلف پلیٹوں کو مسمار کر رہی تھی۔ ہم چند منٹ کے لئے ہاتھ دھونے کے لئے چلے گئے لیکن واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز کی بساط سرتاسر اُلٹ چکی ہے اور بس اک شمع رہ گئی ہے سو وُہ بھی خموش ہے۔ ہمیں آج معلُوم ہوا کہ تین سال کی مسلسل پریکٹس خواہ کھیلنے کی ہو یا کھانے کی، کیا رنگ لاتی ہے۔ ہم نے زندگی میں بہت سے حسین دیکھے ہیں

اور بے شمار پیٹو بھی۔ لیکن حسین الگ اور پیٹو الگ۔ اس قدر یکجا پیٹو حسینہ آج تک نہ دیکھی تھی۔ باربرا اسے اب تھوڑی سی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ کہا۔

"باربرا، کُچھ دیر پہلے میرا خیال تھا تمہیں ایک سونے کا تمغہ دوں۔ اب جی چاہتا ہے دو سونے کے تمغے پیش کروں۔"

"اکٹھے دو تمغے؟ کس تقریب میں؟"

"ایک تو تمہارے حسن کے لئے۔"

"اووں۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے اور دوسرا؟"

"تمہارے ہاضمے کے لئے۔"

"مُجھے دُوسرے پر زیادہ فخر ہو گا۔"

اور یہ کہہ کر چھاتی اُبھار کر ہمارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہم نے باربرا کو تمغے کے انتظار میں کھڑے دیکھا تو بے بسی کے عالم میں۔۔۔ یعنی بے تمغی کے عالم میں۔۔۔ اپنی قسمت کو رو لیا! کاش ہمارے پاس اور کُچھ نہ ہوتا ایک تمغہ ہی ہوتا۔ صرف ایک تمغہ! اور ہم اسے اس کے صحیح مقام پر پہنچا کر سُرخرو ہو جاتے، لیکن آج ہی گھر میں بوریا نہ

ہوا اور خدا جانے غالب نے اس دن کیا کیا ہو گا ہمیں بھی نہ سوجھا تو اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اندر سے بند مُٹھّی نکال کر باربرا کے سینے پر لے جا کر کھول دی اور کہا:

”فی الحال تو یہ لیجئے دل! بعد میں تمغہ دے کر بدل لیں گے۔“

باربرا ہماری اس حرکت پر جھوم اُٹھی اور بالکل مسحور ہو کر بولی:

”It sounds like Omar Khayyam۔This is chaming ۔“

”ہم نے دِل میں کہا: اری، تو ایک عمر خیام کی بات کرتی ہے۔ ہمارے ہاں ہزاروں شاعر دِل پھینکنے کے نسخے لکھ رہے ہیں اور ہم نے تو ایک بالکل سادہ اور مفرد سا نسخہ آزمایا ہے ورنہ شاعری میں تو بڑے بڑے پُر تکلّف مرکّبات موجود ہیں۔ ایک نمونہ ذہن میں آیا بھی کہ

اک ذرا آپ کو زحمت تو ہو گی

آپ کے پاؤں کے نیچے دِل ہے

لیکن یہ ہم نے کسی RAINY DAY (مشکل وقت) کیلئے رکھ دیا اور باربرا کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

”باربرا۔ معلُوم ہوتا ہے تمہیں عمر خیام پسند ہے۔“

"پسند؟ مُجھے اس سے عشق ہے!"

پھر لہر میں آ کر خیام کی ایک رباعی کا انگریزی ترجمہ الاپنے لگی۔ ترجمے میں عمر خیام کم تھا اور ترجمان یعنی فٹس جیرلڈ زیادہ لیکن اس انگریزی ترجمے کا سوز و گداز بھی ناقابلِ انکار تھا۔ باربرا رباعی مکمل کر چکی تو ہم کہ لاہور کے شاعروں کے تربیت یافتہ تھے، جھوم جھوم کر داد دینے لگے۔ "مکرر۔" "پھر عطا ہو" بلکہ "سبحان اللہ" کا استعمال بھی کیا۔ باربرا ہمارے اندازِ تحسین سے اس قدر پسیجی کہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رُبائی دہرانے لگی۔ ہمارا دِل تو خیر ہمارے پہلو ہی میں تھا لیکن باربرا کا دِل یقیناً اپنی سیٹ پر نہ تھا۔

اتنے میں بیرا بل لایا۔ باربرا نے اپنے سرور کی روانی میں اسے وافر ٹپ دی۔۔۔ بل بالآخر سرکار نے ادا کرنا تھا۔۔۔ اور مکمل خیر سگالی کے موڈ میں غوث الحسن اور جسیم الدّین کو ٹاٹا کرتی ہوئی ریستوران سے باہر نکلی۔ کار میں بیٹھے تو گھڑی دیکھ کر بولی:

"اب تین بج رہے ہیں۔ اگلا پروگرام پانچ بجے ہے۔ میں آپ کو دو گھنٹے آرام کرنے کو دیتی ہوں۔ پانچ بجے تیار رہئے گا۔"

"کسی مہم کے لئے؟"

”ٹیٹو[53] TATTOO کے لئے۔“

”فقط ٹیٹو کے لئے ؟“

”ٹیٹو تو بہانہ ہے۔ڈیوک آف ایڈنبرا آرہے ہیں۔“

ہم نے کہا: ”SO WHAT[54]“

ہمارے استغنا سے باربرا سراپا حیرت نظر آئی۔ بولی۔

”آپ سمجھے نہیں۔ میں کہہ رہی ہوں، پرنس فلپس آرہے ہیں۔ آج ہم انہیں قریب سے دیکھ سکیں گے۔“

”اسی لئے عرض کیا تھا کہ پھر ہوا کیا؟“

”تو آپ نہیں جائیں گے کیا؟“

”ضرور جائیں گے لیکن باربرا کی خاطر نہ کہ پرنس فلپس کیلئے۔“

---

53 فوجی اپنے کرتبوں کی نمائش اور تماشوں کو ٹے ٹو TATTOO کہتے ہیں۔

54 پھر ہوا کیا؟ بھرپور لاپروائی کے اظہار کے لئے انگریزی ترکیب۔

باربرا اس کی خوشامد پر نازاں تو بہت ہوئی لیکن بدستور حیران بھی تھی کہ ڈیوک کی آمد کی خبر سن کر ہم پھڑک کیوں نہیں اُٹھے تھے۔

ہم تو ففٹی ففٹی پر راضی تھے مگر۔۔۔

پچھلے پہر شہر سے باہر سٹیڈم میں گئے جہاں آدھا مانچسٹر اُمڈ آیا تھا۔ ہمارے لئے ممتاز مہمانوں کی صف میں جگہ مخصوص تھی یعنی شہ نشین کے بالکل قریب۔ ہماری وجہ سے باربرا کو بھی اسی صف میں بلکہ ہمارے پہلو میں جگہ ملی۔ پورے سوا پانچ بجے پرنس فلپس کی کار شہہ نشین کے سامنے آ کر رکی۔ شہزادے کا کار سے نکل کر حاضرین کی طرف دیکھنا تھا کہ جملہ خواتین کے مُنہ سے ٹھنڈی گہری اور لمبی آہوں کا کورس نکلا۔ اس کورس میں باربرا کی آہ الگ اور واضح تھی کہ ہمارے پہلو سے اُٹھی تھی۔ معلُوم ہوا کہ باربرا ڈیوک کو محض رعایا کی آنکھ سے دیکھنے نہیں آئی بلکہ اس کی وجہ کُچھ زیادہ بنیادی اور غیر سیاسی قسم کی ہے۔ لیکن فقط باربرا ہی شاہی کشش کی اسیر نہ تھی۔ جملہ میریاں اور مارگریٹیں اس دھاگے سے کھچی چلی آئی تھیں۔ چنانچہ پرنس فلپس کے ہوتے ہوئے کسی دُوسرے مرد کی دال گلنا۔۔۔ یعنی اگر وُہ دال گالنے کے ارادے سے آیا تھا۔۔۔ محال تھی۔ بہر حال یکّے بعد دیگرے فوجی ٹیمیں کرتب دکھانے لگیں لیکن سچّی بات ہے ہمارے لئے ان کرتبوں کی نسبت ان میموں کی بے تابیاں زیادہ باعثِ

کشش تھیں۔ چنانچہ ہم میمیں دیکھتے رہے، میمیں ڈیوک دیکھتی رہیں اور ڈیوک تماشا دیکھتے رہے۔ لیکن اس مثلث میں فقط ہمیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اوروں کی بے توجہی تو خیر؛ لیکن باربرا سے ہمیں ملائم سا شکوہ ضرور تھا۔ یہ نہیں کہ ہمیں باربرا سے شہزادے کے مکمل مقاطع پر اصرار تھا۔ جی نہیں۔۔۔ ہم تو باربرا سے صرف اتنا چاہتے تھے جتنا غالب نے بھی اپنی باربرا سے چاہا تھا۔

تم جانو تم کو غیر سے گر رسم وراہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

یعنی ہم تو ففٹی ففٹی پر راضی تھے لیکن جب تک پرنس فلپس موجود تھا کوئی میم، بشمول باربرا، ایک فی صدی پر بھی راضی نہ تھی۔

آخر خُدا خُدا کر کے وُہ وقت آیا جب اعلان ہوا کہ اب ٹیٹو کا آخری اور سرپرائز آئٹم Surprise Item پیش کیا جاتا ہے اور پھر اناؤنسر نے انتہائی ڈرامائی انداز میں کہا۔

"خواتین وحضرات۔ دُنیائے موسیقی کی محبوبہ۔ ویرالن۔"

ویرالن کا نام سنتے ہی تمام ہجوم نے جھوم جھوم کر تالیاں بجانا شروع کیں۔ خود ہم پر بھی اس نام نے ہلکا سا وجد طاری کر دیا کہ دفعتاً ہماری لفٹینی کے زمانے کی یادیں بیدار ہو

گئیں، جب ہم صحرائے لیبیا میں بی بی سی کے فورسز پروگرام میں ویرا کے گانے سُنتے اور سر دھنتے تھے اور ایک چاندنی رات خصوصاً یاد آئی جب قاہرہ کے ایک کیمپ میں ویرا نے بنفسِ نفیس ہمارے ٹامیوں کے سامنے گایا تھا اور کلیجہ چیر کر رکھ دیا تھا۔ ان دِنوں ویرا اتنی ہی حسین تھی جتنی باربرا آج کل۔ ہم بے تابی سے انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں ویرا کے ساتھ گزشتہ پچیّس سالوں نے کیا سلوک کیا ہے اور جب آخر کہیں پردۂ غیب سے نمودار ہو کر خراماں خراماں شہہ نشین کے بالکل سامنے آکھڑی ہوئی تو پتہ چلا کہ پچیّس سالوں نے ویرا کو چھوئے بغیر، ریشم میں لپیٹے رکھا ہے۔ ویرا پہلے سے بھی چند سال کم عمر لگتی تھی۔ اگر ہمیں وطن میں ملکہ ترنم نور جہاں کے حُسن اور عمر کے تناسب کا علم نہ ہوتا تو یقین نہ آتا کہ حسن اس قدر پائدار بھی ہو سکتا ہے۔ ویرا کوار گندل کی طرح ہلکی پھلکی ہی نہ تھی، گلاب کی کلی کی طرح بالکل تازہ اور شگفتہ بھی تھی۔ ہم نے ویرالن سے ذاتی تعلقات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سب سے الگ اور خصوصی تالی بھی بجائی۔ اس پر باربرا نے ہم پر سوالیہ بلکہ اعتراضیہ انداز میں دیکھا۔۔ ہم نے پرنس فلپس کے سلسلے میں بدلہ لیتے ہوئے کہا:

”واہ واہ، کس قدر حسین لڑکی ہے یہ ویرالن!“

باربرا بولی: ”لڑکی نہیں بڑھیا کہو۔“

”بات عمر کی نہیں، حُسن کی ہے اور ویرا کا حُسن عمر کا محتاج نہیں۔“

”صرف پلاسٹک سرجری کا محتاج ہے۔“

”اگر یہ سرجری ہے تو اس سرجری پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔“

”ارے تمہیں اس عورت سے پیار تو نہیں ہو رہا؟“

”فقط پیار؟ عشق کہو، عشق!“

عشق تو خیر ہمیں کیا ہونا تھا اس مکالے کو طول دے کر ہم اپنے اصلی منصوبے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ یعنی باربرا کے دماغ سے پرنس فلپ خارج کر رہے تھے۔ پھر دفعتاً ویرا نے گانے کی ابتدا کی اور گیت بھی وُہ چنا جو جنگ کے دنوں میں محاذ پر سپاہیوں اور وطن میں محبوباؤں کے دِلوں کی دھڑکن بن گیا تھا:

[55]I Don't Know When

I Don't Know Where

But We'll Meet Again, One Sunny Day

---

[55] معلُوم نہیں کب، معلُوم نہیں کہاں، لیکن ایک بار ملیں گے ضرور۔

ویرا کی آواز میں وُہی دیرینہ جادو تھا۔ جب اس نے گیت کا یہ حصّہ دہرانا شروع کیا تو کوئی ایک لاکھ کا مجمع مع ہمارے مگر سوائے باربرا کے ویرا کے ساتھ گانے لگا۔ اور باربرا پرنس فلپ کی بجائے ہمارا گاتا ہوا مُنہ تکنے لگی۔ گویا ہم نے باربرا کے دماغ کے علاوہ اس کی نگاہ سے بھی ہر رائل ہائی نس کو خارج کر دیا تھا۔

باربرا رات کے کھانے تک ڈیوک کو تو بھول چکی تھی لیکن ہمارا ویرا لن والا قصور نہیں بھولی تھی۔ بس میٹھے میٹھے گلے کرتی رہی اور ہم مزے سے سُنتے رہے۔ باربراؤں سے گِلے کرانے میں بھی مزا آتا ہے۔ غالب نے غالباً اسی لئے نصیحت کی ہے کہ یار سے چھیڑ چلی جائے اسد۔۔۔ لیکن غالب نے یہ کبھی نہیں کہا کہ چوبیس گھنٹے ہی چلی جائے اسد اور بیچ میں کوئی صلح کا مفید وقفہ ہی نہ ہو۔ چنانچہ ہم نے غالب کا اندرونی منشا سمجھتے ہوئے ابتدائی چھیڑ کے بعد بتدریج ویرا لن کی بے شمار خامیوں کا اعتراف شروع کیا۔ اور بتدریج باربرا کے گِلے دُھلنے لگے۔ آخر جب مانچسٹر کلب کی لمبی شام تمام ہوئی تو باربرا نہ صرف اپنی رنجشیں بھول چکی تھی بلکہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی، سانسوں میں خوشبو اور زبان پر نغمے!

سڑک کے موڑوں میں حکمت ہے

انگلستان میں شرفا کا دو تین بجے شب سے پہلے سو جانا اور نو دس بجے سب سے پہلے جاگ اُٹھنا مشکل ہی نہیں، مذموم بھی ہے۔ لہٰذا دوسری صُبح نو بجے کے قریب ہمارے کانوں میں ٹیلیفون کی گھنٹی گونجی تو ہم نے بمشکل ایک آنکھ کھولی اور ایک مغلظ سے احتجاج کا مضمون سوچتے ہوئے ریسیور اُٹھایا لیکن اُدھر سے باربرا کی مانوس آواز آئی جو گویا ہم سے بھی کمتر وقت سوئی تھی۔ لہٰذا احتجاج کو نگلتے ہوئے اور اپنی اونگھ میں مٹھاس ملاتے ہوئے گڈ مارننگ سے ملتی جلتی آواز نکالی۔ لیکن باربرا کی جوابی ملامت سے ہماری دُوسری آنکھ بھی کھل گئی۔۔۔ باربرا نیچے ہوٹل کے دروازے پر موٹر کھڑی کر کے لونج میں ہمارا انتظار کر رہی تھی اور وُہیں سے بول رہی تھی۔۔۔ آخر ہماری معذرت کو نیم قبول کرتے ہوئے اس نیم آمرہ نے ہمیں پندرہ منٹ میں حاضرِ خدمت ہونے کا حکم دیا۔ عام حالات میں اتنے قلیل وقت میں تو ایک مفصّل جمائی بھی نہیں لی جا سکتی تھی لیکن یہ خاص حالات تھے۔ دفعتاً ہمارے اندر ایک خفیہ کمپیوٹر کام کرنے لگا اور باربرا کی گھڑی پر پندرھواں منٹ ٹک کرنے والا ہی تھا کہ ہم گریبان کے بٹن بند کرتے حاضرِ خدمت ہو گئے۔ اس کارکردگی کے عوض باربرا سے سرِ بازار ایک پیار بھری شاباش حاصل کی اور درونِ کار ایک بہار بھری مسافت کا آغاز کیا۔ چیسٹرٹن کا کہنا ہے

بل کھاتے ہوئے انگریز شرابیوں نے بل کھاتی ہوئی انگریزی سڑکیں بنائی ہیں[۵۶]۔ شاید چیسٹرٹن نے تو یہ شکوہؔ کہا ہو لیکن بار بر اہم نشیں ہو، کار تیز رفتار ہو اور قدم قدم پر بل کھاتے موڑ ہوں تو یہ مقام شکوے کا نہیں، شکر کا ہوتا ہے کہ ہر موڑ پر ہم نشینی ہم آغوشی کو جا چھوتی ہے۔ سیدھی ہموار سڑک میں عافیت تو بہت ہے مگر رومان ناپید ہے اور زندگی فقط خیر خیریت کا نام نہیں۔

مانچسٹر کے بعد ہماری منزل چسٹر تھی۔ مانچسٹر سے تو ہمیں کئی نسلوں سے آشنائی تھی کہ پاک و ہند کی تن پوشی کا واحد ٹھیکہ دار رہ چکا تھا لیکن چسٹر کا کبھی نام بھی نہ سُنا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ قصور چسٹر کا نہیں، ہماری کم علمی کا ہے کہ یہ شہر اپنی شہرت کا علیٰحدہ جواز رکھتا ہے۔ ایک تو اس تاریخی فصیل کی وجہ سے جو اس نے کئی صدیاں قبل اپنے ارد گرد تعمیر کی اور دُوسرے اس چھاؤنی کی وجہ سے جہاں برطانوی ویٹرن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ چھاؤنی میں تو ہمیں بہر حال جانا تھا، فصیل تک ہمیں بزور لے جایا گیا لیکن اس کے متعلق ذرا بعد میں۔

---

[۵۶] THE ROLLING ENGLISH DRUNKARD MADE THE ROLLING ENGLISH ROAD G.K. CHESTERTON

ویسٹرن کمانڈ کی وسیع پارک میں باربرا نے کار روکی جہاں میجر لائیڈ کو ہمارا استقبال کرنا تھا۔ ہم کار سے نکلے۔ کُچھ فاصلے پر میجر لائیڈ آتے دکھائی دیئے تو اچانک باربرا نے ہماری طرف مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا اور کہا:

"گُڈ بائی اور شکریہ اس خوش گوار وقت کا جو آپ کے ساتھ گزارا۔"

"کیا مطلب؟ یعنی خوشگوار وقت آگے نہیں چلے گا۔"

"اس سے آگے نہیں۔ میری ڈیوٹی یہیں تک تھی۔"

"یعنی ڈیوٹی ختم اور دوستی ہضم؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ پیچھے مانچسٹر میں مجُھے ایک اور مہمان کا استقبال کرنا ہے۔"

"یعنی ایک اور خوشگوار وقت کے شروع ہونے کا امکان ہے؟"

"ہے تو سہی۔ دُعا کرو کوئی دِلچسپ آدمی ہو۔ مجُھے ڈل DULL لوگوں سے وحشت آتی ہے۔"

یعنی وہاں معیار دِلچسپ ہونا تھا۔ ہم ہوں تم ہو یا کوئی میر صاحب ہوں۔ یہ باربرا نہ تھی۔ بھونرا تھی اور شوخی ملاحظہ ہو کہ خود ہم سے رقیب کے دِلچسپ ہونے کی دُعا منگوا رہی تھی۔ ہم اتنے ماڈرن عاشق نہ تھے۔ کہا:

”اللہ کرے وُہ ڈل بھی ہو اور روسیاہ بھی۔“

بولی: ”میری خاطر ہی دُعا دے دیتے۔“

ایک دُعائیہ شعر یاد آیا: ”یہ دُعا ہے آتش عشق میں تو بھی میری طرح جلا کرے۔“

یہ نہیں کہ ہم سچ مچ باربرا کے عشق میں بھڑک کر جل رہے تھے۔ بس معمولی سے جھلسے تھے۔ شاعر کا مصرع فقط ہمارے جذبات کے قریب سے گزرتا تھا، جڑ دیا۔ باربرا شاعر کا کلام تو نہ سمجھ سکی لیکن ہماری شکل دیکھ کر اس کا منشا پا گئی اور ہمیں مصنوعی تسلی دیتے ہوئے ویرلن کا گیت گنگنانے لگی:

I Don't Know When,

I Don't Know Where,

But We'll Meet Again

One Sunny Day”

اور پھر کھکھلا کر ہنس دی کہ ہمارے ویرالن والے قصور کا بھی کامیاب بدلہ لے چکی تھی۔۔۔ اتنے میں میجر لائیڈ آ گئے اور باربرا نے ہمارا تعارف کرایا۔ خیریت مزاج پوچھنے کے بعد لائیڈ بولے:

"سنائیے سفر کیسا رہا؟ امید ہے باربرا نے آپ کا ہر طرح خیال رکھا ہو گا۔"

کہا: "جی ہاں۔ جہاں تک ان کی ڈیوٹی اجازت دیتی تھی۔"

الائیڈ بولا: "باربرا۔ اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا تو پچھلے مہمان نے بھی شاید یہی کہا تھا۔"

باربرا نے جواب میں فقط قہقہہ لگایا اور ہمیں ٹاٹا کرتی ہوئی اور اپنی انگلیاں ہماری سمت میں چوم کر ہوا میں پھیلاتی ہوئی کار میں جا بیٹھی۔ گویا ہمیں بتا رہی تھی کہ مسافر چلتا بھلا اور مسافر نے مجبوراً جوابی ٹاٹا کیا۔ اگرچہ مسافر کا دِل ایک ناکام فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بول رہا تھا کہ "اے بے وفا تو وُہی باربرا ہے جو تھوڑی دیر پہلے کار میں جھومتی اور جھولتی تھی اور جو کل شب کلب میں کھلتی اور کھیلتی تھی؟ تجھے ہو کیا گیا؟ جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی۔۔۔" لیکن یہ سب گلے شکوے دِل ہی میں کیا کہئے۔ بیرونی طور پر ہم نے کسی عاشقانہ بے چینی کا اظہار نہ کیا اور میجر لائیڈ کے ساتھ ہو لئے۔

کرنل ٹیلر کی جگہ فوج ہے یا سرکس؟

ہمارے اصل میزبان کرنل ٹیلر تھے۔ لائیڈ ہمیں ان کے دفتر میں لے گئے۔ کرنل ٹیلر سے ملاقات ہوئی تو انہیں شنید کے مطابق متواضع اور متبسّم پایا لیکن شنید سے کہیں

زیادہ متکلّم اور متفنی نکلے۔ باتونی آدمی کا ایک فائدہ ہوتا ہے، وُہ اپنے حِصّے کی باتیں بھی کرتا ہے اور سُننے والے کے حِصّے کی بھی۔ یعنی دو رویہ بولتا ہے۔ چنانچہ کرنل ٹیلر سے باتیں کرتے ہوئے ہمارا کام فقط وقفے وقفے سے چائے کا گھونٹ پینا تھا اور گھونٹوں کے درمیان مسکرانا بلکہ کھکھلا اُٹھنا۔ کرنل ٹیلر کی بات بات میں لطیفہ تھا۔ ایک مرد کی صحبت میں گرم چائے اور گوارا گپ میسر ہو تو اور کیا چاہیے؟ لیکن ہمارا چسٹر آنے کا اصل مقصد کرنل ٹیلر کے لطیفے سُننا نہ تھا بلکہ ان کے توسط سے فوجی لائبریری دیکھنا اور ان کی لائبریرین مسز سمتھ سے ملنا۔ چنانچہ ایک دو مرتبہ کرنل صاحب کی توجہ کا رُخ لائبریری کی طرف موڑنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کی روانیٔ گفتار ہماری کوشش کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ بہر حال جب آپ اپنے نصف لطیفے سُنا چکے تو اس وعدے پر کہ باقی نصف کھانے پر سناؤں گا، ہمیں اچانک لائبریری دیکھنے کی اجازت دے دی اور ان الفاظ میں:

"تم ہماری چائے پی چکے۔ اب جاؤ مسز سمتھ کا دودھ پی لو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" ہم نے چونک کر کہا۔ "اگر یہ بات مسز سمتھ سُن لے تو کیا کہے؟"

"معلُوم نہیں، لیکن تم اتفاقاً اُدھر ہی جا رہے ہو۔ پوچھتے آنا۔"

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ لائبریری پہنچے۔ مسز سمتھ کو دیکھا تو ایک ماں ماتا قسم کی عورت نکلی۔ ظاہر ہے کہ کرنل ٹیلر کی لطیفہ گوئی اپنی بوڑھی لائبریرین کے ضمن میں کسی قدر بے لگام ہو گئی تھی۔ مگر کیا یہ بے لگامی اتفاقی تھی یا ارادی؟ مسز سمتھ نے یہ معما جلد ہی حل کر دیا۔ بولی:

"کرنل خان میں ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہوئی۔۔۔"

"کہ کرنل ٹیلر آپ سے چمٹے رہے۔"

"جی ہاں، جی نہیں۔۔۔۔"

"پھر ایک گھنٹہ مغز چاٹنے کے بعد کہا کہ اب جاؤ اور جا کر مسز سمتھ کا دودھ پی لو۔"

ہمارے مُنہ سے ایک بار پھر کپکپاتی سی لاحول نکلی لیکن جلد ہی سنبھل کر کہا:

"دراصل بات یہ ہے مسز سمتھ۔۔۔۔"

"کہ کرنل ٹیلر بیہودہ اور باتونی بھڑوا ہے۔"

"مسز سمتھ، اصل میں کرنل ٹیلر۔۔۔۔۔"

"کرنل نہیں، مسخرا ہے، اس کی صحیح جگہ فوج نہیں، سرکس ہے۔"

بار بار بات کٹ جانے سے ہمارا دم پھُولنے لگا۔ ذرا موقع ملا تو کہا:

"پلیز، مسز سمتھ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

مسز سمتھ کُچھ کہنے کو تھی کہ رُک گئی۔ ایک گہرا سانس لے کر بولی:

"میں معافی چاہتی ہوں۔ ٹیلر کی وجہ سے آپ کی مزاج پرسی نہ کر سکی۔ مزاج شریف؟"

"شکریہ۔ آپ کی لائبریری تو ماشاءاللہ بڑی شاندار ہے۔"

لائبریری کا ذکر محض مسز سمتھ کی خوشنودی کیلئے نہیں بلکہ کرنل ٹیلر کا ذکر زائل کرنے کیلئے کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ مسز سمتھ کی طبیعت ایک لمحے میں بحال ہو گئی اور بولی:

"آپ کو پسند آئی میری لائبریری؟"

"بے حد۔"

میرے پاس کُچھ کم ایک لاکھ کتابیں ہیں۔ ایسی بڑی لائبریری تو نہیں پر اچھی ہے۔"

ہمیں یاد آیا کہ پیچھے وطن میں ہماری کمانڈ لائبریری کی کائنات بمشکل دس ہزار کتابیں تھی۔ مرعوب تو بہت ہوئے مگر اپنی خفت پر پردہ ڈالتے ذرا بے نیازانہ انداز میں کہا:

"ایک لاکھ؟ اووں۔ خاصی تعداد ہے۔"

مسز سمتھ جھٹ بولی: "آپ کی لائبریری میں کتنی کتابیں ہیں؟"

اب کوئی افسر مملکت کے راز فاش کرنے کا مجاز نہیں۔ علاوہ ازیں ہم برطانیہ کے بے بضاعت جزیرے سے مات کھانا چاہتے تھے نہ ایک عورت ذات سے۔ فوراً ناموسِ وطن کی خاطر اصل تعداد کو دس سے ضرب دی۔ جواب ضرب ایک لاکھ پایا۔ اسے رد کیا۔ پندرہ سے ضرب دی۔ جواب ڈیڑھ لاکھ نکلا۔ قبول کیا اور آنکھ جھپکے بغیر کہا۔

"لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ۔"

"پھر تو آپ کی لائبریری دیکھنے کے قابل ہو گی۔"

"آپ کی دُعا سے مرجع خاص و عام ہے۔"

اس ایک جواب سے مسز سمتھ کی برتری کا قلع قمع کر دیا۔ پھر ہم نے طاقت کی پوزیشن سے وُہ سکہ بند سوال پوچھنا شروع کئے جو ہر لائبریرین سے پوچھا کرتے تھے:

"آپ کی لائبریری میں ہر روز کتنے آدمی آتے ہیں؟"

"سو سے دو سو تک۔"

ہمیں یاد آیا کہ ہمارے لائبریرین کی آنکھیں قارئین کی راہ تکتے تکتے سفید ہو گئی تھیں اور جس روز چھٹے کے بعد ساتواں آدمی آجاتا تھا، غریب کی بینائی کو افاقہ ہونے لگتا تھا۔ گفتگو جاری رکھی۔

"آپ لوگوں کو لائبریری کی طرف کس طرح راغب کرتی ہیں؟"

"ہمارا مسئلہ لوگوں کو راغب کرنے کا نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ راغب لوگوں کو لگام دینے کا ہے۔"

ہمیں اپنے لائبریرین کی وُہ تجویز یاد آئی کہ "اگر ہر کتاب کے ساتھ ایک رس گلّا مفت اشو کر دیا جائے تو شاید افزائشِ رغبت کا باعث ہو۔"

کہا: "آپ کے ہاں کس قسم کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں؟"

"سینئر لوگ اکثر پیشہ ورانہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ مگر نوجوان فکشن اور پوئٹری بھی مانگ لیتے ہیں۔"

"قدرتی بات ہے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی پسند میں یہی فرق ہونا چاہئے۔"

"مگر کرنل ٹیلر اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وُہ فقط ایک کتاب بار بار پڑھتا ہے۔ کوئی بیس مرتبہ لائبریری سے لے چکا ہے۔"

"کون سی کتاب؟"

"THE DIRTIEST JOKES OF THE WORLD"[۵۷]۔

ہمارے مُنہ سے بے تکلفی میں نکلا۔ "نہیں تو!"

بولی: "بالکل سچ ہے۔ اسی لئے تو دُنیا بھر میں غلیظ ترین دماغ کا مالک ہے۔"

گفتگو پھر لچھے لچھے کرنل ٹیلر کی سمت جا رہی تھی جو ہر چند کہ خاصی کراری تھی تاہم ہمارے مشن کے پیشِ نظر ذرا بے وقت تھی۔ مسز سمتھ کی زبان کی تلوار کو اپنے محبوب شکار، ٹیلر، کے گلے سے جدا کرنا آسان نہ تھا لیکن ہم نے ایک متبادل موضوع پیش کیا۔

"کیا میں آپ کی خوبصورت لائبریری کا چکر لگا سکتا ہوں۔"

مسز سمتھ لفظ خوبصورت کی آواز پر آناً فاناً پگھل گئیں اور ٹیلر کو نیم بسمل چھوڑ کر ہمیں لائبریری دکھانے لگیں۔ الماریُوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے مسز سمتھ اپنی

---

[۵۷] دُنیا کے غلیظ ترین لطیفے۔

کتابوں کے کوائف اس پیار سے، اس لاڈ کے ساتھ بتانے لگیں گویا اپنی سہیلیوں سے تعارف کرا رہی ہوں۔ ایسے محبّت بھرے تعارف کے بعد ان کتابوں یا بدیگر الفاظ مسز سمتھ کی سہیلیوں کو سینے سے لگانے کو جی چاہا۔ مسز سمتھ کے ساتھ کتابیں دیکھتے دیکھتے بہت وقت گزر گیا لیکن اس وقت تک احساس نہ رہا جب تک میجر لائیڈ نے آ کر یاد نہ دِلایا کہ لنچ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ مسز سمتھ سے رخصت ہوئے تو محسوس ہوا کہ زندگی میں ایک حقیقی فنکار سے یادگار ملاقات ہوئی ہے۔ پھر لنچ کی میز پر جا بیٹھے تو کرنل ٹیلر نے لطیفوں کی دُوسری کھیپ کھول دی۔ ملاقات یہ بھی یادگار تھی کہ کرنل ٹیلر بھی ایسے حقیر فنکار نہ تھے، فقط یہ کہ ان کا میدان ذرا مختلف تھا۔

وال کے معنی محض دیوار نہیں

لنچ کے بعد ہم میجر لائیڈ کی سپردگی میں تھے۔ ان کا فن چسٹر کی سیر کرانا تھا اور وُہ بھی اپنے فن میں یکتا تو تھے لیکن خرابی یہ تھی کہ آج ان کے فن کا نزلہ ہم پر گرنے والا تھا۔ انگریز طبعاً تاریخی مقامات کا شوقین اور کھنڈروں کا دِلدادہ ہے۔ معمر ماں باپ کے سوا وُہ ہر معمر چیز کی پوجا کرتا ہے۔ لائیڈ نے لنچ سے فارغ ہوتے ہی ہمیں دعوت دی۔

"آیئے کرنل خان۔ آپ کو وال WALL دکھائیں۔"

چیسٹر میں وال کے ایک ہی معنی ہیں: شہر کی فصیل۔ عام دیواروں کو مالک دیوار کے نام سے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ ہمیں فصیل دیکھنے کا خاص شوق نہ تھا۔ کہا

"میجر لائیڈ، کھانے کے بعد ذرا آرام نہ کر لیا جائے۔"

بولا۔ "آرام کرنے کو عمر باقی ہے۔ وال دیکھنے کا موقع پھر نہیں آئے گا۔ آیئے۔"

ہم نے ایک دوسرا حربہ آزمایا۔

"میجر لائیڈ، میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید تم گھر جانا چاہو۔ تمہاری بیوی انتظار کر رہی ہو گی۔"

بولا: "وُہ مر چکی ہے۔"

مُجھے شک گزرا کہ اگر وُہ نیک بخت زندہ بھی ہوتی تو یہ ترجیح دیوار ہی کو دیتا۔ ایسے آدمی سے بحث کرنا دیوار سے سر پھوڑنا تھا۔ بہرحال گفتگو میں یہ گلے کا نہیں، ہمدردی کا مقام تھا کہ غریب کی بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ ہم نے ہمدردانہ لہجے میں کہا:

"بڑا افسوس ہے۔ وُہ کب مریں؟"

بولا: "مری نہیں دراصل بھاگ گئی ہے۔ لیکن بھاگی یا مر گئی، ایک ہی بات ہے۔"

ایک ہی بات تو نہ تھی۔ بھاگنے اور مرنے میں بڑا واضح فرق ہے بشرطیکہ اس فرق کو محسوس کرنے والا دِل بھی ہو۔ ہم نے لائیڈ کے چہرے پر دیکھا کہ مردانگی کی کوئی تحریر رقم ہے یا نہیں۔ کوئی ایسی تحریر نظر نہ آئی۔ چہرے کے علاوہ ان کی دیوار پرستی پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس شکل اور شوق کے ہوتے ہوئے مسز لائیڈز نے بھاگ کر کوئی ایسا بڑا گناہ بھی نہیں کیا۔ بہر حال میجر لائیڈ بیوی کا مستحق نہ سہی، ہمدردی کا مستحق ضرور تھا۔ ایک مظلوم اور زن مرید خاوند کو دیکھ کر کسے ترس نہیں آتا؟۔ چنانچہ دعوت قبول کرنے سے زیادہ رحم کھا کر میجر لائیڈ کے ساتھ چل پڑے۔

فصیل کے پاس پہنچے۔ دیکھی۔ نیچے سے اُوپر اور دائیں سے بائیں اور سمجھے کہ وال دیکھنے کا فعل ختم ہو گیا ہے۔ لیکن لائنڈ نے دفعتاً اُوپر جاتی ہوئی ایک سو سیڑھیوں میں سے پہلی پر قدم رکھا اور ہم پر اس توقع سے نگاہ ڈالی کہ پیچھے اس امام کے ہم بھی سیڑھی پر قدم رکھیں۔ اب اگر ہمیں ہمالہ سر کرنے کا شوق ہوتا تو اپنے وطن ہی میں کر چکے ہوتے۔ چنانچہ دِل نے تو بہت روکا مگر ہم مروّت میں انکار نہ کر سکے۔ لائیڈ خوش ہو کر بولا:

”اصل شے فصیل نہیں بلکہ وُہ نظارہ ہے جو فصیل کی چوٹی سے نظر آتا ہے۔“

اُوپر پہنچے تو نظارا بے شک دِلفریب تھا لیکن جس رفتار سے ہمارا دِل چل رہا تھا اسے فریب کھانے کی فرصت نہ تھی۔ دم لے چکے تو لائیڈ فصیل کے اُوپر بنی ہوئی سڑک پر آگے بڑھنے لگا۔ دُوسرے لفظوں میں ہمیں دعوت دی جارہی تھی کہ اس چار میل لمبی چوکور فصیل پر پیدل چل کر شہر کا طواف کریں۔ لائیڈ بحیثیت خاوند ناکام سہی لیکن بحیثیت پیادہ خاصا کامیاب تھا۔ ہم ہرچند کہ بہت کامیاب پیادے نہ تھے تاہم پاکستانی کرنیلوں کی عزت کا سوال تھا۔ چیلنج قبول کیا اور چار میل لمبی سڑک پر عزتِ کرنیلی تھامے، اپنے فگار پاؤں سے حکایتِ خونچکاں لکھنا شروع کی۔ نصف راہ طے کرنے کے بعد فصیل کے جنوب مغربی کونے پر پہنچے تو سامنے کوئی دو سو سیڑھی اونچا ایک عجائب گھر تھا۔ میجر لائیڈ کونے پر بائیں ہاتھ مڑنے کی بجائے عجائب گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ناچار ہم بھی امام کے پیچھے سوئے فلک بڑھنے لگے اور اپنی حکایت کو جسے دو میل افقاً لکھا تھا، دو سو گز عموداً لکھنا شروع کیا۔ ایک مدّت کے بعد عجائب گھر کے دروازے پر پہنچے تو محسوس ہوا کہ جسم تو ساتھ ہے مگر جان چند قدم پیچھے رہ گئی ہے۔ چنانچہ دو حصّوں میں بٹ کر عجائب گھر کے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میم بعمر ۸۵ سال، چھڑی کے سہارے ایک الماری سے دُوسری الماری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کُچھ دیکھ رہی ہے۔ کُچھ پڑھ رہی ہے اور اپنی پوپلی زبان اور دو چار دانتوں کی مدد سے جتنا چہک سکتی ہے، چہک رہی ہے۔ چند سوال زبان میں آئے: ”کیا یہ خاتُون ساری سیڑھیاں

چڑھ کر آئی ہے یا کوئی ہوا کا جھونکا اسے اِدھر اُڑا لایا ہے؟ کیا اس فصیل کی ہم عمر بڑھیا کو بچپن ہی میں یہاں پہنچا کر اس کے نیچے فصیل اور ارد گرد عجائب گھر تعمیر کر دیا گیا تھا؟"

اتنے میں لائیڈ نے بڑھیا کو سلام کیا اور بولا:

"ہیلو مسز ایبٹ۔ آج کی CLIMB (چڑھائی) کیسی رہی؟"

بڑھیا بولی: "باب آج مُجھے سیڑھیاں چڑھنے میں سو منٹ لگے۔ پچھلی دفعہ ننانوے لگے تھے؟"

پس ثابت ہوا کہ لکڑنانی سچ مچ پیدل ہی اُوپر پہنچی تھی اور ظاہر ہے کہ فصیل پیمائی کی لت موصوفہ کی جوانی ہی میں لگی ہو گی۔ دفعتاً ہمیں شک گزرا کہ اس کا خاوند بھی ابتدائے خاوندیت ہی میں بھاگ گیا ہو گا۔ لکڑنانی سے آنکھ بچا کر لائیڈ سے پوچھا تو بولا: "آپ کا شک درست ہے۔ مسز ایبٹ ہنی مون بھی فصیل پر منانا چاہتی تھی۔ اس پر مسٹر ایبٹ سہرے سمیت بھاگ نکلا۔"

چنانچہ آج کل میجر لائیڈ اور مسز ایبٹ ہم مرض، ہمراز اور ہم شغل تھے اور اکثر عجائب گھر تک اکٹھی پرواز کرتے تھے۔

آخر عجائب گھر سے اُتر کر باقی فصیل سے گزر کر، بسلامت زمین پر قدم رکھا تو ہم نے پہلے ٹیلی گراف آفس سے گھر تار بھجوایا کہ ایک کالے بکرے کی فوری نیاز دی جائے، تفصیل بعد میں۔

تار دے کر جو نہی اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے تک بے تاب مچھلی کی طرح گرم پانی سے لبالب بھرے ٹب میں داخل ہو گئے اور ایک مدّت تک داخل رہے کہ چھوٹے موٹے غسل سے وُہ تاریخی کوفت رفع ہونے کی نہ تھی۔ آخر ہمارے جسم و جان میں دیرینہ شگفتگی نے کروٹ لی تو ہم ٹب سے نکل کر ایک گداز بستر میں دراز ہو گئے۔ سروس کو چائے کے لئے فون کیا۔ روم میڈ چائے لائی تو اس سے ایک فالتو خدمت کی التجا کی کہ باہر دروازے پر "NO VISITORS" کا بورڈ لٹکا دے کیونکہ کرنل ٹیلر کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ اس کے پاس ناگفتہ اور ناگفتنی لطیفوں کا ابھی خاصا ذخیرہ تھا۔ پھر مداخلت کاروں سے ممنون ہو کر تمام رات آرام سے سوئے اور رات بھر میٹھے اور موافق خواب دیکھے۔ سوائے ایک خواب کے جس میں ایک کالا بکرا سرہانے آ کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر غیر دوستانہ نظروں سے گھورا کر او جھل ہو گیا۔ خدا جانے وُہ اندر کیسے آ گیا غالباً اس نے باہر نوٹس بورڈ نہیں پڑھا تھا۔

انگلستان: شہر اچھے کہ بن؟

موچ کی پرورش لازم ہے

دُوسرے دن چسٹر سے فارغ ہو کر لندن کو لوٹے تو سٹیشن پر گولڈ ہل انتظار کرتا پایا۔ وہی مامتا کا سامارا، پیدائشی بے چین چہرہ۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا:

"گڈ آفٹر نون، کرنل خان۔ امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔"

ہمیں شرارت سوجھی کہ چلو اسے تھوڑا اور بے چین کریں۔ کہا۔

"مسٹر گولڈ ہل یوں تو خیریت ہے ذرا پاؤں میں موچ آگئی ہے۔"

"اوہو ہو ہو ہو۔۔۔ یہ تو غضب ہو گیا۔ ٹھہریئے۔ ہلئے مت، میں سٹیشن ماسٹر سے بیساکھیاں لے آتا ہوں۔" اور بیساکھیاں لینے چل پڑا۔

"بیساکھیاں! خدایا" ہم نے دِل میں کہا۔ "بیساکھیوں سے تو ایک بے موچ اناڑی کو حقیقی موچ بھی آسکتی ہے۔" ہم چلائے۔

"گولڈ ہل، ٹھہرو۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ دیکھو، میں دوڑ سکتا ہوں۔"

گولڈ ہل ہمیں دوڑتا دیکھ کر بھاگا بھاگا آیا اور ہمارے بازو کے نیچے اپنا کندھا دے کر ہمیں ٹیکسی تک لے گیا۔ جب بٹھا چکا تو بولا: "اب ہلئے مت۔ موچ کی پرورش نہ کی جائے تو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔"

ہماری موچ اپنی پیچیدگیاں پیدا کر چکی تھی! آخر ہوٹل پہنچے۔ گولڈ ہل نے رخصت ہونے سے پہلے ٹکور، آرام اور اسپرین کے فوائد بیان کئے اور پھر ہمیں مس پارس کا ایک لفافہ دیا۔ ساتھ ہی وضاحت فرمائی:

"اس میں آپ کا اگلا پروگرام ہے۔ کل اتوار ہے آپ چھٹی منایئے۔ پرسوں صبح آپ کو یہیں ملوں گا۔"

اندر جا کر مس پارس کا محبّت نامہ کھولا۔ لبِ لباب یہ تھا:

”آپ نے دو فوجی لائبریریاں دیکھ لیں۔ کیا آپ کو پسند آئیں؟ یقیناً آئی ہوں گی۔ اب آپ کو دو کاؤنٹی[۵۸] لائبریریاں دکھائیں گے اور مُجھے یقین ہے کہ آپ کو ہماری کاؤنٹیوں سے عشق ہونے لگے گا۔ اگلا ہفتہ آپ کینٹ میں گزاریں گے اور اس سے اگلا وِلٹ شائر میں۔ آپ کا مفصّل پروگرام کاؤنٹیاں تیار کریں گی۔ ولٹ شائر سے واپسی پر آپ کی ملاقات کی منتظر اور آپ کے تاثرات سُننے کی متمنّی۔۔۔ این پارس۔“

مینارِ لندن: ارے چمگادڑیں کیا ہوئیں؟

سوچا یہ عجیب شوقِ ملاقات ہے کہ فوراً ملنے کی بجائے چودہ روز کے مزید فراق کا علم صادر کر دیا ہے اور وُہ بھی لندن میں قدم رکھتے ہی۔ خیر یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ التم سے واپسی پر بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک ہوا تھا۔ بتِ فرنگ سے پروگرام سے ہٹ کر وصال کی توقع عبث تھی۔ بہر حال اگلا سفر اتنا گراں نہ تھا کیوں کہ ایک اتوار درمیان تھا اور یہ اتوار لندن میں ہم نے اس طرح گزارا جس طرح ٹھیٹ دیہاتی لاہور میں آکر پہلا دن گزارتے ہیں۔ وُہ یُوں گزارتے ہیں کہ شاہی مسجد کے مینار سے لاہور کی چھتیں

---

[۵۸] COUNTY پاکستانی ضلعوں کے مقابلے میں انگلستان کاؤنٹیوں میں منقسم ہے۔ ہر کاؤنٹی کی اپنی انتظامیہ ہے جو جملہ شعبہ جات، تعلیم، تعمیر، زراعت، کتب خانوں وغیرہ کی ذمّہ دار ہے۔

دیکھتے، عجائب گھر میں کتبوں، کتابوں، برتنوں اور برچھیوں کے ناقابلِ استعمال ذخیروں پر حیران ہوتے، چڑیا گھر میں بندروں اور بن مانسوں سے علیک سلیک کرتے، شالامار میں جا کر لسّی یا فالودہ پی کر کسی پیڑ کے نیچے لیٹ جاتے ہیں اور پھر دن ڈھلے یکّے میں بیٹھ کر گاؤں کی راہ لیتے ہیں اور اہلِ دہ کو چوپال میں چشم دید شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے۔

ہم بھی ناشتہ کر کے پہلی بس میں بیٹھ گئے۔ جس نے ہمیں پوسٹ آفس کے مینار کے قریب جا اُتارا۔ ہم نے مینار کے مجاوروں سے اُوپر جانے کا ٹکٹ لیا اور دُوسرے زائرین کے ساتھ جن میں اکثریت زائرات کی تھی، لفٹ میں کھڑے ہو گئے اور کسی بٹن کے دب جانے سے سوئے فلک اُٹھنے لگے، لیکن یہ اُٹھنا نہ اُٹھنے کے برابر تھا۔ ہم کہ شاہی مسجد کے میناروں کے خوگر تھے، توقع رکھتے تھے کہ اُوپر جاتے ہوئے سیڑھیاں ہوں گی اور سیڑھیاں گنیں گے۔ پھر ایک جگہ دم پھُولے گا اور دم لیں گے۔ ایک جگہ چمگادڑیں اُڑیں گی اور ہوش اُڑیں گے۔ کہیں گھپ اندھیرا ہو گا۔ کہیں روشنی کا روزن آئے گا اور آخری جست لگا کر مینار کی چوٹی پر جا پہنچیں گے۔ پھر اگر لندن کا کوئی شاہدرہ ہوا یا چوبُرجی ہوئی تو اسے سیّاحانہ اور طائرانہ نظروں سے دیکھیں گے اور واپس گاؤں جا کر قصّے بیان کریں گے کہ لندن لندن ہے۔ لیکن اے اہلِ دہ، لندن کے مینار کا کوئی قصّہ بیان کے قابل ہی نہیں۔ ہماری راہ میں کوئی سیڑھی آئی نہ کسی چمگادڑ ہی نے راستہ کاٹا۔

ہمارے چاروں طرف ہلکی پھلکی گوری گلابی میمیں تھیں یا لفٹ کی بے روزن مگر روشن دیواریں جن کے بٹن دبانے سے جملہ حاجتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ ایک بٹن دبایا اور افلاک سے نالوں کا جواب آگیا کہ یہیں آجایئے اور سرِ مینار پہنچ گئے۔ وہاں لندن کا نظارہ تو تھا ہی، ایک گھومتا ہوا ریستوران بھی تھا۔ یہ انگریز کی چالاکی تھی۔ تفریح کے بہانے پردیسی سے تجارت کر لینا شرفا کا دستور نہیں لیکن

ظرف عالی معاندوں میں کہاں

سب دکاندار ہیں ذلیل ہیں سب

ہم لوگ شاہی مسجد کے دروازے پر زیادہ سے زیادہ آلو چھولے کی چھابڑی لگا لیتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے پیمانے پر ریستوران چلانا نہیں شروع کر دیتے کہ زائرین اشتعال میں آ کر نہ کھاتے بھی کھائیں۔ ہم نے غور سے دیکھا تو بلوری دیواروں والے ریستوران کی ہر گھومتی میز دامنِ دِل کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی اور کہی جاتی تھی کہ جا اینجاست۔ ہم آخر انسان تھے، ان کی باتوں میں آ گئے اور کھِچے کھِچے ریستوران کے دروازے پر جا پہنچے لیکن دربان نے روک کر ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے کہا:

"ہم نقد ادا کریں گے۔"

بولا: ”معاف رکھنا۔ داخلے سے پہلے سیٹ ریزرو کرانا ضروری ہے اور اگلے سات دن کے لئے سب سیٹیں ریزرو ہیں۔“

ہمیں اچانک یاد آیا کہ انگریزوں کا کھانا پھیکا ہوتا ہے۔ چنانچہ سلسلۂ کلام منقطع کر دیا اور ریستوران پر لات مار کر تیزی سے مینار سے اترے اور شفیع کے ریستوران کی راہ لی جہاں ایک گلاس یخنی، دو روغنی پراٹھے، تین نرگسی کوفتے اور ایک درجن شاہی ٹکڑے کھا کر اور سبز چائے کی چینک پی کر انگریزوں سے بھرپور انتقام لیا۔ انتقام کے بعد بیشک ہم چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے لیکن اصل چیز انتقام ہے۔ چل پھر تو مال مویشی بھی سکتے ہیں۔ بہرحال جس وقت ہم کرسی سے اُٹھنے کے قابل ہو گئے اُٹھے اور انگریزی یکّے یعنی بس پر بیٹھ کر اپنے ہوٹل کو سدھارے جہاں باقی دن اور پوری رات کے لئے سو گئے۔

صبح سفر کے لئے تیار ہو کر کمرے سے نیچے لونج میں آئے تو حسبِ توقع گولڈ ہل کو مامتائی مسکراہٹ کے ساتھ منتظر پایا۔ معلُوم ہوتا تھا ہمیں دیکھ کر ابھی کہہ دے گا۔ ”کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔“ لیکن ہم نے گولڈ ہل کو بولنے کا موقع نہ دیا اور چھوٹتے ہی کہا۔

”ہیلو مسٹر گولڈ ہل۔ ہماری موچ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔“

بولا: "خوب، لیکن ابھی کُچھ روز اور ٹکور جاری رکھیں۔"

گویا دوسرے لفظوں میں گولڈ ہل تاکید کر رہا تھا کہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔۔۔ ہم نے ایک بھرپُور لمحے کے لئے اس ازلی فکر مند کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔

بولا: "آپ کو معلُوم ہے آج نو بجے آپ کینٹ کے صدر شہر میڈسٹون جا رہے ہیں؟"

جواب دیا: "مس پارس کے خط سے کُچھ اندازہ تو ہے۔"

"تو ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں، چلیئے آپ کو گاڑی میں بٹھا آؤں۔"

"مسٹر گولڈ ہل، مُجھے گاڑی میں بیٹھنا آتا ہے۔ آج آپ چھٹّی منا لیں تو اچھا نہ ہو گا؟"

گولڈ ہل نے اس غیر ضروری سوال کا جواب بھی غیر ضروری سمجھا اور سوٹ کیس اُٹھا کر باہر ٹیکسی کی طرف چل پڑا۔ قصّہ کوتاہ اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد جب تک ہماری گاڑی نے حرکت نہ کی گولڈ ہل ہمارے ڈبّے کے سامنے کھڑا نگرانی کرتا رہا۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں ہم آخری منٹ میں بھی صحیح گاڑی سے نکل کر غلط گاڑی میں نہ جا بیٹھیں۔۔۔ احساسِ فرض اچھی چیز ہے لیکن اعتدال کے ساتھ۔ اعتدال سے ذرا ہی آگے اختلال کی حد شروع ہوتی ہے اور گولڈ ہل یہ حد عبور کر کے مستقل طور پر دُوسری طرف قیام پذیر تھا۔

کینٹ کاؤنٹی کے حُسن کا راز کیا ہے؟

آخر گاڑی لندن سے نکلی۔ لندن بڑا ہے، لندن اونچا ہے اور لندن بارونق بھی ہے لیکن لندن خوبصورت نہیں اور لندن سکون بخش تو کسی طور نہیں۔ چنانچہ لندن کے دھند آلودہ مضافات سے نکل کر بتدریج کھلی فضا میں پہنچے تو اعصاب کو ایک عجیب ریشمی سے لمس کا احساس ہوا اور یہ محض شہر سے دوری کا نتیجہ نہ تھا بلکہ بَن سے قرب کا! شہر سے باہر کا انگلستان از بس حسین ہے اور کینٹ کاؤنٹی تو باقی کاؤنٹوں میں ملکۂ حُسن سمجھی جاتی ہے۔۔۔ اور اگر نہیں بھی تو ہم نے اس کے سر پر اخلاقی تاج رکھ دیا۔۔۔ ارضِ کینٹ کے کسی حِصّے میں بھی بے رنگ چپٹا پن نہیں بلکہ اس کے سینے پر سبز ساٹن میں لپٹے ہوئے بڑے دِلربا نشیب و فراز ہیں اور یہی نشیب و فراز اس کے حُسنِ بے پروا کا راز ہیں۔ چپٹی شے مکروہ نہ سہی، حسین نہیں ہو سکتی۔۔۔ حُسن گولائیوں میں ہے، گنبدوں میں ہے، محرابوں میں ہے، مرغولوں میں ہے۔ الغرض جو شے رُخِ یار یا سینۂ دِلبر سے دور کی مشابہت بھی رکھتی ہو، حُسن سے خالی نہیں ہو سکتی۔ کسی چوڑی، چپٹی، سیدھی سپاٹ چیز میں حُسن ڈھونڈنا صحرا میں باغبانی کرنا ہے۔ عدم نے کیا پتّے کی بات کہی ہے۔

میں سیدھی لکیروں کی کیا داد دوں

جو خطِ دِلربا ہے وُہ خمدار ہے

اور اب سوچتا ہوں کہ جب ہمارے یار آغا کو ایک روز کوکا کولا کی بوتل دیکھ کر غش آ گیا تھا تو کس قدر حق بجانب غش تھا۔

گاڑی میڈسٹون کے سٹیشن پر پہنچی تو ایک ادھیڑ عمر کا کسی قدر گھسا پٹا انگریز۔۔۔ جو گھسائی پٹائی کے بعد گنجا اور کُبڑا بھی تھا۔۔۔ ہمارے استقبال کو آیا۔ تعارف پر پتہ چلا کہ آپ کاؤنٹی لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔ ہمارا استقبال ذرا شیر گرم سا تھا لیکن اس لئے نہیں کہ ہمارے میزبان نے کُچھ گرمائش ہم سے دانستہ بچا رکھی تھی بلکہ موصوف کی جملہ حرارت غریزی کی مقدار ہی اس قدر تھی۔ لائبریری میں کام کر کر کے، لائبریری کے باہر کے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے OVER WORK (کثرتِ کار) نے جو اثر ان کے سر کے باہر کیا تھا، وُہی عمل سر کے اندر بھی کیا تھا۔ یعنی بے چارے دو طرفہ گنجے تھے۔ ایسی سقیم حالت میں ان سے کسی پُرجوش استقبال کی توقع زیادتی تھی۔ چنانچہ ان کا اپنی گاڑی کو کسی ٹکّر کے بغیر لائبریری تک لے جانا اور ہمیں اپنے باس تک پہنچا دینا ہی بڑا کمال تھا۔ جس کا ہم نے شکریے کے ساتھ اعتراف کیا۔

ٹرومین کے مزاج بخیر نہیں

باس صاحب کا نام ٹرومین تھا۔ فرینک ٹرومین۔ انگریز میں بڑی خوبی ہے کہ اجنبی کے ساتھ مہر و محبّت سے پیش آتا ہے اور خاصے خلوص کے ساتھ۔ لیکن اگر کسی وجہ سے خلوص پیدا نہ بھی کر سکے تو اتنی منافقت ضرور پیدا کر دیتا ہے کہ بظاہر مہربان اور متواضع نظر آئے۔ ٹرومین صاحب نے بھی کوشش تو کی مگر ذرا اناڑی منافق نکلے۔ یعنی منافقت کی مگر چھپا نہ سکے۔ ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔

"ہیلو کرنل خان۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

لیکن ساتھ ہی آپ کے چہرے پر کرب کی کُچھ ایسی علامتیں نمودار ہوئیں جیسے چرائتے کا گھونٹ پی لیا ہو۔ ہم نے کہا۔

"وُہ تو ظاہر ہی ہے۔ آپ کے مزاج تو بخیر ہیں؟"

"مزاج بھی کوئی خاص بخیر نہیں۔"

سوچا، ٹرومین کی بد تمیزی کا جواب ناراضگی سے نہیں دینا چاہئے۔ ذرا اس کے مزاج کی دُم مروڑنا چاہئے۔ چنانچہ سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"اللہ رحم کرے۔ یہ عارضہ آپ کو اکثر ہو جاتا ہے؟"

"نہیں، آج صبح ہی ہوا ہے، ابھی ابھی۔"

"تو یقیناً یہ صبح کا قصور ہے۔ میرا اپنا مزاج صبح سے کُچھ برہم ہے۔"

"برہم۔۔۔۔۔ کیا وجہ؟"

"اگر آپ کو وجہ بتائی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔"

"بتا کر تو دیکھیں۔"

"وجہ یہ ہے کہ آج صبح کسی منحوس کا منہ دیکھا ہے۔"

فرینک ٹرومین نے ایک لمحے کے لیے ہمارے جواب پر غور کیا۔ ذرا مُسکرایا اور پھر ہمیں کرسی پیش کرتے ہوئے بولا:

"برائے کرم تشریف رکھئے، کافی یا چائے؟ اور ہاں مجھے فرینک کہہ کر پکاریئے۔"

ہم نے کہا۔ "کافی پلیز، فرینک۔"

۔۔۔ اور فرینک اور ہم ایک دوستانہ ہنسی ہنس دیئے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی علیک سلیک پر ہماری باہمی دوستی کے امکانات اتنے روشن نہ تھے جتنے بعد میں ثابت ہوئے لیکن جیسا کہ تجربہ کار سیاستدان کہا کرتے ہیں، ذاتی تبادلۂ خیالات سے بڑے بڑے مسائل کا حل

نکل آتا ہے۔ چنانچہ اس مختصر سی گفتگو کے بعد مسٹر ٹرومین اور ہمارے تعلقات میں ایک عجیب خوشگوار آگئی۔

کافی کے دوران ٹرومین نے اپنی کاؤنٹی کے نظامِ لائبریری کی مدح میں لیکچر دینا شروع کیا:

"یہ بارہ منزلہ عمارت جس کی تیسری منزل پر ہم بیٹھے کافی پی رہے ہیں، کینٹ کاؤنٹی کی مرکزی یامادری لائبریری ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے تمام قصبوں اور دیہات میں ذیلی لائبریریاں ہیں اور بہت چھوٹے یعنی دو دو چار چار گھروں والے دیہات کے لئے سفری لائبریریاں ہیں۔ چنانچہ ساری کاؤنٹی میں کوئی ایسا باشندہ نہیں جو لائبریری سے یا جس سے لائبریری، چند قدم سے زیادہ فاصلے پر ہو اور نہ کوئی ایسا باشندہ ہے جو کسی کتاب کی خواہش کرے اور اسے مہیا نہ کی جاسکے، خواہ وہ کتاب لندن سے لانا پڑے، لاہور سے یا لاسہ سے۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

ٹرومین کا لیکچر ہم خاموشی سے سُنتے رہے لیکن دل نہ مانا۔ آخر ہمارے ضلعے ہیں اور ضلعوں میں قصبے اور دیہات ہیں۔ مثلاً ہمارا اپنا گاؤں بلکسر ضلع جہلم کا ایک معتبر گاؤں ہے اور بابا گاما وہاں کا ایک معزز باشندہ ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بابا گاما استاد امام دین کی بانگِ دہل مانگے اور لاہور یا لاسہ تو چھوڑی، ہمارے صاحب ضلع گجرات سے یعنی دریا

پار ہی سے، یہ فرمائش پوری کر دیں؟ مشکل ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تحصیلدار کو حکم دیں گے۔ تحصیلدار پٹواری کو کہہ دے گا اور پٹواری بابا دلہہ سے رشوت لے کر بانگِ دہل کی جگہ اسے اپنا بانگِ درا پر ٹرخا دے گا اور اصل مال خود ہضم کر جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ جو کام ضلع جہلم نہیں کر سکتا، وہ اس انگریز بہن کینٹ کاؤنٹی بھی نہیں کر سکتی۔ بلکہ ہمیں شبہ سا ہوا کہ فرینک ٹرومین داستان گو قسم کا آدمی ہے۔ ہر بات کو پریوں کی کہانی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے نیم مذاق میں یہ سوال بھی پوچھ لیا:

"فرینک۔ تمہیں پریوں کی کہانیاں سنانے کو ملکہ بھی ہے۔"

بولا۔ "تو تم اسے Fairy Tale سمجھتے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں خوش ہوں کہ یہ حقیقی پریوں کی کہانی ہے۔"

"اور اگر میں نہ مانوں تو؟"

"تو میرا فرض ہے کہ تمہیں منواؤں اور منوانے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں کہ تمہیں ان پریوں سے ملا دوں۔"

پریوں سے ملاقات! ایسے کارِنیک سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہم نے کہا۔

"ضرور ملوایئے۔ کتنی پریاں ہیں؟"

”تین ہیں، تمہیں کاؤنٹی کونسل کے کیفے ٹیریا میں لنچ پر ملیں گی۔ تم آج ہی ان پریوں کے مہمان ہو۔“

بے تابی میں ہمارے منہ سے نکل گیا۔ ”لنچ کتنے بجے ہوتا ہے؟“

ٹرومین ذرا مسکرایا اور گھڑی دیکھ کر بولا۔

”صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ کیفے ٹیریا یہاں سے صرف پانچ منٹ کی واک پر ہے۔ ایک گائیڈ تمہارے ساتھ جائے گا۔“

ہم نے سنبھل کر مختصراً کہا۔ ”درست۔“ اور انگریزی زندگی ہمیں پہلی بار بے عیب نظر آئی۔

ادھر ٹرومین نے اپنا لیکچر جاری رکھا لیکن جس شخص کو پندرہ منٹ کے بعد تین پریوں سے ملنے کی نوید مل چکی ہو اور وُہ مسلمہ بین الاقوامی پھوہڑ بھی نہ ہو، اسے لیکچر سُننے کا دماغ نہیں رہتا۔ چنانچہ دس منٹ کے لیکچر کے دوران جہاں تک ہمارا تعلق ہے، تصوّر عرش پر تھا اور سر تھا پائے ساقی پر اور جونہی گیارہواں منٹ شروع ہوا ہم ایک گائیڈ کے ساتھ راہرو کوئے تمنّا تھے، یعنی پریوں کے میس کو جارہے تھے۔

پریوں کا سایہ ہو گیا

میس میں پہنچے تو دیکھا کہ سینکڑوں مرد و زن خالی پلیٹیں اٹھائے قطار میں کھڑے ہیں اور اتنے ہی مرد و زن بھری پلیٹیں لئے خالی میزوں کی تلاش میں چکرائے پھر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے رہنما سے اپنی پریوں کا پتہ پوچھا تو وسیع ہجوم پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا:

”آیئے۔۔۔“ اور ہماری انگلی پکڑ کر ایک ایسی میز کی طرف لے گیا جس کی تین کرسیاں پُر تھیں اور چوتھی خالی تھی۔ ہمیں تینوں کرسی نشینوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے بولا:

”خواتین، ملیے اپنے معزّز مہمان کرنل خان سے۔“

خواتین بیٹھے بیٹھے ہی مُسکرائیں اور ہمیں کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

شاید اب آپ ہم سے یہ سُننے کے متوقع ہوں گے کہ

دیکھتے ہی ہم پر ان پریوں کا سایہ ہو گیا[۵۹]

---

[۵۹] اکبر کا شعر یُوں ہے: جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا۔ جس سے تھادِل کی حرارت کو سراسر ارتعاش۔

جس سے تھا دِل کی حرارت کو سراسر ارتعاش

تو عرض ہے کہ ایسی کوئی بات نہ ہوئی جب آپ کو حوروں اور پریوں کا لالچ دے کر کاؤنٹی لائبریری کی تین بے نمک، بے رنگ اور بے مزہ ملازماؤں کے آگے ڈال دیا جائے اور ملازمائیں بھی ایسی کہ فی ملازمہ اوسط عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو تو ازراہِ کرم آپ ہی بتائیں کہ دِل ارتعاش کرے گا یا انتقال کر جائے گا۔ بہرحال ہم نے دِل کو تھاما اور ٹرومین کے آباؤ اجداد پر رحمت سے مختلف چیز بھیجتے ہوئے خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہماری ہمجولیوں نے اپنا اپنا تعارف کرانا شروع کیا۔

”میرا نام مسز پامر ہے۔ میں لائبریری میں فہرست سازی پر مامور ہوں۔“

”میں مسز جیکب ہوں۔ میں سفری لائبریریوں کی ذمہ دار ہوں۔“

”میرا نام مِس مچل ہے۔ میں جیلوں اور ہسپتالوں کی لائبریریوں کی نگران ہوں۔“

سوچا: ”اے خالق و عادل۔ اگر مُجھے آثارِ قدیمہ میں دلچسپی ہوتی تو فوج میں کیوں بھرتی ہوتا؟ اب تو ہی بتا اس آزمائش میں کیوں ڈال دیا ہے؟“

اپنے اللہ سے شکوہ کر چکے تو اپنی ہمجولیوں سے مخالب ہوئے:

”آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی۔“

ہماری اس دو عملی کو خُدا تو دیکھ ہی رہا تھا۔ خدا جانے ہمجولیاں بھی دیکھ رہی تھیں یا نہیں۔

"تو پھر آیئے اپنا اپنا کھانا لے آئیں۔"۔۔ مسز پامر اچانک بولی۔

جب کھانا لانے کے لئے اُٹھے اور ہم اس خیال سے کھڑے ہو کر رُک گئے کہ خواتین آگے آگے چلیں تو مس مچل نے پھُرتی سے ہمارے کندھے پر اپنا ہاتھ اور بوجھ ڈال دیا، محبّت کی وجہ سے نہیں، لقوے کی وجہ سے۔ معلُوم ہوا کہ موصوفہ نے بچپن میں یعنی جنگِ عظیم سے ذرا قبل فالج کی جنگ لڑی تھی۔ اور اب سوائے زبان کے آپ کے سب اعضا میں لُکنت تھی۔ جب مسز مچل کو کھانے کی میز سے کھانے کے دیگچوں تک اور دیگچوں سے میز تک کامیابی سے کھینچ لائے تو ہمارا اپنے کندھوں کا توازن تقریباً مفلوج ہو چکا تھا۔

پھر کھانا شروع ہوا یا یوں کہنا چاہیے کہ باتیں شروع ہوئیں کہ تین عورتوں کے ہوتے ہوئے کھانا محض ضمنی شُغل بن جاتا ہے۔ مسز پامر نے ہم سے چھوٹتے ہی سوال کیا:

"کرنل خان آپ انڈیا سے کب آئے؟" اور ساتھ ہی آہ بھرتے ہوئے کہا: "گڈ اولڈ انڈیا۔"

مسز پامر برطانوی راج کے دنوں میں ہندوستان دیکھ چکی تھی۔ اس کا والد غالباً فوج میں کوئی چھوٹا بڑا افسر تھا۔۔۔ اور اس کا دِل بیروں، خانصاموں والی زندگی کی یاد سے اب بھی گداز ہو جاتا تھا۔ "گُڈ اولڈ انڈیا" انگلستان کے قومی حافظے میں سب سے زیادہ ارمان انگیز یاد ہے۔ حتیٰ کہ اب ہندوستانی دھوبی اور نائی بھی ان کے سپنوں میں الف لیلوی شہزادے بن کر پھرتے ہیں۔ مسز پامر ہی نہیں، آپ کسی ہندوستان دیدہ انگریز کا دِل چیریں تو اس پر برطانوی ہند کا بلا تقسیم نقشہ کھچا ہو گا۔۔۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انگریز کو پاکستان موافق نہیں آتا۔۔۔ ہمیں مسز پامر سے ہمدردی ضرور تھی لیکن رفع شر بھی لازم۔ عرض کیا:

"انڈیا سے نہیں، پاکستان سے آیا ہوں۔"

"لیکن انڈیا ہو یا پاکستان، ایک ہی چیز ہے۔"

"نہیں محترمہ، دو چیزیں ہیں۔"

"بہت اچھا، آپ جیتے۔ تو پاکستان سے آئے کتنے دن ہوئے ہیں؟"

"کوئی ہفتہ عشرہ ہوا ہے۔"

"پھر تو آپ بالکل تازہ وارد ہیں؟ کیا حال ہے پاکستان کا؟"

''آپ کی اور ماؤنٹ بیٹن کی دُعا سے پھل پھُول رہا ہے۔''

مسز پامر کُچھ نہ سمجھی اور روانی میں اپنی مرضی کے سوال پوچھتی گئی۔

''کرنل خان، پاکستان میں آپ کہاں رہتے ہیں؟ میرٹھ میں؟''

مسز پامر کے باپ نے اپنی ملازمت کا پیشتر حصّہ غالباً میرٹھ ہی گزارا تھا لیکن ظاہر تھا کہ موصوف نے اپنی بیٹی کے جغرافیے کو خاطر خواہ توجہ نہیں دی تھی۔ عرض کیا۔

''میرٹھ تو کسی دوسرے ملک میں ہے۔ میں راولپنڈی میں رہتا ہوں۔''

''اوُہ! پنڈی جو مری کے رستے میں ہے؟''

پنڈی کی یہ ہتک کہ مری کے حوالے سے پہچانی جائے! ہمیں بہت ناگوار گزرا۔ بلکہ یُوں محسوس ہوا جیسے خود پنڈی، اقبال بیگم کی درد انگیز لَے میں فریاد کر رہی ہو: ''دِل توڑنے والے دیکھ کے چل، ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔۔۔'' لیکن انگریزی راج کے دنوں میں پہاڑوں کی دیوانہ میموں کے لئے پنڈی کی اہمیت اسی قدر تھی۔ بہر حال ہم نے کسی قدر انتقاماً کہا۔

''جی ہاں۔ مری، اسلام آباد اور بھارا کہو وغیرہ پنڈی کے مضافات میں سے ہیں۔''

مسز پامر نے ہمارا کنایہ نہ سمجھا یا سمجھنے کی کوشش نہ کی اور حسرت بھری آواز میں بولی:

”کاش، میں ایک دفعہ پھر مری دیکھ سکتی۔ کرنل خان آپ پاکستان کب لوٹ رہے ہیں؟“

”یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ ہمارا انگلستان سے کب جی بھرتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنی بیوی کی یاد کب ستانا شروع کرتی ہے۔“

یہ تبصرہ ہمارے آخری جملے پر مسز جیکب کی طرف سے تھا جو سب سے کم بوڑھی تھیں، اور جن کی رگِ ظرافت اچانک پھڑک اُٹھی تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم کوئی مناسب جواب دیتے، مسز پامر ماہرِ ہندوستان کی حیثیت سے پھر میدان میں کود پڑیں اور مسز جیکب سے کہنے لگیں۔

”بیوی نہیں بیویاں کہو۔“

مسز جیکب نے حیرت سے پوچھا: ”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ کرنل کی دو بیویاں ہیں؟“

مسز پامر آرام سے بولی۔ ”دو نہیں چار۔“

چار کا لفظ سُن کر مسز جیکب کے ہاتھوں سے چھری کانٹا گر پڑے اور مبہوت ہو کر ہمارا مُنہ تکنے لگی گویا ابھی غش کھا کر خود بھی گرتی ہے۔ ہم گرتی کو تھامنے کی سوچ رہے تھے کہ مسز پامر نے مسز جیکب کو سمجھایا۔

”مائی ڈیئر میری، بے ہوش ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ انڈیا میں ہر کھاتے پیتے آدمی کی دو تین یا چار بیویاں ہوتی ہیں۔ میرٹھ میں ہمارے کنٹین کنٹریکٹر کھان بہادر صاحب کی چار تھیں۔“

یہ میمیں ہماری موجودگی کے باوجود ہم سے مشورہ کئے بغیر ہماری بیویوں کی تعداد کا تعین کر رہی تھیں۔ بلکہ اب چھری کانٹوں کو اوندھا لِٹا کر ہمارے ازدواجی معاملات پر دھواں دھار بحث کرنے لگی تھیں۔ اس زنانہ مناظرے کے اُمڈتے ہوئے دھوئیں میں ہمیں کوئی شگاف دکھائی نہ دیتا تھا جس کے رستے اپنی صفائی میں ایک دو لفظ کنارے کے بل ہی داخلِ بحث کر سکتے۔ چنانچہ ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے ججوں کی جنگ دیکھیں اور فیصلے کا انتظار کریں۔ خُدا خُدا کر کے آخر مطلع ذرا صاف ہوا تو ہم نے کہا۔

”خواتین، کیا میں اب پوچھ سکتا ہوں کہ ہماری کتنی بیویاں ہیں؟“

مسز پامر اور مسز مچل جو مناظرے میں ہم خیال ہو گئی تھیں یک زبان ہو کر بولیں:۔

”کم از کم چار۔“

ہم نے کہا: ”تو براہِ کرم باقی تین بیویوں کا محلِ وقوع بھی بتا دیں کہ ہم ان کے نان نفقہ کا بندوبست کریں اور حقوقِ زن و شوئی کا مطالبہ کر سکیں۔“

اس پر مسز پامر اور مسز مچل نے ایک دُوسرے کو سوالیہ انداز سے دیکھا جیسے ہم سے ناانصافی کا احساس ہو رہا ہو۔ ادھر مسز جیکب جو اور ہی نہ کر سکتی تھی کہ کوئی باہوش مرد ایک بیوی کے علاوہ ایک بِلّی بھی کامیابی سے پال سکتا ہے۔ ہماری حمایت میں مخالف میموں کو کہنے لگی۔

"دیکھا؟ کرنل خان مہذب آدمی ہے۔ یہ صرف ایک بیوی کا قائل ہے۔" (اور پھر ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے) "کیوں ٹھیک ہے نا کرنل خان؟"

اب ہم سے ایک ایسا سوال کر دیا گیا تھا جس سے مصلحت اور شریعت میں ٹکر ہوتی تھی۔ ہم نے ایک درمیانہ رستہ اختیار کر کے مصلحت اور شریعت میں سمجھوتے کی کوشش کی اور کہا۔

"جی ہاں۔ عام حالات میں ہماری ایکٹو بیوی ایک ہی ہوتی ہے۔ فقط احتیاط کے طور پر تین مزید بیویوں کا حق ذرا محفوظ رکھتے ہیں۔"

اور پھر جو حشر سڑک کے درمیان چلنے والوں کا ہوتا ہے وُہی ہمارا ہوا۔ یعنی دونوں طرف کی ٹریفک سے ٹکرا گئے۔ ہمارے جواب سے نہ مخالف میمیں متّفق تھیں اور نہ موافق میم مطمئن۔ ہماری میانہ روی ہمیں لے ڈوبی تھی۔ علامہ اقبال نے کب کا کہہ رکھا ہے کہ یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر۔ لیکن علامہ کی نصیحت اس قدر بعد از وقت یاد آئی

کہ اب نالہ کھینچنے کا فائدہ تھا نہ نواروکنے کا۔ اب ساکھ بچانے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ موضوعِ گفتگو بدل کر کسی ایسے دِلچسپ مضمون پر لے آتے کہ میں ہمارے ازدواجی نظرات یکسر بھول جائیں۔ڈیل کارنگی کا کہنا ہے کہ آپ کے مخاطب کے لئے دِلچسپ ترین موضوع خود مخاطب کی ذات ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی یہی گُر کانیگی فارمولے کے ساتھ ملا کر آزمایا: یعنی پہلے مسکرائے پھر قہقہہ لگایا پھر کہا: ''ہم تو آپ کی ٹانگ کھینچ رہے تھے[٦٠]۔'' پھر بائی دی وے کہہ کر فقرہ طرح پیش کیا۔

''بھی ہم نے آج تک کسی باس کو اپنے سٹاف کی اتنی تعریف کرتے نہیں سُنا جتنی آج فرینک ٹرومین نے کی۔''

ہمارا موضوع سیدھا ہماری سامعات کے دِل سے جا ٹکرایا کہ تینوں ٹرومین کے سٹاف کی پہلی صف میں تھیں۔ تقریباً یک زبان ہو کر بولیں:

''کچھ ہمارے متعلق بھی کہتا تھا؟''

''بہت کچھ۔''

(ہم نے اپنی سامعات کی آتشِ تجسس کو ذرا ہوا دی)

---

[٦٠] مذاق کرنے کے معنوں میں انگریزی محاورہ۔:PULLING YOUR LEG

”سچ؟ کیا کہتا تھا؟“

”کہتا تھا آپ تینوں پریاں ہیں۔“

”پریاں؟ اوئی! ہوائے!!“

ظاہر تھا کہ پریاں خوشی سے اُڑنے لگی تھیں۔ بلکہ معلُوم ہوتا تھا کہ مس مچل تو اپنے مفلوج گلے سے غٹر غوں کی آواز بھی نکال رہی ہے۔ ہم نے مکالمہ جاری رکھا:

”جی ہاں۔ سچّی پریاں۔ وُہ کہتا تھا یہ تینوں گرلز[61] تو اس قدر باکمال ہیں کہ ان کی کارگزاری پریوں کی کہانی معلُوم ہوتی ہے۔“

مس مچل بولی: ”میں نہ کہتی تھی فرینک ڈارلنگ ہے۔“

مسز پامر نے کہا: ”بے شک۔“

مسز جیکب نے تائید کی ”سو فی صد۔“

اور کوئی پچاس فی صد ڈارلنگ ہم بھی بن گئے کہ اصلی ڈارلنگ کا پیام لائے تھے۔ بلبل کی ہر دِلعزیزی کا آخر کیا راز ہے؟ یہی کہ مژدۂ بہار لاتی ہے؟ تو ایسا ہی مژدہ ہم بھی

---

[61] GIRLS یعنی لڑکیاں۔ انگریز مذاق میں بعض اوقات بوڑھیوں کو لڑکیاں کہتے ہیں۔

لائے تھے۔ سو کھانا ختم ہوا تو ہم ایک بے پایاں خیر سگالی کی فضا میں کیفے ٹیریا سے باہر نکلے۔ یہ اسی فضا کا اثر تھا کہ مس مچل کا دوستانہ بوجھ پھر ہمارے دوشِ ناتواں پر تھا۔ بوجھ بہت سبک تھا نہ بہت گوارا لیکن ہم خوش تھے کہ ہمارا ڈیل کارنیگی کا مطالعہ رائیگاں نہیں گیا تھا اور جیسا کہ ڈیل[۶۲] کی کتاب کے نام کا منشا تھا، ہم فی الواقع سیکھ چکے تھے کہ دشمنوں کو دوست اور میموں کو موم کیسے کیا جاتا ہے۔

لنچ کے بعد ہمیں لائبریری کے مختلف شعبوں کی تعارفی سیر کرائی گئی۔ ہم اپنی بوڑھی میزبانوں کو ابھی مل چکے تھے لیکن جب انہیں اپنے اپنے شعبوں کی سربراہی کرتے دیکھا تو ان کے انداز ہی کُچھ اور تھے۔ وُہی کیفے ٹیریا والی ویران صورت بوڑھیاں اپنے مصفّٰی اور مجلّا دفتروں میں رنگارنگ کتابوں کے سائے تلے بڑی طراوت بخش نظر آتی تھیں اور سچ مچ یُوں لگتی تھیں جیسے پری خانوں میں پریاں بیٹھی ہوں۔ پھر جب ان سے لائبریری کے فن پر بات ہوئی تو معلُوم ہوا کہ ہم تو ہنوز طفلِ مکتب ہیں اور یہ کہ وُہ جنوں اور پریوں کو بھی دو چار سبق پڑھا سکتی ہیں۔ بے شک ٹرومین نے اپنے ابتدائی بیان میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وُہ تھوڑا سا بد تمیز ضرور تھا غلط بیان نہ تھا۔

---

[۶۲] HOW TO WIN FRIENDS AND INFLUENCE PEOPLE

کیا مس ماریہ سچ مچ لونلی ہیں؟

لائبریری سے فارغ ہوئے تو ہمیں اپنے ہوٹل میں لے جایا گیا جہاں ہمارا سامان پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ کمرہ کھولا تو اندر ہمارے سامان اور ہوٹل کے سامان کے علاوہ ایک محترمہ رکھی تھیں یا بیٹھی تھیں جو لائبریری والی محترمات سے خاصی مختلف تھیں۔ لیکن ایک تو ان کی عمر بہت مناسب تھی، دُوسرے ان کے اعضا متناسب تھے، تیسرے ان کے رنگ میں ایک دِلآویز سی ملاحت تھی اور چوتھے۔۔۔ خیر یہ کہانی طویل ہے۔

اب یہ بی بی ہمارے سامان میں تو آئی نہیں تھی۔ کیا یہ ہوٹل کے سامان کا حصّہ تھی؟ مثلاً روم میڈ وغیرہ لیکن اس کے جسمانی ساخت روم میڈوں سے واضح طور پر سپیریر قسم کی تھی۔ دماغ پر ناحق زور دینے کی بجائے ہم نے سیدھا سوال کر دیا۔

"آپ کی شانِ نزول؟"

جواب آیا: "اور آپ کی؟"

ہم ذرا مؤدبانہ جواب کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن جو جواب اس روپ اور رفتار سے آئے جیسے بلّے سے ٹکرا کر گیند آتی ہے وُہ مساویانہ بلکہ گستاخانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ہم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا:

”ہماری شانِ نزول یہ ہے کہ یہ کمرہ ہماری خاطر ہفتے بھر کے لئے ریزرو ہے اور اس لمحہ سے ہم یہاں رہنے آئے ہیں۔“

”اور ہماری شانِ نزول بھی حرف بحرف یہی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ ہم کوئی آدھ گھنٹے سے یہاں رہ بھی رہے ہیں۔ دیکھیں یہ ہمارا سامان رکھا ہے۔“

”سوال پھر صرف اتنا ہے کہ ہمارا سامان یہاں کیسے آگیا؟“

”جی ہاں۔ اسی سوال کا جواب ہمیں بھی مطلوب ہے۔ شاید آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔“

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی روشنی نہ تھی اور ہاتھ ابھی وہیں تھے کہ ہوٹل کا بوڑھا پورٹر بھاگا بھاگا کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے محترمہ سے اور پھر ہم سے معذرت چاہی۔ پھر ہمارا سامان اُٹھا کر کمرے سے نکلا اور ہمیں پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ ہم محترمہ کو سلام کرتے ہوئے باہر نکلنے کو تھے کہ محترمہ بولیں:

”ٹھہریئے۔۔۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”پاکستان سے۔ اور معافی چاہتا ہوں اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ میرا نام خان ہے۔“

”اوہ، خان فیملی؟ آپ ایوب خان کے رشتہ دار ہیں؟“

پہلے تو ہم ذرا جھجھکے لیکن پھر رواں ہو گئے:

"جی ہاں۔ ان کے لاکھوں رشتہ داروں میں سے ایک ہوں۔ پاکستان میں ہر دوسرا شخص خان ہے۔ ہر تیسرا شخص ڈبل خان ہے اور ہر چوتھا شخص خانِ خاناں ہے۔"

"پھر تو آپ بڑے آدمی معلُوم ہوتے ہیں۔"

"اگر آپ نے ہمیں سمجھا ہے تو ہم تردید نہیں کریں گے اور اگر گستاخی نہ ہو تو آپ کی تعریف؟"

"اوہ۔۔۔ میں بھول گئی۔۔۔ میرا نام ماریہ ہے۔۔۔ میں سپین سے برٹش گورنمنٹ کی دعوت پر برطانوی نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرنے آئی ہوں۔ میں ٹیچر ہوں اور تاریخ پڑھاتی ہوں۔"

"تو مس ماریہ آپ شاید یہ سُن کر خوش ہوں گی کہ ہم آپ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ ہم بھی برٹش گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔"

"ارے سچ؟"

"جی ہاں۔ اور ہم کتب خانوں کا مطالعہ کرنے آئے ہیں۔"

"آپ کا اور ہمارا مشن تقریباً ایک ہے۔ پھر یہ لوگ ہم غیر ملکی مہمانوں کو ایک ساتھ دورہ کیوں نہیں کرنے دیتے؟ کچھ رونق بھی رہے۔"

ہمیں اس سوال کا یہ جواب معلُوم نہ تھا۔ محض جواب کی خاطر شوشہ چھوڑا:

"شاید اس لئے کہ ہم مختلف ملکوں کے باشندے ہیں یا شاید اس لئے کہ آپ خاتُون ہیں اور ہم۔۔۔"

"نان سینس۔ ہم دونوں انسان ہیں۔"

خدا جانے ہمیں اسی لمحہ احمد فراز کا مصرع کیوں یاد آ گیا۔ دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں لیکن کوئی شعر یاد آ جائے تو لازم نہیں کہ اسے باآواز بلند گایا یا سُنایا بھی جائے۔ چنانچہ شعر پی گئے اور گفتگو کو غیر عاشقانہ سطح پر رہنے دیا۔ عرض کیا:

"شاید یہ انگریز نہیں چاہتے کہ ان کے مہمان آپس میں نوٹ ملائیں۔"

"تو اب نہ ملاتے بھی ملائیں گے۔ ہر شام کو۔"

پیشتر اس کے کہ ہم نوٹ ملانے کے معاہدے پر دستخط کر دیتے دروازہ کھلا اور ایک بار پھر رپورٹر کا سر نمودار ہوا۔ حسبِ معمول بڑی لجاجت سے بولا:

"سر آیئے گا۔ میں آپ کو کمرہ دکھادوں"

ہم نے ماریہ سے رخصت لی۔ اپنے کمرے میں گئے اور پورٹر سے پوچھا کہ ہمارا سامان مس ماریہ کے کمرے میں کیسے چلا گیا؟ پورٹر بولا:

"سر آپ کا سامان تو آپ ہی کے کمرے میں تھا۔ مس ماریہ وہاں چلی گئی۔"

"بالجبر؟"

"بالجبر ہی سمجھیں۔ یہ دو کمرے برٹش گورنمنٹ نے ریزرو کرائے تھے۔ مس ماریہ نے دونوں دیکھے اور آخر وُہ کمرہ پسند کر لیا جس میں آپ کا سامان رکھا تھا۔ ہم ابھی آپ کا سامان اُٹھا نہ پائے تھے کہ آپ آ گئے۔"

"لیکن ان کمروں میں کُچھ فرق تو نہیں۔ مس ماریہ نے یہ حرکت کیوں کی؟"

"میں مس ماریہ کی نیّت کی تشخیص وثوق سے تو نہیں کر سکتا لیکن وُہ غاصب نہیں لگتی۔ فقط بے چاری LONELY ہے اور ہمدردی کی مستحق ہے۔ رفاقت کا فاقہ بری چیز ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے پورٹر کی آنکھیں دُھندلا سی گئیں، گویا مس ماریہ کی حالت سے متاثر ہو کر کہہ رہا ہو: کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ۔۔ اور پھر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

رحم دِل اور جہاندیدہ پورٹر نے ہمارے خیالات کا دھارا بدل کر رکھ دیا ورنہ سچی بات ہے ہمارے خیالات ذرا فاسد بھی تھے۔

شام کو ڈنر کے لئے ڈائننگ ہال میں گئے تو مس ماریہ کو بدستور کاوش تنہائی سے دو چار پایا۔ بہت دکھ ہوا اور فوراً ہمدردی کے جوش میں اپنی تمام تر رفاقت اس کے قدموں میں ڈھیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنی میز چھوڑ کر محترمہ کی اجازت سے اس کی میز پر جا بیٹھے اور پھر اسے اس طرح مخلصانہ وارفتگی سے دیکھا جیسے کہتے ہیں کہ اے MAIDEN IN DISTRESS (دوشیزہ مظلوم) لے۔ ہم حاضر ہیں۔ اب حکم کر دِل چاہئے یا جان؟ یا دونوں؟ کہ دِل ہے سو چیز تیری، جان ہے سو مال تیرا۔۔ لیکن مس ماریہ نے ہماری جاں نثاری کی پیشکش کا کوئی واضح خیر مقدم نہ کیا۔ بس ہمیں دیکھ کر ذرا مسکرائی اور بولی۔

”آپ آ گئے؟ بیٹھئے۔۔۔ اور جیسا کہ میں کہہ رہی تھی یہ برٹش گورنمنٹ۔۔۔“

اور پھر دس منٹ میں نہیں، بیس نہیں، پورے ایک سو بیس منٹ بلا وقفہ بولتی رہی جیسے اپنی کلاس کو ہسٹری پڑھا رہی ہو۔ ہم پہلے چند منٹ تو کچھ سوچ سمجھ کر ہاں نہ کرتے رہے، لیکن جب محترمہ کی برق گفتاری سے رشتہ معانی ہاتھ سے چھوٹنے لگا اور محترمہ برٹش گورنمنٹ کو روندتی ہوئی برٹش پارلیمنٹ میں جا داخل ہوئی تو ہم نے سر ہلانا بند کر دیا اور ایک سکتے کے عالم میں اس کی لرزتی پھڑکتی سرسراتی سنسناتی زبان کو دیکھتے گئے۔ پھر ہم پر اچانک القا ہوا کہ ماریہ کو بے شک ایک رفیق کی حاجت ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس کے سامنے تنہائی کا مارا دِل چیر کر رکھ دے بلکہ اس لئے کہ فاقے کی ماری زبان توڑ کر رکھ دے۔ بہر حال ایک بات واضح تھی کہ ہمارے بوڑھے اور جہاندیدہ پورٹر کی یہ تشخیص درست نہیں تھی کہ خاتون اکیلی ہے اور ساتھی چاہتی ہے بلکہ یہ کہ خاتون باتونی ہے اور سامع چاہتی ہے۔ لیکن ہم نے سوچا۔ چلو ایک باتونی پڑوسن کا سامع بننا بھی ایک طرح کی سوشل سروس ہی ہے۔ چنانچہ خدمت کرتے کرتے ہم نے کھانا بھی ختم کر لیا لیکن اپنا حسنِ سماعت ختم نہ ہونے دیا۔ پھر اچانک ہمارے لئے ایک ویٹر پیغام لایا کہ آپ کا ٹیلی فون آیا ہے۔ ہم ماریہ سے معذرت کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ہال سے باہر گئے۔ ٹیلی فون سے فارغ ہو کر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ماریہ کے روبرو ہماری نشست پر ایک خوش وضع سا آدمی بیٹھا ہے اور غور سے

دیکھا تو یہ وُہی شخص تھا جو کافی دیر سے ڈائننگ ہال کے دروازے کے قریب منڈلا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"امید ہے آپ مُجھے معاف کر دیں گے۔ میں۔۔۔"

وُہ شخص یہ جملہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ ماریا بولی۔

"مسٹر خان۔ فرنینڈو سے ملیں۔ یہ میرا خاوند ہے۔"

ہم حیران تھے کہ ماریہ نے اتنا جلد خاوند کیسے پیدا کر لیا۔ نرگس کا تجربہ تو یہ ہے کہ ہزاروں سال رونے کے بعد بھی دیدہ ور پیدا ہونے میں نہیں آتا۔ بہر حال ہم نے کہا:

"کیسے مزاج ہیں مسٹر فرنینڈو؟ لیکن آپ کی بیگم نے تو ہمیں نہیں بتایا کہ آپ بھی ان کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔"

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ہمارے سامنے بیگم صاحبہ نے اپنے بیگم ہونے کا ہی اقرار نہیں کیا تھا اور ہم یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ موصوفہ ایک پختہ سی باکرہ ہیں۔ فرنینڈو کُچھ کہنے ہی کو تھا کہ ماریہ جھوٹ بول پڑی۔

"ہم آئے تو اکٹھے تھے لیکن یہاں آ کر یہ گرل فرینڈ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔"

فرنینڈو بولا: "ڈارلنگ یہ الزام غلط ہے اور بہر حال میں معافی مانگ چکا ہوں۔"

”لیکن تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔“

”ڈارلنگ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

پھر ماریہ کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے تھپتھپانے لگا۔ ہاتھ کا ہاتھ سے مس ہونا تھا کہ ماریہ کے دِل کو خبر ہو گئی اور دِل ہی تو تھا، شتابی سے پگھلنے لگا۔ ماریہ ایک گہرا اور خمار آلود سانس لے کر بولی۔

”مسٹر خان۔ آپ کی رفاقت کا شکریہ۔ اب دیر ہو گئی ہے۔ آپ آرام کریں۔“

اپنی برطرفی کا حکم سن کر ہم اُٹھے۔ اپنی سوشل سروس کی نرم و نازک بساط کو لپیٹا اور اپنا سا مُنہ لے کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔ مزید سوچنے پر معلُوم ہوا کہ ماریہ صاحبہ نے بوڑھے پورٹر ہی کو نہیں، ہمیں بھی غچّہ دیا ہے۔ اس عورت کو رفیق کی ضرورت تھی نہ سامع کی، بلکہ ایک عارضی رقیب کی خدمات درکار تھیں کہ اپنے خاوند کی آتشِ حسد کو بھڑکا سکے اور یہ خدمت اس نے ہماری اطلاع کے بغیر ہم سے لے لی تھی۔ ہم زندگی میں خواتین کے بہت کام آئے ہیں لیکن ہمارا یہ استعمال کبھی نہیں ہوا تھا۔ تھی تو شاید یہ بھی ایک قسم کی سوشل سروس لیکن کاش، یہ سروس ہماری بجائے کسی زیادہ معتدِل مزاج شخص سے لی گئی ہوتی۔ قصّہ کوتاہ اس رات ہمیں بہت کم نیند آئی۔ بس ایک

چنگاری میں ہمارے سینے میں سُلگتی رہی اور کیسے نہ سُلگتی کہ ہے ننگِ سینۂ دِل اگر آتش کدہ نہ ہو۔

مس مچل کی پیشکش: میرا لال دوپٹہ ململ کا

دُوسرے روز فرینک ٹرومین سے ملنے گئے تو اسے مس مچل سمیت کاونٹی لائبریری کے باغیچے میں انتظار کرتے پایا۔ ٹرومین گُڈ مارننگ کے بعد گھڑی دیکھ کر بولا:

"آپ بالکل صحیح وقت پر تشریف لائے ہیں۔ دیکھئے گھڑی نے ابھی اسی وقت نو بجائے ہیں اور اس لمحے سے آپ آئندہ آٹھ گھنٹوں کے لئے مس مچل کی کمان میں آ گئے ہیں۔ اسکے بعد آپ کو جملہ احکام مس مچل ہی سے ملیں گے اور مجُھے یقین ہے کہ آپ ان پر مکمل اور غیر مشروط تابعداری کے ساتھ عمل کریں گے۔"

ہم نے کمر سے جھُک کر مس مچل کو سلام کیا، یعنی بولے بغیر حلفِ وفاداری اُٹھالیا۔ ایسے موقعوں پر فلموں میں تو ہیروئن اپنا ہاتھ بھی اُلٹا کر آگے بڑھاتی ہے جسے ہیرو اپنے ہاتھ سے تھام کر اور ہونٹوں سے چوم کر بادِل نخواستہ چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن مس مچل بظاہر وفاداری کا اتنا پختہ ثبوت غیر ضروری سمجھتی تھیں اور اس کی نوبت آ بھی جاتی تو شاید یہ ثبوت ہم بہت کامیابی سے مہیا نہ کر سکتے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مس مچل ان تین مجوزات

میں سے وُہ عجوزہ تھیں جو نصف صدی قبل فالج سے جنگ لڑ کر پروان چڑھی تھیں اور ابھی اتری نہ تھیں۔ بلکہ دوسروں کے کندھوں سے ہی لٹک رہی تھیں اور ان کا جسمانی ساز بالکل بے آواز تھا سوائے زبان کے جس میں آواز بھی تھی اور حرکت بھی۔ لیکن ہرچند کہ موصوفہ ساقین کی کمزوری کی وجہ سے بے سہارا نہیں چل سکتی تھیں تاہم ان کی زبان بے تیغ بھی لڑتی تھی۔ مس مچل نے کمانڈر مقرر ہوتے ہی ہمیں پہلا حکم دیا۔

"چلئے بیٹھئے کار میں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ ہم پورے نو پانچ پر روانہ ہوں گے۔"

ہم کار میں بیٹھ گئے۔ ظاہر تھا کہ آج ہماری ڈیوٹی شہر سے کہیں باہر ہے اور کینٹ میں شہر سے باہر نِکلتا فطرت کی آغوش میں جانا ہے۔ ہم تو خوشی کے مارے قبلہ شیخ صاحب کی طرح۔۔۔ اپنے شیخ چلی مراد ہیں۔۔۔ پیشگی ہی آغوشِ فطرت میں داخل ہو کر کھو گئے اور کھوئے رہے تو آنکہ ہمارے دائیں ہاتھ کی سیٹ پر کوئی جمبو قسم کی چیز نازل ہوئی۔ ہم نے آنکھ کھولی اور دیکھا تو مس مچل بیٹھی ہے۔ ہم نے ازراہِ ہمدردی خیریت مزاج پوچھی اور کہا۔

"میں سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر لٹا دوں؟"

مس مچل بولی: "اگر میں پچھلی سیٹ پر لیٹ گئی تو یہ کار کون چلائے گا؟"

مارے خوف کے ہمارے ہاتھ سے مصلحت کا دامن چھوٹ گیا اور ہمارے مُنہ سے ایک وحشت کے عالم میں نکلا: "کیا آپ خود کار چلائیں گی۔"

مس مچل ہماری طرف دیکھے بغیر نہایت سکون سے بولی۔

"معلُوم تو کُچھ ایسا ہی ہوتا ہے!"

ہم نے ایک فٹ بال کے سائز کا اچھّو روکتے ہوئے دِل میں کہا۔ "مارے گئے" اور زبان سے بولے: "یعنی آپ سچ مچ کار چلا لیتی ہیں؟"

مس مچل مسکراتے ہوئے بولی۔ "کوشش تو کرتی ہوں۔"

اور ادھر مس مچل کے مُنہ سے کوشش کی شش نکلی اور ادھر انجن کے مُنہ سے بررررر نکلی۔۔۔ مس مچل نے انجن سٹارٹ کر دیا تھا لیکن ہم اب بھی اسے اپنی بوڑھی کمانڈر کا غمزہ سمجھ رہے تھے۔ کار کو سٹارٹ تو زبان کے اشارے سے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن کار چلانا دو سالم لاتوں کا محتاج ہے اور ہمیں یقین تھا کہ مس مچل زبان سے خواہ پہاڑوں کا دِل چیر دے، اپنے پاؤں سے پنگ پانگ کے بال کو بھی مخاطب نہیں کر سکتی۔ سو ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں سے کوئی ڈرائیور نمودار ہوتا ہے۔ لیکن دفعتہً ہمیں کار کے پہیوں میں جنبش محسوس ہوئی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو کار سچ مچ حرکت میں تھی بلکہ دوڑنے پر آمادہ تھی۔ میٹر پر رفتار دیکھی تو سوئی صفر سے اچھل کر دس میل عبور کرتی

ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔۔۔۔ تیس۔۔۔ چالیس!(ہم نے مضبوطی سے کار کا گریبان پکڑ لیا)۔۔۔ پچاس! (ہم نے سانس روک لیا)۔۔۔ ساٹھ! (ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا)۔۔۔ ہم سمجھے ایکسلیٹر مس مچل کے پاؤں کے نیچے آکر اتفاقاً دَب گیا ہے اور کار کو بھاگنے کے سوا چارہ نہیں۔ یعنی نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔۔۔ ہمیں دُنیا ختم ہوتی محسوس ہوئی اور آنے والے کریش کے انتظار میں آنکھیں بند کر کے سر زانو پر رکھ لیا۔ اچانک کہیں سے آواز آئی:

"کیا سہانا موسم ہے! ہے نا؟"

ہم نے سہمے سہمے آنکھیں کھولیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مس مچل اطمینان سے دو انگلیاں سٹیرنگ ویل پر رکھے کار چلائے جا رہی ہے اور ساتھ ہی کچھ یُوں گنگنا رہی ہیں جیسے "میرا لال دوپٹہ ململ کا" اور اب ہم سے موسم کی خوشگواری کی تائید کی بھی منتظر ہے۔۔۔ لیکن تائید سے پہلے ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مس مچل کے بے جان پاؤں کار کے ساتھ سلوک کیا کر رہے ہیں اور دیکھا تو بڑھیا اس فنکاری سے بریک کلچ اور ایکسلیٹر پر پاؤں رکھ رہی تھی جیسے موٹر نہیں چلا رہی، پیانو بجا رہی ہے۔ ہم نے مس مچل کے سوال کا جواب دیا۔

"مس مچل۔ موسم بے شک دِلکش ہے لیکن تمہاری ڈرائیونگ سے زیادہ دِلربا نہیں۔"

"داد کا شکریہ۔ اگرچہ حیرت ہے کہ آپ اپنی ڈرائیور پر اس قدر اچانک ایمان لے آئے۔"

"محترمہ۔ اتنے بڑے چشم دید معجزے کے بعد ایمان نہ لانا کُفر ہے اور ہم تو پیدائشی مومن ہیں۔"

مس مچل نے ہمیں ایک پیار بھری آنکھ ماری جو ہماری تحسین کا جواب تھا اور ساتھ ہی اپنے پاؤں کے اشارے سے رفتار کی سوئی کو ستر پر پہنچا دیا جو ہمارے ایمان کا امتحان تھا۔ لیکن ہم مومن تھے۔ ثابت قدم نکلے اور سوئی کو دیکھ کر مُسکرا دیئے۔ آخر مومن کی یہی تو پہچان ہے کہ چوں مرگ آید تبسّم برلب اوست۔ لیکن مس مچل کی چابکدستی سے ہم مرے بغیر مومنانہ شان لئے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

ہماری منزل ایک دماغی شفاخانہ تھا جسے عوامی زبان میں پاگل خانہ کہتے ہیں اور شاید یہی زیادہ حقیقت پسندانہ نام ہے لیکن سب حقیقوں کو ان کے اصلی نام سے نہیں پکارا جاتا۔ مس مچل ہمیں سیدھا ہسپتال کے سربراہ ڈاکٹر ہنری پال کے پاس لے گئی جنہوں نے مصافحہ اور مزاج پرسی کے بعد ہمیں اپنے ہسپتال کے کوائف بتانا شروع کئے۔

"اس ہسپتال میں سترہ سو مریض ہیں لیکن کسی ایک کو بھی اپنے مرض کا اقرار نہیں۔ بلکہ جملہ مریض ڈاکٹروں، نرسوں اور باقی عملے کو خبطی سمجھتے ہیں اور ان کے رہائشی عدم

توازن کے شاکی اور فریادی ہیں۔ مریض سچّے ہیں یا معالج خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے جو اعتماد ڈاکٹروں اور نرسوں کو اپنے ذہنی توازن کے متعلق اس ہسپتال میں آنے سے پہلے تھا وُہ اب نہیں کیونکہ مریض اپنے معالجوں کے علاج سے متاثر ہوئے ہوں یا نہیں، معاج اپنے مریضوں کی صحبت سے یقیناً فیض یاب ہوئے ہیں۔"

یہاں ذرارک کرڈاکٹر صاحب نے ایک اور جملے کا اضافہ بھی کر دیا۔

"اور استفادہ کرنے والوں میں شاید یہ خادم سرفہرست ہے!"

اور یہ کہہ کر ایک ایسا بے تحاشا قہقہہ لگایا جس نے ہمیں چونکا دیا کہ قہقہہ شروع ہونے کے بعد تھمتا نظر نہ آتا تھا۔ قہقہے کے ٹھاٹھ سے یُوں محسوس ہوتا جیسے کھماج میں ہنہنا رہے ہوں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب تو شاید اپنی ظرافت کی داد دیتے ہوئے ہنس رہے تھے لیکن ان کے قہقہے کی طوالت اور تسلسل سے ظاہر تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہنسوڑ مریضوں سے بلاشبہ بھرپور کسبِ فیض کیا ہے۔

ہمارے ذہن میں سوال ابھرااورڈاکٹرپال سے پوچھا۔

"کبھی ان مریضوں میں کوئی ناگوار قسم کا تصادم تو نہیں ہوتا؟"

بولا: ”تصادم تو ہوتا ہے مگر ایسا ناگوار نہیں ہوتا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دیوانہ اکیلا ہو تو تقریر کرتا ہے۔ اگر دو مل بیٹھیں تو مناظرہ کرتے ہیں اور دونوں صورتوں میں خوب گزرتی ہے۔ نہ صرف مقررین کی بلکہ سامعین کی بھی کہ دیوانوں کا تصادم محض خیالات کا تصادم ہے۔ یہ مفادات کا تصادم نہیں کہ استحصال کی نوبت آئے۔ وُہ فرزانوں کا کھیل ہے۔“

ڈاکٹر پال سے ولائتی پاگلوں کی رواداری کا قصّہ سُنا تو محسوس ہوا کہ یہ مخلوق دُنیا بھر میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ گورے اور کالے ہوشمندوں میں ہزاروں فرق سہی، گورے اور کالے پاگلوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن مزید سوچا کہ فطرت کی کیا ستم ظریفی ہے کہ انسانی مساوات کا آدرش صرف پاگل پن کی سطح پر قابلِ حصول ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے بعد مس مچل ہمیں شفاخانے کی لائبریری دکھانے لے گئیں جہاں کئی معزز ”مریض“ بیٹھے مصروفِ مطالعہ تھے۔ مس مچل نے ہمارا دو تین اصحاب سے تعارف کرایا اور باہم بڑی سنجیدہ باتیں شروع ہو گئیں۔ ایک صاحب جو برٹرینڈ رسل کی کتاب پڑھ رہے تھے ہمارے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کرنے لگے۔

"مصنّف مخبوط الحواس ہے۔ میں مناظرے کے لئے تیار ہوں۔ کیا لندن جا کر آپ اسے میرا چیلنج پہنچا دیں گے؟"

ہم نے بخوشی یہ کارِ خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا اور اپنے دوست سے ایک معانقے کا انعام پا کر بخیریت لائبریری سے نکل آئے۔ واپسی پر راہ میں مس مچل سے پوچھا۔

"ان لوگوں کو رسل کی کتابیں دے کر آپ کتابیں ضائع نہیں کر رہے؟"

بولی۔ "ہمارا کام ان کی فرمائش پوری کرنا ہے۔ ویسے رسل کی کتابیں اکثر قارئین پر ضائع ہی ہوتی ہیں۔"

الحمدللہ یا شیخ الکومب

ہوٹل میں پہنچے تو ہر چند کہ دن بھر کی تکان کے بعد ضرورت آرام کی تھی تاہم ہم نے فی الفور غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور کرنل کومب کے انتظار میں بیٹھ گئے۔۔۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی شب مس ماریہ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہمیں اچانک ٹیلی فون پر طلب کیا گیا تھا۔ ٹیلی فون پر ہم نے ہیلو کی تو اُدھر سے عربی زبان اور انگریزی لہجے کے ملغوبے میں جواب آیا۔

"السلامُ علیکم یا حبیبی، کیف حالک؟"

اور ہم سمجھ گئے کہ یہ جان کومب بول رہا ہے کیونکہ بھرے انگلستان میں یہ واحد انگریز دوست تھا جو عربی بھی بولتا تھا اور ہمیں حبیب بھی سمجھتا تھا اور ہمیشہ اسی انداز سے ابتدائے گفتگو کرتا تھا۔ ہم نے بھی اشتیاق بھرے لہجے میں وُہی جواب دیا جو دیا کرتے تھے۔

"الحمد للہ یا شیخ الکومب انت طیب؟"

اس جواب کے بعد ہماری عربی ختم ہو گئی اور کرنل کومب کی مزید عربی کی روانی بھی رُک گئی۔ چنانچہ اس نے انگریزی کا نٹا بدلتے ہوئے اپنے مخصوص بے تاب انداز میں خیر و عافیت پوچھی اور کہا۔

"کل شام کیا کر رہے ہو؟"

اس وقت ہم ماریہ کی محفل سے عارضی طور پر اُٹھ کر آئے تھے اور فرنینڈو نے ابھی دخل در معقولات نہیں دیا تھا۔ چنانچہ ایک نشے کے عالم میں کہا۔

"جان۔۔۔ یہ تو ماریہ سے پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔"

ماریہ کا نام سن کر کرنل کومب کے مُنہ سے ایک انگریزی جملہ نکلا جس کا پہلا حصّہ ناقابلِ تحریر ہے۔ لہٰذا حذف کیا جاتا ہے۔ باقی جملہ یہ تھا۔

”کل شام پانچ بجے تمہیں ہوٹل سے لینے آرہاہوں۔ تیار رہنا۔“

”لیکن ماریہ۔۔۔۔“

کرنل کومب نے ماریہ کے متعلق ایک اور ناگفتنی لیکن بے حد شنیدنی کلمہ دہرایا۔۔۔۔ عورت کے سامنے انگریز سے زیادہ مؤدب کوئی نہیں اور اس کی غیر حاضری میں انگریز سے بڑھ کر دریدہ دہن بھی کوئی نہیں۔۔۔ آخر میں حکم دیتے ہوئے کہا۔

”کل شام پانچ بجے تیار رہنا۔ بالکل تیار۔ بہانہ مافیش۔“

ناچار ہمارے مُنہ سے نکلا۔ ”نعم یاسیدی!“

اور دِل میں سوچا کہ چلو کرنل کومب کی خاطر کل مس ماریہ سے چھٹی لے لیں گے لیکن جیسا کہ آپ کو معلُوم ہے چند ہی لمحوں بعد فرنینڈو کی آمد نے ہمیں ماریہ سے چھٹی کی بجائے پنشن دِلا دی تھی۔۔۔ مایوسی اور نامرادی کی پنشن جسے حاصل کر کے ہم شب بھر بستر میں سلگتے رہے تھے اور کرنل کومب جیسے عزیز دوست کی متوقع ملاقات کی خوشی بھی ہماری آتشِ ارمان کو فرو نہ کر سکی تھی: دِل ہی تو تھا نہ سنگ و خشت۔۔۔ لیکن دُوسرے دن دیوانوں اور فرزانوں کی رنگارنگ صحبت میں ہمیں غمِ ماریہ سے کُچھ افاقہ ہو گیا اور پچھلے پہر لوٹے تو جان کومب کی آتشِ شب کی ملاقات ہمیں ایک ہونہاری تقریب نظر آنے لگی۔

کیا تعزیت میں زوجیت ملائی جا سکتی ہے؟

جان کومب ہمارے پرانے یار تھے اور بڑے رونق آفریں یار۔ آیئے ان کا آپ سے تعارف کرائیں: ہمیں ملنے سے پہلے کرنل کومب برطانیہ میں توپیں چلا چکے تھے، سوڈان میں مونگ پھلی بیچ چکے تھے اور ملایا میں تعلیم دے چکے تھے۔ پھر پاکستان میں آ کر کیڈٹ کالج پٹارو کی سربراہی سنبھالی۔ پہلے کالج کی بنیاد رکھی پھر اس کی آبیاری کی اور آخر اسے پروان چڑھایا۔ متواتر چھ سال اس کے پرنسپل رہے اور متواتر چھ سال ہمارے رفیق رہے۔ ہمارا سرکاری رشتہ یہ تھا کہ وُہ کالج کے پرنسپل تھے اور ہم ان کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن تھے لیکن پہلی ملاقات کے بعد یہ رشتہ فائلوں میں دب دبا گیا اور اس کی جگہ ایک نئے رشتے نے لے لی۔ جس کا ایک سرا جان کومب کے دِل میں اور دوسرا ہمارے قلب میں پیوست تھا لیکن اس رشتے کی استواری سراسر جان کے مخلص اور مثبت دِل کی وجہ سے تھی ہم ہی نہیں، جان کا ہر جاننے والا اپنے دِل پر اس دِلبر کے خلوص کی گرفت محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ جان بڑے مقبول تھے؟ جان کی ہر دِلعزیزی کی تشنہ سی تعریف ہے۔ جان مقبول نہ تھے، محبوب تھے۔ آپ پاکستان ہی میں تھے کہ انگلستان سے آپ کی بیگم کی موت کی خبر آئی۔ جان ولایت گئے اور تجہیز و تکفین کے بعد واپس آئے تو کراچی کی کئی فارغ میموں نے تعزیت میں زوجیت کی

پیشکش بھی شامل کر دی لیکن جان نے اپنی ہر دلعزیزی کھوئے بغیر صرف تعزیت قبول کی اور دُوسری چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا یا معمولی چھو کر چھوڑ دیا۔ ہاں صرف ایک خاتُون کی کہ یہ پیمائشِ ثلاثہ کے اعتبار سے ناقابلِ انکار سی امیدوار تھی، جزوی حوصلہ افزائی کی یعنی اسے شرفِ ہمدمی بخشا لیکن اس تعلق کو شادی کی تکلف سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ غالباً یہ مرحومہ کے احترام کا تقاضا تھا اور شاید یہ اسی احترام کی توسیع تھی کہ تین سال بعد آخر پاکستان چھوڑ کر ولایت گئے تو تنہا گئے۔ مگر اپنی پسماندہ کا دِل بُرا نہ ہونے دیا۔ یعنی اسے ایک تسلی بخش نعم البدل ڈھونڈنے کی فراخدلانہ چھٹی دے دی اور یہی رعایت اپنے لئے بھی محفوظ رکھی کہ اس سے فائدہ اُٹھانے کے مواقع ولایت میں کہیں زیادہ تھے۔ ایسی خوشگوار جدائیاں اس دُنیا میں شاذ ہی واقع ہوتی ہیں لیکن جان کی سدا بہار شخصیت فراق میں بھی وصال کی شیرینی گھول دیتی تھی۔۔۔ سو یہ تھے کرنل جان کومب جن کے انتظار میں ہم نہا دھو کر گرینڈ سٹار ہوٹل میڈ سٹون کے دروازے پر کھڑے تھے۔

پورے پانچ بجے ہوٹل کی ڈیوڑھی کے سامنے ایک کار رکی اور حسبِ توقع کرنل کومب بر آمد ہوئے۔ وُہی بھاری بھر کم جثہ، وہی کھرج کی آواز، وُہی بے تکلّف مسکراہٹ، وُہی مُنہ میں پائپ اور ہاتھ میں تولیہ بعوض رومال کہ جان رومال کی تنگ دامانی سے بیزار تھے۔۔۔ ہم سے مصافحہ کے بعد چھوٹتے ہی سوال کیا۔

”تمہاری ماریہ کہاں ہے؟“

کہا۔ ”ایک تو ماریہ ہماری نہیں۔ دُوسرے جس کی ہے اسے ہی معلُوم ہو گا کہاں ہے۔“

”میں سوچ رہا تھا ماریہ کو بھی ساتھ لے چلتے۔“

”جان بھول جاؤ ماریہ کو۔ مجُھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کا اپنا ذاتی خاوند بھی ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟ اس کا اپنا خاوند ہے تو ہماری اپنی بیوی بھی ہے۔ مہذب لوگ فیملی سے باہر بھی ایک دُوسرے کے کام آتے ہیں۔“

جان اور ”اپنی بیوی۔“ ہمیں حیرت ہوئی۔۔۔ جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔ ”کیا کہا اپنی بیوی؟“

بولا: ”تم نے جو کُچھ سنا ہے ٹھیک سنا ہے۔“

”سچ مچ! تمہارا مطلب ہے اصلی بیوی جیسی کہ ہوتی ہے؟“

”لیکن اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور دُنیا میں کوئی دھماکہ نہیں ہوا، بی بی سی بھی چپ سادھے بیٹھی رہی۔ یہ سب کُچھ کب کہاں اور کیسے ہو گیا؟“

جان آرام سے بولا: ''جہاں تک کب کا تعلق ہے، یہ ہو چکی ہے بات پرانی نہ پوچھئے۔ جائے وقوعہ وُہی ہے جہاں اب جا رہے ہیں۔ باقی رہا کیسے؟ تو یہ سوال پوچھنا شرفا کے بیڈ روم میں جھانکنے کے برابر ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''بجا۔۔۔ چلو بھابھی سے ملاؤ۔''

چلے تو دیکھا کہ اسی سڑک پر جا رہے تھے جو پاگل خانے کو جاتی تھی۔ یعنی جو آج مس مچل کی جولانگاہ رہ چکی تھی اور جس پر موصوفہ کی معرفت موت سے ہماری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں جان کی کار میں نوائے زندگانی بڑی نرم خیز تھی۔ میٹر کی سوئی اس احتیاط سے تیس اور پینتیس کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی گویا میناخانہ بار روش ہے۔ کہاں وُہ مس مچل کی سوئی کی سرمستیاں کہ قیامت ہم رکاب معلُوم ہوتی تھی اور پھر سوئی ساٹھ پر ہوتی تو زبان ستر پر! ادھر جان پینتیس میل فی گھنٹہ سے آگے نہ بڑھتے تھے کہ پھر باتیں نہ کر سکتے تھے۔ کہتے تھے: پینتیس سے زیادہ تیز چلانے کے لئے دانت بھینچنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں مس مچل والی ہنگامہ خیز گڑ گڑاہٹ تو نہ تھی لیکن جان کے عربی لطیفوں کی گدگداہٹ ضرور تھی۔

ایشفورڈ کے خوبصورت قصبے سے گزر کر ایک خوبصورت تر گاؤں سمیدھ میں پہنچے تو جان نے ایک کھلے باغیچے میں داخل ہو کر ایک چھوٹے سے پیارے سے بنگلے کے سامنے کار روکی۔ بولا:

"یہ ہے غریب خانہ۔ پسند ہے؟"

"باہر سے بُرا نہیں۔"

اندر داخل ہوئے تو ڈیوڑھی میں ایک شفاف اور بجلی سے منوّر شوکیس میں ایک ضخیم کتاب رکھی تھی۔ بڑھ کر جو دیکھا تو حیران رہ گیا: قرآن مجید تھا! ہمیں متحیّر دیکھ کر جان بولا:

"غریب خانہ باہر سے تو برا نہیں۔ اندر سے کیسا ہے؟"

"نور، علیٰ نور ہے۔" ہم نے بلا تامّل کہا۔

اور قرآن مجید اُٹھا کر ہم نے آنکھوں سے لگا لیا۔ ہمیں یاد آیا کہ پٹارو کالج کی دُعائے صبحگاہی کے دوران تلاوتِ قرآن کے بعد بچّوں کو آیات کریمہ کا ترجمہ سنایا جاتا تھا تو یہ فرض جان کومب بحیثیت پرنسپل خود ہی انجام دیتے تھے۔ بلکہ معلُوم ہوا کہ یہ وُہی

پٹارو والا نسخۂ پاک ہے جسے جان ساتھ لے آئے تھے اور اب اسے قیمتی متاع سمجھتے تھے۔

خبر دار! اس تعارف میں جان کا خطرہ ہے

ابھی ڈیوڑھی ہی میں کھڑے تھے کہ ایک اڈھیر عمر کی سادہ اور ستو نتی سی خاتون درونِ خانہ سے نکلی۔ جان نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''ڈارلنگ۔ یہ ہے میرا دوست خان، لیکن اسے شدید سا شُبہ ہے کہ تم واقعی میری جائز اور منکوحہ بیوی ہو۔''

نمرد قارئین، براہِ کرم بتائیں کہ کبھی آپ کے کسی دوست نے اس انداز سے اپنی بیوی سے تعارف کرایا ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو ذرا اس آلے کا نام بھی بتا دیں جس کے ساتھ محترمہ نے آپ کا خیر مقدم کیا: طمنچہ؟ کفگیر یا پاپوش وغیرہ وغیرہ؟ خوش قسمتی سے ہماری میزبانہ کے ہاتھ میں تو کُچھ نہ تھا لیکن اس کے ناخنوں کی تیزی کے متعلق کُچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ بظاہر تو ہم نے جھک کر ایک خاموش اور خوشامدانہ سلام کیا مگر بباطن ایک مضبوط دفاعی پوزیشن لے کر آنے والے وار کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن دیکھا تو وُہ دریا دِل خاتُون لبوں پر تبسّم، آنکھوں میں شبنم اور ہاتھوں میں ریشم لئے

ہماری طرف بڑھنے لگی۔ پہلے ہم سے ایک مخملیں سا مصافحہ کیا پھر ہمارا مزاج پوچھا اور آخر میں اپنے خاوند سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تمہارے ماضی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ اپنے شکوک میں بالکل حق بجانب ہیں۔"

جان بولے۔ "گویا میں جو دو سال سے فرمانبرداری سے خاوندی کر رہا ہوں اس کی اسلئے قدر نہیں کہ زمانہ قبل میں دانہ گندم کھا لیا تھا (پھر ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے) خان میں ایک مظلوم خاوند کی حیثیت سے تم سے کہ تم بھی ایک خاوند ہو انصاف کا طالب ہوں۔"

ہم نے بین وجوہات کی بنا پر ثالث بننے سے انکار کر دیا۔ جان نے انصاف کا دروازہ بند دیکھا تو بولا۔

"ایلسی، میں تم سے لڑائی کا حق محفوظ رکھتے ہوئے اس وقت صلح کی درخواست کرتا ہوں کہ چائے کے لئے جان نکل رہی ہے۔ پلیز ڈارلنگ چائے تو پِلا دو۔"

ایلسی کی مسکراہٹ ذرا اور پھیل گئی۔ جان بھی کُچھ اور برخوردار نظر آنے لگے اور اس مکمل امن کی فضا میں ہم بھی ذہنی مورچے سے نکل آئے۔ ظاہر تھا کہ جان کا مقصد اس چھیڑ کو گھر میں بھی جاری رکھنا تھا جو کبھی خوباں سے گھر کے باہر روا رکھتے تھے۔

مسز کومب نے ہمیں دیوان خانے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا اور خود کچن میں چلی گئیں۔ دیوان خانے کے وسط میں چارپائی کے برابر تپائی رکھی تھی جو شریں و نمکین ماکولات سے پُر تھی۔ صرف چائے آنا باقی تھی۔ ہم یکّے بعد دیگرے ماکولات کو ٹھونگنے لگے لیکن کرنل کومب چائے سے پہلے کسی مادی شے کو چکھنا یا چھونا چائے کی تقدیس پر حملہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وُہ تلملاتے کھڑے رہے لیکن جونہی مسز کومب بھاپ چھوڑتی ہوئی چائے دانی لے کر دروازے سے نمودار ہوئی، جان نے مستانہ وار ایک ناقابلِ فہم انگریزی نعرہ بلند کیا اور آناً فاناً چائے کی پیالی بنا کر دُوسرے لمحے میں غٹ غٹ پی گیا۔۔۔ تیسرے لمحے جان نے ایک اور پیالی بنائی جو چوتھے لمحے میں چڑھا گئے اور پھر قدرے آسودہ ہو کر اپنا انگریزی نعرہ دہرایا جو اب کے ہماری سمجھ میں آ گیا:

[63]IT'S NOT TEA; IT'S NECTAR,NECTAR۔۔۔۔۔

معاً ہمیں اپنے گاؤں کا سائیں حبیب یاد آ گیا جو تازہ بھنگ کا پیالہ ہاتھ میں تھام کر پینے سے پہلے جھومتا تھا اور پھر لمبی لَے میں نعرہ لگاتا تھا۔

---

[63] یہ چائے نہیں نیکٹر ہے نکیٹر۔ (نیکٹر یونانی دیوتاؤں کے مشروب کو کہتے ہیں اور پھُولوں کے رس کو بھی جس سے شہد بنتا ہے)۔

[64]"ساوی نہیں، گھاہ اے۔ عاشقاں نوں مباح اے۔"

ہم نے نعرہ تو نہ لگایا۔ لیکن چائے کے دو چار گرم اور گداز گھونٹوں کے بعد ہمارے اندر بھی ایک نعرے نے کروٹ ضرور لی۔ اور سچّی بات ہے مسز کومب کی موجودگی مانع تھی ورنہ ہم بھی جان کو سب کے مقابلے میں دمادم مست قلندر کی صدا لگاتے۔ بلکہ تھوڑا سا دھمال کھیل کر غبارِ خاطر سے بھی نجات حاصل کرتے۔ بہر حال اس منصوبے کو تو مکمل نہ کر سکے لیکن ہماری نیّت کا رُخ واضح تھا۔ صرف مسز کومب ہی تھی جو متبسّم مگر بے آواز ہونٹوں سے ننھی چسکیاں لگاتی بیٹھی رہی اور کسی چھوٹے بڑے نعرے کا قصد نہ کیا۔ اور مسز کومب کیلئے یہی مناسب بھی تھا کہ نعرہ زن عورت اذان دینے والی مرغی کی طرح کُچھ جچتی بھی نہیں۔۔۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ کئی سیاسی طبیعت کی خواتین اور مذہبی مزاج کی مرغیاں ہماری پسند کا خیال نہیں رکھتیں۔۔۔ مسز کومب بڑی شستہ مذاق خاتُون تھیں اور یہ انہیں کی کوشش تھی کہ ہماری گفتگو کو رندانہ نعروں اور دھمالوں سے نکال کر شریفانہ چال ڈھال تک لے آئی۔

---

[64] بھنگ حرام شے نہیں کہ یہ فقط گھاس ہے جو عاشقوں کے لئے حلال ہے۔

باریں برسیں کھٹن گیا۔۔۔

شام ہوئی تو جان ہمیں اپنے گاؤں کی پب PUB میں لے گئے جو باہر سے حجرہ شاہ مقیم معلُوم ہوتی تھی۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کہیں جٹّی صاحباں[۶۵] بھی بہر عرض کھڑی ہو۔ لیکن نظر نہ آئی۔ مگر اندر جھانکا تو چوپال دکھائی دی جو مقامی جاٹوں سے بھری پڑی تھی۔: وہی دھواں، وُہی دھکے، وُہی قصّے اور وُہی قہقہے۔ اس انگریزی چوپال کے لوازمات بے شک کسی قدر مختلف تھے لیکن حالات میں کوئی فرق نہ تھا۔ مثلاً حقّہ نہ تھا لیکن حقے کے برادرانِ خرد، سگریٹ اور سگار سینکڑوں کی تعداد میں پھونکے جا رہے تھے۔ لسّی نہ تھی لیکن لسّی کی ولائیتی بہن بئیر BEER پیپوں کے حساب سے پی جا رہی تھی اور حقّے اور لسّی کو چھوڑ کر وُہی چوپال کا سماں تھا۔ شہ زوروں کی لن ترانیاں، نوسربازوں کی ریشہ دوانیاں، مے نوشوں کی شرطیں، مسخروں کی شرارتیں، مُٹیاروں کی باتیں اور عشّاق کی گھاتیں۔ یُوں لگا جیسے میلہ چراغاں کے ایک گوشے میں آ نکلے ہوں۔ جان کھینچتے کھینچتے ہمیں ایک کورس گاتی ہوئی ٹولی کی طرف لے چلا اور دور ہی سے گلا پھاڑتے ہوئے کورس میں شامل ہو گیا۔ کورس کے الفاظ بہت پاکیزہ نہ تھے اور جان فالتو گلا پھاڑ کر ان کی ناپاکی کو مزید جلا بخشنے لگا۔ پھر ہمیں خاموش دیکھ کر ہاتھوں کے

---

[۶۵] حجرے شاہ مقیم دی اک جٹی عرض کرے۔

اشارے سے ہمیں بھی نغمے پر اکسانے لگا۔ لیکن ہم نے ہاتھوں کے اشارے سے ہی معذوری ظاہر کی اور خاموش رہے۔ اس پر کورس ختم ہوتے ہی جان نے ہم سے بدلہ لیا یعنی ظالم کی تجویز پر اہلِ مجلس نے متفقّہ طور پر ہم سے پاکستانی گانا سُنانے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں تو ایک دانائے راز کا قول یاد آیا کہ جس بات سے مفر نہ ہو اسے اتنا ہی سلیقے اور خوش اسلوبی سے کرنا چاہئے جیسے اپنے شوق سے کیا جا رہا ہو۔ چنانچہ انگیٹھی کے سامنے سے چمٹا اُٹھایا اور دونوں ہاتھوں میں اسے سر کی بلندی تک لے جاتے اور بجاتے ہوئے معروف لَے میں نغمہ سنج ہوئے:

اوئے باریں برسیں کھٹّن گیا تے کھٹ کے لے آیا ٹاسا

تے ساڈے کولوں گھنڈ کر دی، ننگا رکھدی کلپاں والا پاسا

تے ساڈے کولوں گھنڈ کر دی،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[٦٦]

اور یہاں پہنچ کر ہم نے سامعین کو ساتھ دینے کا اشارہ کیا تو انہوں نے جان و دِل سے لبیک کیا اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق پنجابی لفظوں کو انگریزی گلوں میں دھنکنا

---

[٦٦] بارہ برس کے لئے کمانے کو بھیجا اور کما کر لایا۔ ٹاس۔ ہم سے گھونگھٹ کرتی ہے اور سر کے بالوں والی وہ طرف جہاں کلپ (CLIP) لگا رکھے ہیں، ننگی رکھتی ہے۔

شروع کیا۔۔۔ اس کے بعد جن بین الاقوامی سروں اور سرگموں کا کورس وجود میں آیا اسے سن کر اہلِ کینٹ کے جملہ آباو اجداد اوّل تو اپنی قبروں سے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہوں گے ورنہ ہر ایک نے ایک طوفانی کروٹ ضرور لی گی۔

پب سے لوٹے تو ڈنر تیار تھا۔ میز کے گرد بیٹھے تو خلافِ معمول خاموشی تھی۔ جان نے گرما گرم پلیٹوں کی آمد پر کوئی نعرہ بلند نہ کیا بلکہ ابتدائے طعام سے پہلے گریس GRACE پڑھی۔ جسے انگریزی الحمدللہ کہہ لیں۔۔۔ پھر اپنے ہاتھ سے کھانا تقسیم کیا اور بڑی متانت سے اور جنبشِ لب کے بغیر کھانا کھایا۔ کوئی بات کی بھی تو بڑے کومل پردوں میں۔۔۔ جیسا کہ ہم نے کسی دُوسری جگہ [67] کہا ہے۔ انگریز عجیب جانور ہے۔ سنجیدگی کے موقع پر کم بخت برف بن جاتا ہے کیا مجال جو رسوم و قیود سے ہٹ کر بات کرے۔ لیکن تفریح کا مقام ہو تو اس سے کوئی بے اعتدالی کوئی بدپرہیزی اور کوئی بے وقوفی بعید نہیں۔

چنانچہ کھانے کے خاتمے پر کافی آئی اور جان نے اپنا سگار سلگایا تو متانت پھر کسی چور دروازے سے غائب ہونے لگی۔ آخر نیم شب کے قریب جان ہمیں ہوٹل میں چھوڑنے چلے تو راہ میں ان کے لطیفے، ظریفے اور کثیفے پاکیزگی سے اتنے ہی فاصلے پر

---

[67] بجنگ آمد باب ۱۹

تھے جتنی کنٹر بری کے گرجے سے سوُہو کی نائٹ کلبیں اور دُوسرے روز ہمیں سیر کرائی گئی تو معلُوم ہے کہاں کی؟ کنٹر بری کے گرجے کی!

جہاں خدا ایک جزوقتی خدمت گار ہے

اقبال کا ارشاد ہے کہ ایسے کور زوق جہاں میں زندہ رہنا فضول ہے کہ یزداں دارد و شیطان نہ دارد۔ لیکن معلُوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد اہلِ پاکستان ہی کے لئے ہے جہاں زندگی یا کم از کم زندگی کا فرنٹ ویو بیشتر اللہ ہو ہی ہے۔ فرنگ میں یہ مصرع اُلٹ کر پڑھنا چاہیئے کہ وہاں بظاہر شیطان زیادہ اور یزداں کم دستیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ دُوسری صبح جب ہمیں مسز جیکب کے سپرد کیا گیا اور موصوفہ نے ہماری سیر کے لئے کنٹر بری کے شہر اور مضافات کا انتخاب کیا تو معاً ہمارے ذہن میں وہاں کے مشہور گرجے کا نقشہ اُبھرا اور ہم نے ارادہ کر لیا کہ وہاں جا کر یزداں کی کمی پوری کریں گے۔ لیکن گرجے میں پہنچے تو وہاں سب کُچھ دیکھا صرف یزداں نظر نہ آیا۔ وُہ بلند و بالا عمارت، وُہ دیواروں کا سنگ و بلور، وُہ تصویروں کے رنگ و خطوط، وُہ مُردہ پرُوہتوں کے خوابیدہ مجسمے، وُہ زندہ بشپوں کے بیدار خطبے۔ معلُوم ہوتا تھا یہ خانہ خدا نہیں پادری خانہ ہے جہاں خدا محض جزوقتی خدمت گار ہے۔ جی تو چاہا کہ اس پادریانہ تجاوز پر خدا کی طرف سے احتجاج کریں اور مس جیکب سے جواب مانگیں لیکن سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔

پہلے تو ہمیں وطنِ عزیز کے مولانا الف یاد آئے، پھر امام ب یاد آئے، پھر مفتی ج یاد آئے، اور پھر قاضی د یاد آئے اور تصوّر میں دامِ تزویر کے رنگا رنگ تھان کھل گئے۔ ہم نے سنگ نیچے پھینک دیا اور اس لئے پھینکا کہ خدا کے نام پر خلقِ خدا کی حجامت فقط اہلِ مغرب کا اجارہ نہیں۔ اس فن میں کُچھ ہمیں بھی دسترس ہے بلکہ اقبال نے تو ان فنکاروں کی باقاعدہ فہرست بھی دی ہے۔

خلقِ خدا کی گھات میں رند وفقیہہ ومیر و پیر

اور پاکستان کی آبادی سے رند وفقیہہ ومیر و پیر اور دیگر حجام نکال دیئے جائیں تو پیچھے ماوشما ہی رہ جاتے ہیں اور ماوشما کے متعلق خود اقبال کو بھی معلُوم نہ تھا کہ بیچارے جائیں تو جائیں کہاں؟ اسی لئے تو خدا سے پوچھتے رہے کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دِل بندے کدھر جائیں

بات گرجے کی تھی اور گرجا دیکھ کر ہم پر متوقع معرفت کے در وانہ ہوئے لیکن شہر سے نکل کر جب مسز جیکب ہمیں چھوٹے چھوٹے دیہات میں لے گئی اور اپنی سفری لائبریری کی کتابیں تقسیم کرنے گئی تو جملہ دیہاتوں خصوصاً دیہاتی بچّوں کی آنکھوں میں مسرّت اور ممنونیت دیکھ کر ہمیں مسز جیکب کے سراپے میں یزداں نظر آنے لگا۔

وُہی یزداں جو کنٹربری کے گرجے سے بے دخل ہو چکا تھا۔ معاً ہم پر کھلا کہ خدا گرجے میں نہیں، دِل دردمند میں رہتا ہے۔

سوزن کے سامنے ہمیں انگریزی بھول گئی

اگلے روز ہمارا کینٹ کاونٹی کا آخری بیرونی دورہ تھا اور اس روز ہمیں کاونٹی کا ایک چھوٹا سا مگر نہایت پیارا کتب خانہ دکھایا جانا تھا جو لارک ہل کے قصبے میں واقع تھا۔ ہمارے اس روز کے رہنما خود مسٹر ٹرومین تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کی معیّت میں ہم خصوصی توجّہ اور تواضع کا مرکز ہوں گے۔ مگر لارک ہل پہنچے تو کتب خانے کے دروازے پر ہمیں خوش آمدید کہنے کو کوئی نہ تھا۔ بلکہ دروازہ خود بھی ہونٹ سیئے کھڑا تھا۔ اس بے دربان دروازے کا دہن تو خیر فرینک ٹرومین نے اپنے کھردرے سربراہانہ ہاتھوں سے وا کر دیا مگر اندر جا کر لائبریرین کے کیبن پر دستک دی تو بڑے خادمانہ انداز میں۔ اور جب تک اندر سے کم اِن (COME IN) کی آواز نہ آئی امیدواران کواڑ تھامے باہر کھڑا رہا۔ آخر اندر داخل ہوا تو میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون نے، جو کُچھ لکھ رہی تھی، سر اُٹھائے بغیر کہا:

"بیٹھیئے۔۔۔ میں آخری سطر پوری کر لوں۔"

ایک ماتحت لائبریرین کی جانب سے جو خاتُون ہی سہی، یہ ادا ہمارے نزدیک بے ادبی بلکہ گستاخی تھی۔ لیکن ٹرومین ایک مخلص اور بے لوث زن مرید کی طرح خاموش کھڑا رہا۔ ہم حیرت سے کبھی ٹرومین کے مُنہ کو اور کبھی لائبریرین کے سر کو دیکھتے۔۔۔ لائبریرین کا جھکا ہوا چہرہ ابھی تک اوجھل تھا۔۔۔ تاآنکہ اس نے آخر کار سر اُٹھایا اور ظالم نے جونہی اپنی لمبی اور بھاری پلکوں کا بوجھ بلند کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھا، دُنیا ودین میں ہلچل سی مچ گئی کہ یہ آنکھیں نہ تھیں، مَے سے چھلکتے ہوئے پیمانے تھے۔

اگر ہمیں اسی کافرہ سے خصوصی توجّہ اور تواضع کی توقع تھی تو بڑی ناروا توقع تھی۔ اس وقت اگر جن و انس کی توجّہ اور تحسین کا کوئی واحد مستحق مرجع تھا تو یہ دو آنکھیں تھیں۔ ایک لمحے کے لئے سکوت سا چھا گیا لیکن پھر فرینک ٹرومین اچانک بولے۔

"سوزن۔ ملئے ہمارے مہمان مسٹر خان سے۔"

سوزن نے مصافحہ کے لئے ہماری طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک تبسّم میں لپٹا ہوا مزاج پرسی کا کلمہ کہا۔ ہم نے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لیتے ہوئے تبسم کے جواب میں تو تبسم کیا مگر کلمے کے جواب میں زبان گنگ پائی۔ ہمیں انگریزی ہمیشہ دو موقعوں پر بھول جاتی ہے۔ انگریزوں کے سامنے اور حسینوں کے سامنے اور سوزن تو دوآتشہ تھی کہ انگریز

بھی تھی اور حسین بھی۔ دراصل سوزن میں ایک اور قسم کی آتش بھی تھی لیکن ہم اس آگ کو کرید کر قارئین میں دہشت نہیں پھیلانا چاہتے۔

پھر سوزن نے اپنی توجہ اپنے باس کی طرف موڑی اور گویا ہوئی۔

”مگر فرینک تم دس منٹ لیٹ ہو۔“

گویا سوزن صاحبہ اپنے افسر سے نہیں، کسی اخبار فروش لونڈے سے بات کر رہی تھیں۔ لیکن ٹرومین کہ سوزن کی بے باکی اور بے تکلّفی کا خوگر تھا کسی قدر شرارتاً بولا۔

”لیٹ؟ کس چیز کے لئے؟ کوئی خیرات حسن کی تقریب تھی؟“

اور ساتھ ہی سوزن کے شاداب سراپے پر غور سے نظر ثانی کرتے ہوئے اس نے امیدوارانہ جھولی پھیلا دی۔ سوزن نے کنایہ سمجھتے ہوئے بھی شرمانے کا تکلّف نہ برتا۔۔۔ بلکہ بالکل بے پروایانہ بولی۔

”حسن کی نہیں، کافی کی خیرات تھی۔ میرے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی۔“

ڈومین کہ اس وقت کافی پینا اپنا حق سمجھتا تھا۔ کسی قدر حیرانی سے بولا۔ ”تمہارا مطلب ہے اب ہم کافی سے بھی محروم رہیں گے؟“

”خیال تو یہی ہے سوائے اس کے کہ کوئی معجزہ واقع ہو جائے۔“

”مہمان کا بھی خیال نہ کرو گی؟“

”مہمان کا خیال علیحدہ رکھا جا سکتا ہے لیکن تمہارے نصیب میں مُجھے کافی نظر نہیں آتی۔“

اتنے میں ایک بوڑھا سا ملازم، ایپرن پہنے، کافی کا دُخانی پیالہ ٹرے میں رکھے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہم نے پیالہ اُٹھایا تو ٹرومین ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے چلایا۔

”BUT WHAT ABOUT ME, GEORGE?“

جارج نے سوزن کی طرف دیکھا۔ سوزن نے ہوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”جارج فقط اپنے باس سے آرڈر لیتا ہے اور وُہ باس میں ہوں۔“

ٹرومین بولے: ”اس صورت میں مس سوزن گلبرٹ بھی اپنے باس سے آرڈر لے گی جو میں ہوں اور فی الفور کافی کا ایک ایسا ہی دخانی پیالہ اپنے پیارے باس کو پیش کرے گی۔“

سوزن نے ایک لمحے کے لئے ٹرومین کے چہرے کا مطالعہ کیا اور کہنے لگی۔

”ماتحت کو صرف قانونی حکم دیا جا سکتا ہے ایک پیارا باس بھی لائبریرین سے کتاب مانگ سکتا ہے، کافی نہیں مانگ سکتا۔ نہ دُخانی نہ برفانی۔“

ٹرومین نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

"سوزن۔ خُدا کے لئے مُجھے کافی پلاؤ ورنہ میں کچن پر چھاپہ ماروں گا۔"

سوزن نے مہربانانہ سر ہلاتے ہوئے کہا: "خدا کے نام پر مانگتے ہو تو معجزے کا امکان ہے لیکن یہ چھاپے والی دھمکی ایک لمحے کے اندر واپس لینا ہو گی۔"

ٹرومین نے پہلے سانس ہی میں کہہ دیا: "واپس لی۔"

اس پر سوزن نے جارج کو اشارہ کیا۔ جارج مسکراتا ہوا گیا اور کھکھلاتا ہوا کافی کا دھواں دھار پیالہ اُٹھا لایا، سوزن سے آنکھ بچا کر ٹرومین کو آنکھ ماری اور پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

بتایئے، ٹھنڈا حسن کس کام کا ہے؟

لیکن یہ سب کُچھ ہو رہا تھا اور ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سوچا کہ سوزن لاکھ حسین سہی لیکن سرکاری کاغذات کی رو سے لائبریرین ہے۔ معشوق نہیں کہ دفتر کے اوقات میں بھی مشقِ ناز کرنے لگے اور وُہ بھی اپنے اعلیٰ افسر کے ساتھ۔ اور اعلیٰ افسر بھی سرکاری معائنے کے لئے آیا ہے۔ ناز برداری کے دورے پر نہیں۔ چنانچہ اس وقت تو ہم یہ سوال نہ اُٹھا سکے لیکن جب کافی کے بعد معائنہ ختم ہو چکا۔۔ اس کم بخت

کا کام بھی اتنا ہی حسین نکلا جتنی یہ خود تھی۔۔۔ اور سوزن سے رخصت ہو کر کار میں بیٹھے تو ہم نے چھوٹتے ہی ٹرومین سے پوچھا:

''یار، ایسی بد تمیزی کیسے برداشت کر سکتے ہو؟''

''کونسی بد تمیزی۔''

''یہی تمہاری لائبریرین کی۔''

ٹرومین بڑے سکون سے بولا: ''ایک بات بتاؤ سوزن بیوٹی فل ہے یا نہیں؟''

اور بیوٹی فل کا لفظ ظالم نے اس لذیذ انداز میں ادا کیا جیسے نابوکاف کی زبان سے لولیٹا کا نام نکلا تھا یعنی جیسے اس میں سے رس چوس رہا ہو۔

کہا۔ ''حسین تو بے شک ہے۔''

بولا۔ ''تو حضور بد تمیزی بدشکلوں سے سرزد ہوتی ہے، حسینوں سے نہیں۔ حسین صرف غمزہ کرتے ہیں۔ جانتے ہو غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟''

ہمیں چند پری چہرہ لوگوں کی یاد آئی اور اثبات میں سر ہلایا۔ ٹرومین نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''اور ہاں، کوئی ایسا طریقہ بھی جانتے ہو جس سے حسن کو غمزے سے الگ کیا جا سکے؟''

جب اس سوال پر غور کیا تو ہم پر حقیقتِ حسن واضح ہونے لگی۔ ہمیں اعتراف کرنا پڑا کہ حسن لازم ہے تو غمزہ ملزوم۔ ٹرومین نے اگلا سوال کیا۔

"نیز یہ بتاؤ کہ اگر حسن میں غمزہ نہ ہو تو ٹھنڈا حسن کس کام کا ہوتا ہے؟"

ہمیں ایک ٹھنڈی حسینہ کی وحشت ناک یاد آئی اور تسلیم کیا کہ حسن حرارت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس پر ٹرومین مسکراتے ہوئے بولا:

"میرے پیارے کرنل۔ تم آدمی تو اچھے معلُوم ہوتے ہو لیکن کبھی کبھی تم پر فوجی ڈسپلن غالب آجاتا ہے۔ اب ذرا اسٹینڈ ایزی STAND EASY ہو جاؤ اور سوزن کو دُعا دو۔۔۔ اور بہر حال تم اس کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہو۔"

ہمارے فوجی پن کے متعلق ٹرومین کی تشخیص ایسی غلط نہ تھی۔ ایک دفعہ پہلے بھی ہم سے حُسن کی سرکار میں بے ادبی ہو گئی تھی جب کارپورل کلونت کور[۶۸] کی ایک ادا پر فدا ہونے کی بجائے اسے اٹن شن ہونے کا حکم دے دیا تھا اور پھر ہماری حسین کارپورل نے ہمارے سامنے اس زور سے نالہ کیا تھا کہ ہماری کپتانی کا پِتّہ پانی ہو گیا تھا۔ بہر حال ٹرومین

---

[۶۸] بجنگ آمد باب ۱۵

کالمبا لیکچر سُننے کے بعد ہمیں یاد آیا کہ یہ سبق تو ہمارے ایک شاعر کب کا دے چکے ہیں اور فقط دو مصرعوں میں۔

اپنی مرضی کے لوگ ہیں باقی

کون الجھے پری جمالوں سے [۶۹]

ہماری بلوغت تسلیم کرلی گئی

اگلے روز جمعہ تھا لیکن کینٹ کاؤنٹی میں ہفتہ پورا کرنے کے لئے تین دن باقی تھے، لیکن صبح جاگ کر ٹرومین کے دفتر میں گئے تو معلُوم ہوا ہمارا ہفتہ ختم ہو چکا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہفتے اور اتوار کو انگلستان میں یُوں بھی چھٹی ہوتی ہے۔ باقی رہا جمعہ تو جونہی ہم نے دفتر کے اندر قدم رکھا اور دو کاغذ دیکھ لئے جمعہ بھی ختم ہو گیا اور سامنے ایک بے فکر و بے کراں ہنستی کھیلتی ویک اینڈ (WEEK END) کے رُخ سے نقاب سِرکنے لگا۔ ہم ویک اینڈ منانے کے لئے سیدھے لندن چل پڑے۔

گاڑی لندن پہنچی تو ہمیں حیرانی اور خوشی ہوئی کہ پلیٹ فارم پر ہماری سربراہی کے لئے گولڈ ہل موجود نہیں تھا۔ اس خوشگوار غیر حاضری کا مطلب یہ تھا کہ بالآخر ہمارا بالغ ہونا

---

[۶۹] باقی صدیقی مرحوم خطہ پوٹھوہار کا درویش طبع شاعر۔

تسلیم کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ جوشِ بلوغت میں ہم نے اپنے ہاتھ سے ٹیکسی کو اشارا کیا جو کار گر نکلا اور بڑے خود مختارانہ طمطراق سے ہوٹل پہنچے۔ مگر کیا دیکھتے ہیں کہ ہوٹل کے دروازے پر گولڈ ہل کھڑا ہے۔ وُہی بے چین آہیں اور وُہی مامتا بھری نگاہیں۔ ہماری بلوغت پھر انگوٹھا چوسنے لگی لیکن خوش قسمتی سے گولڈ ہل تیزی میں تھا۔ ہمیں مِس پارس کا خط دیا، اگلے روز ہمیں سٹیشن پر لے جانے کا وعدہ کیا اور درازیٔ عمر کی دُعا دے کر رخصت ہو گیا۔

ہنی مون کے لئے قربانی درکار ہے

اب ہم ہوٹل کے جانے پہچانے مہمان تھے۔ کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو پورٹر ٹامس (۴۰ سال) ریسپشن کلرک جولی (۲۰ سال) اور اکاؤنٹس کلرک نینسی (۲۱ سال) نے ہمیں مانوسانہ ہیلو کہا جیسے اہلِ خانہ میں سے کوئی ہفتے کی غیر حاضری کے بعد گھر لوٹا ہو۔ دُعا و سلام کے بعد ہم قریب کی لفٹ سے اُوپر جانے ہی والے تھے کہ استقبالیہ ڈیک سے ہماری سمت جولی کی آواز آئی۔

”مسٹر خان۔“

”جی جولی۔“ ہم نے جواب دیا۔

”ایک زحمت دے سکتی ہو؟“

”ارشاد۔“

”دو راتوں کے لئے ہمیں آپ کا کمرہ چاہیے۔ کیا آپ ایک دُوسرے کمرے میں جانا پسند کریں گے؟ ذرا چھوٹا ہو گا۔“

”یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ ہم سے یہ قربانی کس شخص کے لئے دِلائی جا رہی ہے؟“

”ایک امریکی جوڑے کے لئے جو ہنی مون پر آیا ہے۔ دراصل آج اکٹھے چار جوڑے امریکہ سے ہنی مون منانے آ گئے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”کام تو نیک معلُوم ہوتا ہے مگر کوئی جوڑا دکھاؤ تو۔“

جولی بولی: ”ایک تو یہ رہا۔ آیئے ملئے مسٹر اور مسز فرنکلن سے۔“

ملنے سے پہلے ہم نے جوڑے کو دیکھا۔ دولہا کوئی ساٹھ برس کے پیٹے میں تھا اور دلہن اس سے بھی اگلے پیٹے میں۔ ظاہر تھا کہ یہ محترمہ دولہا کی تیسری یا چوتھی دلہن ہیں اور محترم، دلہن کے پانچویں یا چھٹّے دولہا ہیں کیونکہ دونوں کے چہروں پر گزشتہ شادیوں اور طلاقوں کے گہرے نقوش موجود تھے۔ ہم نے بڑھ کر دولہا سے مصافحہ کیا اور کہا:

”شادی مبارک باد مسٹر فرنکلن۔“

”شکریہ اور ملئے میری دلہن سے مگر آج یہ بول نہیں سکتیں۔ ان کے دانت میں درد ہے۔“

جواب میں محترمہ نے مُنہ کھولے بغیر تبسم کیا اور اس خندہ ناتمام کی کمی آنکھیں مٹکانے سے پوری کی۔ دانت درد کے باوجود دلہن کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی مٹکاہٹ باعثِ حیرت بھی تھی اور قابلِ داد بھی۔ چنانچہ جواب میں ہم نے ارادۃً تو کلمۂ تحسین ہی کہا لیکن غیر ارادی طور پر ہم سے بھی کُچھ مسکراہٹ اور مٹکاہٹ سرزد ہو گئی۔ ہماری اناڑی ایکٹنگ دیکھ کر دلہن کو بے اختیار ہنسی آگئی، لیکن بے چاری کا مُنہ کھولنا تھا کہ وُہ راز فاش ہو گیا جس کی پردہ داری تھی۔ دلہن کی لب بندی دانتوں کے درد کی وجہ سے نہ تھی دانتوں کی کمی کی وجہ سے تھی۔ ہم نے سوچا اگر ہمارا کمرہ اس بے دانت ہنی مون کے کام آیا تو سمجھو حرام کیا۔ ہم نے جولی کی طرف ذرا منفی انداز سے دیکھا۔ جولی جھٹ بولی۔

”اور اب پیچھے دیکھیں۔ ایک اور ہنی مون جوڑا آرہا ہے۔“ اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مدھ بھری جوانی میں مخمور جوڑا باہوں میں باہیں اور نگاہوں میں نگاہیں ڈالے غیروں کے وجود سے بے خبر اور فقط ایک دُوسرے کے لمس سے باخبر آہستہ آہستہ کھانے کے کمرے سے نکل کر ہماری طرف آرہا ہے۔ فرمودہ اقبال ہے کہ کشتیٔ دِل کے لئے سہل

ہے عہدِ شباب۔ جس سیل دو گانہ سے ان کی کشتیاں دوچار تھیں، وُہ تو ان دونوں کے دِل ہی جانتے تھے لیکن کشتیوں کے باہمی ٹکراؤ سے بیرونی تھپیٹروں کا یہ عالم تھا کہ ساحل نشین تماشائیوں کی من کشتیاں بھی ڈولنے لگیں۔ ہم نے اپنی ڈولتی ہوئی کشتی سے جولی کو کہا:

"جولی۔ اگر کمرہ اس جوڑے کے لئے چاہیے تو کمرہ تو کیا ہم دُنیا بھی خالی کرنے کو تیار ہیں۔"

جولی بولی۔ "آپ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے۔ عاشقوں سے ہر کوئی عشق کرتا ہے۔"

ہمارے سامنے عشق ہو رہا تھا اور ہم اسے یُوں دیکھ رہے تھے جیسے میچ دیکھ رہے ہوں اور تماشائیوں کی طرح داد بھی دے رہے تھے۔ واہ وا! لیکن ہمارے کھلاڑی ہماری داد سے بے نیاز اور بے خبر رہے۔ ناچار جولی نے ایک زور کی مصنوعی چھینک ماری جو ہمیں لگی، بوڑھے بوڑھی کو لگی لیکن اس عشق باز جوڑے کو نہ چونکا سکی۔ آخر وُہ محبّت ہی کیا جو چھینک سے مُنتشر ہو جائے۔ اس پر بوڑھے دولہا نے جو نوجوان کا ہم عمر نہ سہی ہم مشرب ضرور تھا، بڑھ کر نئے دولہا کا کندھا تھتھپایا۔ نوجوان نے ایک لمحے کے لئے اپنی دلہن سے اجازت لی اور بڑے میاں سے مخاطب ہوا۔

"یس سر۔"

جولی کو موقعہ مل گیا اور جھٹ بول اٹھی۔

"آپ کے لئے کمرے کا انتظام ہو گیا ہے۔"

نوجوان کہ اپنے بازو بدستور محبوبہ کی کمر میں حمائل کئے ہوئے تھا مختصراً بولا۔

"فائن۔"

اور اگلے لمحے میں نوبیاہتا جوڑے کے لب ور خسار کا باہمی فاصلہ بتدریج صفر ہونے لگا۔ اس پر بوڑھے نے اپنی بڑھیا کی آنکھوں میں جھانک کر اسے بھی جنس وار طیش دِلانا چاہا لیکن بڑھیا کے ترکش میں ایک ہی تیر تھا۔ آنکھیں مٹکانا! جو اس نے بڑی چابکدستی سے مٹکائیں۔ بے شک ان آنکھوں میں ربع صدی پیشتر قیامت کی کشش ہو گی۔ لیکن اس کشش تک پہنچنے کے لئے اب پچیس برس تفریق کرنے کی ضرورت تھی۔ ہماری ریاضی یوں بھی کمزور ہے۔ چنانچہ ہماری نگاہیں بدستور ادھر ہی جمی رہیں جہاں جمع تفریق کی حاجت نہ تھی۔

کمرے میں پہنچ کر پارس کا خط پڑھا۔

"ڈیئر کرنل خان۔ مُجھے یقین ہے کہ کینٹ نے آپ کو لُبھا لیا ہو گا۔ اب وِلٹ شائر آپ کو جادو کر دے گا۔ سو اگلے سفر کے لئے تیار رہیں۔ گولڈ ہل سب انتظام کر دے گا۔

مُجھے افسوس ہے آپ کو لندن دیکھنے کا موقع نہیں دے رہی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ وِلٹ شائر سے واپسی پر پورے سات دن لندن کی سیر کیلئے دوں گی۔ ہاں تو وِلٹ شائر میں سٹون ہنج(STONE HENGE)دیکھنا مت بھولئے اور واپسی پر مُجھے ملنا بھی ہر گز نہ بھولئے۔۔۔۔

ملاقات کی مُنتظر، این پارس۔"

ہم نے سوچا کہ اگر تو ایسی ہی ملاقات کے لئے بے چین ہے تو آج کا کام کل پر کیوں چھوڑ رہی ہے؟ لیکن یہ فرنگی معشوق بڑے کاروباری لوگ ہوتے ہیں۔ یہ عشق بھی ٹائم ٹیبل بنا کر کرتے ہیں اور دمِ عشق بھی ایک آنکھ گھڑی پر رکھتے ہیں۔ بلکہ الارم لگا لیتے ہیں بہرحال مس پارس کا نام یوں بھی ہماری فردِ عشق میں نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے خط کا کاروباری گودا نکال لیا اور شوخ مگر کچے رنگ کا چھلکا پھینک دیا۔

اتوار کو گولڈ ہل صاحب تشریف لائے اور حسبِ معمول وقتِ مقررہ سے کُچھ پہلے۔ دِل ترس گیا تھا کہ یہ شخص کبھی بعد از وقت بھی آتا۔ ہم نے جی کڑا کر کے وقت کی پابندی برداشت کی اور اس وقت تک جی کڑا کئے رکھا جب تک ریلوے سٹیشن سے ہماری گاڑی چل نہ دی۔ پھر لوٹتے ہوئے گولڈ ہل کی پُشت دیکھ کر ایک میل لمبا سانس لیا اور خوشی سے اپنی سیٹ پر ڈھیر ہو گئے۔ ہمارے انگریز ہمسفروں کو ہمارا یوں ڈھیر ہو

جانا شاید ناگوار گزرا ہو، لیکن انہیں کیا معلُوم کہ ہم گلے سے سونے کا طوق اتار کر اور پاؤں سے پہاڑی زنجیر کاٹ کر ڈھیر ہوئے تھے۔ کہاں ہو تا وُہ فرانسیس مسمی روسو[٧٠] کہ ہمارے جذبات کی داد دیتا۔ انگریز آزادی کا قدر دان ہے لیکن صرف اپنی آزادی کا۔ دوسروں اور خصوصاً کالوں کی آزادی سے جلتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے انگریز ہمسفروں کے لئے خصوصی تپش کا اہتمام کیا۔

وِلٹ شائر کاؤنٹی کا صدر مقام ٹروبرج ہے اور ہماری منزل مقصود تھی۔ گاڑی ٹروبرج کے سٹیشن پر پہنچی۔ تھا تو یہ سٹیشن ہی لیکن بڑا بے توفیقا، بڑا بے پیرا اور بڑا بے ٹکٹا۔ خدا جانے یہاں گاڑی رُک کیسے گئی۔ اترے تو پلیٹ فارم پر ہم ہی واحد مسافر تھے اور ہمارے جلو میں کُچھ تھا تو بے حساب وحشت۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید قیس بھی اسی ٹرین سے اُترا ہو لیکن نظر نہ آیا۔ سٹیشن سے باہر نکل کر ٹیکسی کے لئے ہاتھ اُٹھانا چاہا تو حدِ نگاہ تک ٹیکسی سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ آخر ایک گھڈا[٧١] سا انگریز پیچھے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہمارے سامنے رُک کر بولا۔

---

[٧٠] MAN IS BORN FREE AND EVERY WHERE. HEISIN CHAINS, (ROUSSEAU)

[٧١] چکوال کی زبان کا لفظ وُہ پستہ قد شخص جس کی چال میں ایک قسم کا مخنی پن ہو۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

یہ حضرت ایسے مُشکل کُشا تو نظر نہیں آتے تھے لیکن کہا:

"جناب مُجھے شہر جانا ہے۔ کیا آپ کسی طرح ایک ٹیکسی پیدا کر سکتے ہیں۔"

"یقیناً مگر ٹیکسی ٹیلی فون کے بغیر نہیں آتی اور فون کرنا میرا کام ہے کہ میں سٹیشن ماسٹر ہوں۔ آیئے اتنی دیر میرے دفتر میں بیٹھیئے۔"

ہم دفتر میں داخل ہوئے تو کوئلے اور لالٹینوں کی بو جو ۱۸۲۵ء عیسوی میں جارج سٹیونسن نے پہلا انجن چلا کر سونگھی تھی ہمارے خیر مقدم کو آئی۔ انسان کی زندگی میں عجیب ناہمواریاں ہیں اس کے دیہات خوبصورت، شہر دِلآویز، مگر کارخانے بے ہنگم اور سٹیشن بے ہودہ! سٹیشن ماسٹر نے ایڑیاں اُٹھا کر دیوار میں نصب شدہ ٹیلی فون کے کان میں کُچھ کہا اور تھوڑی دیر بعد ٹیکسی آگئی۔

بعض بوڑھیاں دِلچسپ ہوتی ہیں۔

مس پارس کی تحریری ہدایات کے مطابق ہمیں جارج ہوٹل پہنچنا تھا۔ پہنچے اور صورتِ حالات دیکھ کر بڑے پرسن ہوئے۔ کیا پیارا ہوٹل تھا ہر طرف خاموشی۔ ویرانے کا سا سکوت بالکل ہنی مون کے قابل اور شاید صرف ہنی مون ہی کے قابل کہ دیگر دنیوی

کاروبار کے لئے یہ فضا بہت زیادہ رومان انگیز معلُوم ہوتی تھی۔ ریسیپشن کاؤنٹر پر بوڑھی کلرک اپنا سفید سر رکھ کر گھوگ سو رہی تھی گویا آج سے چالیس برس پیشتر کے ہنی مون کو خواب میں دہرا رہی ہو۔ ہم نے اُنگلیوں سے کاؤنٹر پر تین تال میں دادر بجایا۔ آخری گونج پر محترمہ نے آنکھ کھولی تو ہم نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ آپ نے ایک عالمگیر جماہی لینے کے بعد ہمارا کارڈ دیکھا۔ معاً آپ ذرا ذہنی طور پر اچھلیں اور فرمایا۔

"اووُہ، مسٹر خان۔۔۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔"

ہم نے کہا:: میڈم۔ آپ سو کر ہی انتظار کیا کرتی ہیں یا ہمارا انتظار خواب آور تھا۔"

میڈم کُچھ نہ سمجھیں۔۔۔ شاید ہماری انگریزی نے ہمارے ماضی الضمیر سے وفا نہ کی تھی۔ ویسے آپ بھی ایسی علامہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بہر حال آپ مسکرائیں اور یُوں جیسے یہ مسکراہٹ ہمارے لئے خاص طور پر تخلیق کی گئی ہو۔ پھر ہمارے کوائف لکھے اور اس کے بعد ہمیں ایک دُوسری بوڑھی کے حوالے کر کے آپ نے اگلے گاہک کے انتظار میں اگلی شاہجہانی انگڑائی لی۔۔ دوسری بوڑھی ہمیں کمرے تک لے گئی۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا جس میں وکٹوریہ کے زمانے کا ایک پلنگ رکھا تھا اور بس۔ لیکن پلنگ کا طول و عرض اتنا شاہانہ تھا کہ کمرے کے اندر کمرہ لگتا تھا اور اس کے رُتبے کا یہ عالم تھا

کہ ہوٹل کے جملہ ہنی مون اس کی وسعت میں ہنی مون منا سکتے تھے۔ بہر حال یہ سہولت ہمارے لئے بے معنی تھی۔ ہم نے میڈ سے کہا:

"آج کل تو کمروں میں ٹیلی فون، ریڈیو، بلکہ ٹیلی ویژن بھی ہوتا ہے۔ کیا آپ ایسی چیزیں نہیں رکھتیں؟"

بولی: "رکھ لیں گے ابھی کل ہی تو ایجاد ہوئی ہیں۔ فی الحال ہم نے ہر کمرے میں کال بل CALL BELL لگادی ہے۔ یہ دیکھیں پلنگ کے قریب گھنٹی کا بٹن!"

اور پھر اس نے آگے بڑھ کر بٹن کو تجربۃً دبایا اور دبا چکنے کے بعد فاتحانہ طور پر مسکرائی۔ ہم نے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بٹن پر انگلی رکھی اور پھر اصلی حیرت سے ملتی جلتی حیرت کے عالم میں میڈ کو دیکھا اور یُوں اس کے احساس کو مکمل کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے سات روز کے لئے ہر چند کہ ہمارے کمرے سے ریڈیو کی آواز نہ آئی لیکن گلاسوں کے کھنکنے کی آواز اور پیالیوں کے چھنکنے کی جھنکار بند نہ ہوئی۔ فقط بٹن دبانے کی دیر ہوتی اور بڑھیا غزالوں کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی نعمتوں کا خوان اُٹھائے سامنے رکھتی۔ اور جو مزا چائے کے ساتھ گرما گرم اور رنگا رنگ ماکولات میں ہے وُہ ریڈیو کے پاپ گانے کی ہزلیات میں نہیں۔ پھر بوڑھی صرف چائے ہی نہ لاتی بلکہ ڈھیر ساری ہمدردی بھی: بعض بوڑھیاں بڑی دِلچسپ ہوتی ہیں۔

یہ سپیرا نہیں لائبریرین ہے

دُوسرے دن ولٹ شائر کی لائبریری دیکھنے گئے۔ صحن چمن میں داخل ہوئے تو دو چاکِ گریبانوں اور بے باک سینوں والی نوجوان لڑکیاں، گلے میں رنگ برنگے منکوں کے ہار ڈالے اور شانوں پر بال پریشان کئے، نظر آئیں۔ ہم سمجھے کسی سپیرے کی فیملی پھر رہی ہے۔ قریب پہنچے تو انہوں نے ہمیں اجنبی پا کر استفسارانہ دیکھا۔ ہم نے پوچھا:

"یہ لائبریری ہے؟"

بولیں: "وُہ صاف لکھا ہوا ہے، کاؤنٹی لائبریری، وِلٹ شائر۔ آپ کو شک کیوں ہو رہا ہے؟"

کہا۔ "سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر شک ہوا۔ میں سمجھا یہ کوئی کیمپنگ سائٹ ہے یا یہاں کوئی جپسی[۴۷] قبیلہ آباد ہے۔"

دونوں ہنس کر بولیں: "یقین کریں، نہ یہ کیمپنگ ہے اور نہ ہم جپسی ہیں۔ ہم دونوں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔"

---

[۴۷] خانہ بدوش

اس حلیئے کی لائبریرین دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہا:

"اگر آپ سچ مچ لائبریرین ہیں تو کیا مُجھے چیف لائبریرین مسٹر آرنلڈ کا کمرہ دکھا سکیں گی۔"

"یقیناً وُہ دیکھیں، دائیں ہاتھ کو آخری دروازہ۔"

ہم دائیں ہاتھ کو چل پڑے اور آخری دروازے پر جا کر دستک دی۔ ہم دِل میں سوچ رہے تھے کہ اگر محترمات اسسٹنٹ لائبریرین کا حلیہ یہی ہے تو دروازہ کھولنے پر محترم چیف لائبریرین صاحب سر پر لال رومال باندھے، کانوں میں بالے ڈالے، میز پر سانپ نکالے، بین بجاتے نظر آئیں گے، لیکن دروازہ کھلا تو ہمارے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ لائبریرین سپیرانہ تھا بلکہ بالکل عام فہم انگریز جیسے بھی ہوا کرتے تھے: بال کٹے ہوئے، بٹن لگے ہوئے اور مُنہ دھلا ہوا۔ ہم سے کُچھ فالتو تپاک سے مِلا۔ وُہ اس لئے کہ کبھی میجر تھا اور پنڈی میں رہ چکا تھا۔ چنانچہ جہاں ہماری ذاتی خیریت کے متعلق پوچھا وہاں چک لالہ، ویسٹر تیج اور لالکرتی کی غائبانہ مزاج پُرسی بھی کی۔ آپ نے پچھلے چند سالوں سے سُن رکھا تھا کہ ہم ایک نئی بستی بنام ازلیمابیڈ بھی بسا رہے ہیں اور یہ کہ وُہ بڑی حسین و جمیل بستی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ ہم نے انہیں تسلّی دی کہ بے شک اس نئی بستی کا حسن اتنا ہی قیامت خیز ہے جیسی انکی شُنید ہے۔ صرف نام وُہ نہیں جو انہوں نے

سُن رکھا ہے بلکہ اسلام آباد ہے۔ پھر آپ نے ہمیں لائبریری کی سیر کرائی اور سٹاف سے تعارف کرایا:

ٹام کالسن۔ ایڈم افسر۔ موٹا اور خوش طبع یا شاید موٹا لہٰذا خوش طبع۔ پاکستانی ہونے کا دعویدار کہ آج سے پچاس برس قبل کراچی میں پیدا ہوا تھا۔ پلا تھا اور پڑھا تھا۔ ہم سے اُردُو میں علیک سلیک کی اور ہمیں دیکھ کر اس کی کراچی کے گلی کوچوں کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ گویا پوچھتا ہو کہ کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟ او دیس سے آنے والے بتا۔ ہرچند کہ ان پنگھٹوں کے موجودہ استعمال کا ہمیں علم نہ تھا تاہم ہم نے کسی قدر وثوق سے کہہ دیا کہ اب وہاں بچّوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کی منڈی ہے اور دِل میں سوچا کہ منڈی نہیں تو رکشوں کا اڈّا ہو گا اور دونوں صورتوں میں مسٹر کالسن کو ایک جیسی ٹھیس لگے گی۔

پھر مسز بالم سے تعارف ہوا۔ جوانی سے کُچھ آگے نکل چکی تھیں مگر اب بھی لالہ رُخ اور سمن بر تھیں۔ پیشے کے لحاظ سے انتخابِ کتب کی ماہرہ لیکن تاثیر کے اعتبار سے تالیفِ قلوب کی ساحرہ تھیں۔ ہم سے دو باتیں کیں اور دِل کے قریب جا پہنچیں۔ فلمی شاعر نے کہا ہے کُچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟ لیکن شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ یہ لوگ اگر مان جائیں یا سِرے سے روٹھیں ہی نہیں تو کتنے دُلارے لگتے ہیں۔ مسٹر بالم

اس دُوسرے گروہ میں سے تھیں۔ اس قدر سویٹ اور متواضع کہ اگر بیٹھنے کے لئے کرسی نہ ہوتی تو گود خالی کر دیتیں۔ ایسے لوگ پیارے نہ لگیں تو کیا لگیں؟

اگلے کمرے میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وُہی دو سُندر سپیرنیاں جنہیں اسسٹنٹ لائبریرین ہونے کا مشکوک سا دعوٰی تھا کرسیوں پر براجمان ہیں۔ لیکن تعارف پر معلُوم ہوا کہ یہ سچ مچ وُہی شے ہیں اور بڑی معتبر قسم کی۔ یعنی اپنے کھلے سرکش سینوں پر منکوں کی مالاؤں اور زلفوں کی گھٹاؤں کے باوجود! آرنلڈ نے اس سے تعارف کرایا تو اس احترام کے ساتھ اور واضح جسمانی حقیقوں سے اس طرح قطع نظر کرتے ہوئے جیسے پردہ نشینوں سے تعارف کرارہاہو اور جیسے ہمارامشاہدہ محض واہمہ ہو ورنہ خواتین نے گویا بند گلے کے چینی کوٹ پہن رکھے ہوں۔ بہرحال آرنلڈ کو ضبط کا یارا ہو تو ہو ہمیں نہ تھا۔ چنانچہ مس نینا ہمینڈ اور مس پیگی کنگ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یکے بعد دیگرے ہمیں تربوز جتنے بڑے ہوا کے گولے نگلے پڑے۔۔۔ معلوم ہوا کہ برطانیہ کے قدیم وضعداروں کا گزارا جدید وضع شکنوں کو محض قبول کرنے پر نہیں بلکہ ان کی خوشامد پر ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم برطانوی مظلوموں پر اپنی ہمدردی ضائع کر دیتے ہمیں وطنِ عزیز یاد آیا جس کا ہماری ہمدردیوں پر پہلا حق تھا کہ عریاں سینوں اور کوتاہ آستینوں کی اس ارضِ نگاراں میں بھی کمی نہیں۔ یہاں بھی جسمانی جیومیٹری قمیصوں اور چولیوں پر اسی قسم کا اشتعال انگریز دباؤ ڈال رہی ہے جیسے برطانوی بلاؤزوں

پر پڑ رہا ہے۔ لیکن خیر یہ جملہ معترضہ تھا، کہنا یہ تھا کہ آرنلڈ نے اپنے ماتحتوں سے تعارف کرایا جنہیں مل کر ہمیں مختلف قسم کی خوشیاں ہوئیں۔ کچھ فوری طور پر اور باقی بعد میں۔ ہمیں وہاں چار پانچ روز رہنا تھا۔ آرنلڈ نے ہمیں ایک ایک روز کے لئے کالسن، مسز بالم، نینا اور پیگی کو الاٹ کر دیا اور پہلے دن کی میزبانی کا شرف اپنے لئے محفوظ رکھا۔ چنانچہ دوپہر تک تو اپنی کاؤنٹی کی لائبریریوں کے اسرار و رموز بیان کرتا رہا جنہیں سن کر ہم کچھ زیادہ بور نہ ہوئے کہ اس موضوع پر ہم مزید بور نہیں کئے جا سکتے تھے۔ کینٹ ہی سے تر بتر لوٹے تھے۔ البتہ پچھلے پہر کار میں کاؤنٹی کے دیہات اور دیہاتی لائبریریوں کی سیر کو نکلے تو ہمیں خاص سرور آنے لگا۔ برطانیہ کے سبزہ زاروں میں وہ سحر ہے جو اس کے شہروں میں نہیں اور ہو بھی کیسے؟ بن خدا[43] نے بنائے ہیں اور شہر انسان نے اور ظاہر ہے کہ بحیثیت خالق خدا سے ہمسری عبث ہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے کوہ و دمن کے جمال سے مسحور ہونا بجائے خود عبادت ہے کہ خالق کی شان میں سب سے بڑی تسبیح اس کی تخلیق کو چاہنا اور سراہا ہے۔ چنانچہ اس شام ہم نے جی بھر کر عبادت کی اور بے حساب دولتِ سوز و سرور جمع کی۔

---

[43] GOD MADE THE COUNTRY AND MAN MADE THE TOWN (WILLIAMCOWPER)

بالم آؤ بسو میرے من میں اور سٹون ہنج دیکھو

دوسرے روز ہمیں مسز بالم کے سپرد کیا گیا یعنی اس خاتون کے سپرد جس کے دہن میں قدرت نے شہد و شکر کی سبیل رکھ دی تھی۔ مسز بالم نے بھی قبل دوپہر تک ہمیں انتخابِ کتب کے رموز پر درس دیا۔ ان رموز سے تو ہم پہلے ہی آشنا تھے سو یہ سبق ہمارے لئے آسان ہونا چاہیئے تھا لیکن اس جادوگر بالم کی تقریر کی لذّت کا یہ عالم تھا کہ کتب شناسی سے پہلے خود فراموشی کی منزل تک پہنچ گئے اور خبر اس وقت ہوئی جب مسز بالم نے درس ختم کر کے ہمیں دعوتِ طعام دی۔ لنچ سے فارغ ہوئے تو مسز بالم نے بھی آرنلڈ کی طرح ہمیں سیر مضافات کو لے جانا چاہا اور ہمارے لئے بھی مسز بالم کی صحبت کے بعد وِلٹ شائر کے باغ وراغ کی صحبت سے گوارا تر کوئی چیز نہ تھی۔ آج ہمیں دونوں صحبتیں میسر ہو رہی تھیں۔ چنانچہ جب مسز بالم میں اپنی کار کے پہلو میں بٹھا کر شہر سے نکلیں تو یُوں محسوس ہوا جیسے دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں۔۔۔ کار سبزہ و گل کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی تو یُوں لگا جیسے فطرت نے ہمیں کار سے نکال کر اپنے آغوش میں لے لیا ہے اور ہمارے ہاتھ میں شرابِ بے خودی کا ساغر تھما دیا ہے لیکن پیشتر اس کے کہ سر اُٹھا کر ساغر لبوں تک لاتے اچانک آواز آئی:

"مسٹر خان دیکھو ہم سٹون ہنج STONE HENGE[74] پہنچ گئے ہیں۔"

ہم چونک کر جہانِ بے خودی سے کار کی دُنیا میں لوٹ آئے۔ یہ آواز مسز بالم کی تھی جو آہستہ آہستہ کار روک رہی تھی۔ سامنے کوئی سو دو سو موٹے موٹے بھدے بھدے کالے کالے پتھر نظر آئے جو سبزے کے مخملیں فرش پر اس بے ترتیبی اور بے ادبی سے بکھرے پڑے تھے جیسے گینڈوں کی لاشیں پڑی ہوں۔ یہ غیر متبرک پتھر کہاں سے آئے تھے؟ یہ اس زمین کا حصّہ تو نہ لگتے تھے۔ بلکہ یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے کُچھ اُڑتی ہوئی ارواحِ خبیثہ کی گٹھڑی کھل گئی ہو اور یہ بے ڈول، دیو پیکر کنکر گر کر بکھر گئے ہوں۔ ہم نے دِل میں کہا:

اگر یہی سٹون ہنج ہے جس کے دیکھنے کی مس پارس تاکید کر رہی تھی اور جس کا ہر انگریزی گائیڈ بُک میں قصیدہ لکھا ہے؟ ہمیں انگریزوں کی بد مذاقی پر رحم اور رونا آیا۔ کیا انہیں سالزبری کے وُہ شاداب سبزہ زار نظر نہیں آتے جو ان بے روح پتھروں، ان بد وضع عفریتوں کے ارد گرد حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا وُہ بجھے بجھے جامد پتھر دیکھ

---

[74] جنوبی برطانیہ میں پندرھویں صدی قبل مسیح کی ایک قربان گاہ کے کھنڈر جو گنتی کے چند پتھروں کی شکل میں ملتے ہیں۔

سکتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام؟۔۔۔ہم نے مسز بالم سے کہا:

"اگر یہی سٹون ہنج ہے تو براہِ کرم اس کی صرف ایک خوبی بتائیں جس کے لئے آپ ٹھہر گئی ہیں؟"

مسز بالم نے ذرا چونک کر ہمیں دیکھا اور لاپروائی سے کہا:

"کیا یہ کافی نہیں کہ یہ سٹون ہنج ہے۔"

"میری پیاری مسز بالم یہ بہت ناکافی ہے۔"ہم نے فی البدیہ جواب دیا۔

اب کے مسز بالم نے اپنی شرابی آنکھوں کے علاوہ اپنے گلابی سینے کا بھرپور رُخ بھی ہماری طرف موڑا اور اپنے لہجے کی شیرینی میں حُسن کا رُعب شامل کرتے ہوئے بولتی۔

"تو پھر کیا چاہیے آپ کو؟"

"بس کُچھ سبزہ بیگانہ، کُچھ گلہائے تر، لیکن پتھر نہیں چاہئیں کہ میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے۔"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔"

ہمارے پاس اس کے سوا کُچھ جواب نہ تھا کہ چچا غالب کا مشہور شعر الاپنا شروع کر دیتے اور الاپنے لگے۔

یارب وُہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دِل اور دے ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مسز بالم کہ انگریزی شاعری کی رسیا تھی، شعر کے ترجمے کا مطالبہ کرنے لگی۔ ہم نے بخوشی لیکن بمشکل اس کی انگریزی بنائی، لیکن جونہی چچا کا مطلب مسز بالم پر کھلا ہمیں چھوڑ کر چچا پر فِدا ہونے لگی اور مزید اشعار کا مطالبہ کیا۔ ہمیں اس غزل کے چند شعر یاد تھے۔ پڑھنے لگے لیکن ہمیں معلُوم نہ تھا کہ اسی غزل میں چچا نے ایک شعر سٹون ہنج پر بھی کہا ہے جو بالکل ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جونہی یہ شعر لاشعور سے اُبھر کر ہماری زبان سے نکلا ہم خود دم بخود رہ گئے۔ شعر تھا:

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

مسز بالم نے معنی سنے تو کار چلا کر سٹون ہنج سے بھاگ نکلی۔

ہم نے مسز بالم کو سخن شناسی اور ہم نوائی پر مبارکباد دی اور جب دیکھا کہ چچا کے غائبانہ ہاتھ پر پوری طرح بیعت ہوگئی ہے تو اسے مرشد غالب کے کلام کا چغتائی ایڈیشن بھیجنے کا وعدہ کیا۔

میمیں سیّد ضمیر جعفری سے تعویز لیتی ہیں

ہمارے اگلے دو دن نینا اور پیگی کے ساتھ گزرے۔ جی ہاں، یہ وُہی دراز مو اور تنگ قبا ملنگنیاں تھیں جن کے ساتھ آرنلڈ نے ہمارا بصد احترام ایک سطحی تعارف کرایا تھا۔ اب گہرے تعارف کی باری تھی اور گہرائی میں گئے تو معلُوم ہوا کہ آرنلڈ سچا تھا۔ یہ باہر سے بے پروا اور قلندر مزاج فقیرنیاں اندر سے بڑی کاریگر اور محتاط دُنیادارنیاں تھیں اور یہ کہ ہیرلڈ ولسن کو اپنی وزارتِ عظمی کا اتنا علم یا فکر نہ ہو گا جتنا انہیں اپنی لائبریری کا تھا۔ ان لڑکیوں کی فرض شناسی دیکھ کر ہمیں اپنے پاکستان کے عزیز ہپّی یاد آئے اور ساتھ ہی سیّد ضمیر جعفری کا شعر

کُچھ ہنر، کُچھ سعی و کاوش، اے مرے نورِ نظر

صرف اک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں

ان لڑکیوں کے ساتھ ہماری سرکاری اٹیچمنٹ ATTACHMENT ختم ہوئی تو ایک پرائیویٹ اٹیچمنٹ کا احساس ہونے لگا جس کی وجہ ان کی جسمانی نمائش نہ تھی بلکہ ذہنی آرائش جس میں بلاشبہ کُچھ سعی و کاوش سے کام لیا گیا تھا۔ نینا اور پیگی نے یقیناً سیّد ضمیر جعفری سے تعویذ لیا تھا۔

موٹی محبوبہ ایک طرح کا بونس ہے

اگلے اور آخری دن کے لئے ہمیں کراچی نژاد ٹام کالسن آفیسر انتظامیہ کے ساتھ نتھی کیا گیا۔ ٹام خلافِ توقع نینا اور پیگی کی ضد تھا۔ نہ صرف جنس کے لحاظ سے بلکہ مزاج کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک جنس کا تعلق ہے اگر وُہ ہلکی پھلکی لڑکیاں جنسِ لطیف کا دِلربا نمونہ تھیں تو یہ ٹوٹ بٹوٹ بھینسا صنفِ کثیف کا بڑا دِلخراش نمائندہ تھا۔ لیکن مرد اور موٹا ہونے کے علاوہ اور موٹا تھا۔ گردن یُوں تو اصلی تھی لیکن معلُوم ہوتا تھا گلے میں ٹائر پہن رکھا ہے اگر یہ شخص وزن کرنے کی مشین پر ایک پاؤں رکھتا تو یقیناً دوسرا پاؤں رکھنے سے پہلے مشین کا دم ہمیشہ کے لئے گھُٹ جاتا۔ باتیں کرتے ہوئے بازو بلند کرتا تو معلُوم ہوتا دونوں ہاتھوں سے کیلے کے گچھے لہرا رہا ہے۔ شکل و صورت کے اس برتے پر آپ کی عاشق مزاجی کے تتے پانی کا یہ عالم تھا کہ ہمیں حُسنِ انتظام کے رموز سمجھاتے سمجھاتے حسنِ خوباں کی گتھیاں سلجھانے پر اُتر آیا۔ حالانکہ خوباں اور شام کے

درمیان وُہی رشتہ تھا جو گلاب کی کلی اور کیلے کی چھلی میں ہوتا ہے۔ بے شک اس کی پیدائش اور پرورش میں کراچی کا ہاتھ تھا تاہم اس تن و توش کے ساتھ اس بات کا امکان نہ تھا کہ شام کو کسی ذاتی رومان میں حصّہ لینے کا اتفاق ہوا ہو۔ چنانچہ کُچھ دیر تو اس کی عاشقانہ موشگافیاں سنتے رہے لیکن ایک جگہ روک کر کہا۔

"مسٹر کالسن۔ آپ کا مزاج بڑا عاشقانی معلُوم ہوتا ہے لیکن یہ بتائیں کہ آپ کی بناوٹ آپ کو عملی عشق کی اجازت بھی دیتی ہے؟"

تھک کر بولا: "عملی عشق سے آپ کی کیا مراد ہے؟ شادی؟"

"شادی تو عشق کا خاتمہ ہے۔ عملی عشق سے مراد وُہ مرحلے ہیں جو شادی پر جا ختم ہوتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً حسینوں کے پیچھے بھاگنا، ان کے آگے ہاتھ جوڑنا، ان کے ستم سہنا، حتّٰی کہ ایک دن کہہ دیں منظور ہے!۔"

"ہاتھ تو میں جوڑ سکتا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے ستم بھی سہہ سکتا ہوں لیکن اُٹھ کر پیچھے پیچھے بھاگنا ذرا پرابلم ہے۔"

"گویا آپ صرف اسی صورت میں عشق کر سکتے ہیں کہ کوئی عشق کرانے کو حاضرِ خدمت ہو۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بڑا باوقار طریقہ ہے۔"

"تو بتائیں اس باوقار طریقے سے آج تک آپ کے کان میں کبھی 'منظور' کی آواز بھی آئی ہے؟"

"ایک دفعہ آئی تو تھی مگر میں نے ارادہ بدِل لیا۔"

"کیوں۔"

"وُہ مجھ سے بھی موٹی تھی۔"

جو خاتُون ٹام کو بھی موٹی نظر آسکتی ہو اس کے جسم میں ضرور کوئی بات ہو گی۔ بہر حال ہم نے دِل میں محترمہ کی مہم جوئی کی داد دی کہ ایک تو اس نے راہِ عشق میں بھاگنا پرابلم نہ سمجھا اور دُوسرے ٹام کو دیکھ لینے کے بعد اسے قبول کرنے کا حوصلہ بھی دکھایا۔

ٹام سے گفتگو جاری تھی۔ پوچھا: "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد آج تک کُچھ نہیں ہوا لیکن دُنیا بہ امید قائم۔"

ہمیں ٹام سے ہمدردی پیدا ہونے لگی کہ اس متلاطم چربی کی تہہ میں ایک محروم النسا انسان بھی تھا اور جس امید پر غریب کی دُنیا قائم تھی اس کے بَر آنے کے آثار ناپید تھے کہ اسے پتلی میسر نہ تھی اور موٹی موافقت نہ تھی۔ اب خدا جانے قارئین کا اس ضمن میں کیا خیال ہے لیکن ہمارے یار آغا کی فلاسفی یہ ہے کہ بہت موٹے آدمی کے لئے بہت موٹی محبوبہ بھی ایک بونس ہے بلکہ ایک خدائی عطیہ ہے جسے وزن کئے بغیر قبول کرلینا چاہئے۔ لیکن افسوس کہ ٹام رحمتِ خداوندی کا اشارہ نہ پہچان سکا اور نتیجہ یہ کہ اب اسے ایک مستقل ازدواجی فاقے کا سامنا تھا جس کی ناکام تلافی کبھی ذکرِ دلبراں سے کرتا اور کبھی امید مہ رخاں سے۔ خدا جانے اس کی سمجھ میں یہ بنیادی بات کیوں نہیں آتی تھی کہ پتلی کی امید کی نسبت موٹی کی موجودگی کہیں زیادہ نفع بخش ہے ورنہ اس چار دن کی زندگی کا وُہی حشر ہوتا ہے کہ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔

ٹام سے ملاقات کے بعد ہماری ولٹ شائر کی آخری مصروفیت آرنلڈ اور اس کی خوبصورت بیوی کے ساتھ لنچ تھا۔ اس کھانے پر آرنلڈ نے اپنے بانکے اور کنوارے ہمسائے جیک کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ کھانا لذیذ تھا جس کا جیک نے ہر لقمے پر اقرار کیا۔ ہم نے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ یہ سب آرنلڈ کی ہمسائیگی کا فیض تھا، جیک سے کہا:

”جیک۔ داناؤں کا قول ہے کہ اچھا ہمسایہ بہت بڑی نعمت ہے۔“

جیک بولا: ”بے شک۔۔۔اور ہمسائے کی بیوی بھی۔“

اور ساتھ ہی کم بخت نے مسز آرنلڈ کی طرف کانی آنکھ سے دیکھا۔۔۔اگر آرنلڈ کی جگہ لالہ محراب گل خان ہوتا تو جیک کی آنکھ نکال لیتا لیکن مہذب آرنڈ فقط یہ کہہ کر رہ گیا ۔

”شریر کہیں کا!۔“

جھولتا لندن

ٹھگنے آدمی کے لئے مصروفیت کیوں ضروری ہے؟

ٹروبرج سے لندن کا سفر مختصر اور بے رنگ سا تھا سوائے اس رنگ کے جو ہمارے پرانے یار ٹروبرج کے ٹھگنے سٹیشن ماسٹر نے بھرنے کی کوشش کی اور اسے ذرا پیازی کر دیا۔ سٹیشن کے گیٹ سے داخل ہوئے تو سامنے سے آرہے تھے اور پچھلی دفعہ سے زیادہ پھڈے اور پیارے لگ رہے تھے۔ ہم نے تو انہیں پہچاننا ہی تھا کہ لاکھوں سٹیشن ماسٹروں میں ایک تھے۔ حیرت ہوئی کہ وُہ بھی ہمیں پہچان گئے۔ شاید اس لئے کہ ہم بھی ان کے دو چار مسافر فی ہفتہ میں سے ایک تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے چند قدم آگے بڑھ کر ملے لیکن جب پوچھا: ”مزاج شریف؟“ تو چھوٹتے ہی پھوٹ پڑے اور بولے:

اور ویسا ہی مُنہ بھی بنایا۔ برہمی کی وجہ پوچھی تو کسی محکمانہ زیادتی کے خلاف جو مبینہ طور پر اسی صبح واقع ہوئی تھی، بڑبڑانے لگے۔ ایک دفعہ تو خیال آیا کہ انہیں ذرا پرچائیں لیکن پھر سوچا کہ ٹھنگنے آدمی کو معمولی سی پریشانی لگی رہے تو ایسا ضرر بھی نہیں۔ اس طرح مصروف سا رہتا ہے۔ اگر بالکل فارغ ہو تو دن بھر یہی سوچ سوچ کر نڈھال ہوتا رہے کہ ٹھنگنا ہوں۔

کیا ہیون سانگ اور ابنِ بطوطہ گھگو تھے؟

شام لندن پہنچے اور اپنے پرانے ہوٹل میں اترے تو یُوں محسوس ہوا جیسے گھر آ گئے ہوں۔ دروازے کے اندر قدم رکھا تو پورٹر ٹامس نے ہاتھ ملایا۔ استقبالیہ کلرک جولی نے آنکھیں ملائیں اور مینجر بل حسبِ معمول گلے ملے۔ جولی نے بے صبری سے نوید دی کہ ہمارا پانچویں منزل کا پسندیدہ کمرہ جو ایک مدّت تک ہنی مونروں کا تختۂ مشق رہا تھا اب روبسکون تھا، یعنی آج صُبح ہی خالی ہوا تھا اور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ کمرے میں گئے اور جنوبی کھڑکی کھولی تو یکبارگی ہائیڈ پارک کے وسیع سبزہ زار سے پردہ اُٹھ گیا۔ اس کے مخمور جھومتے درختوں، مغرور جھولتے پھُولوں، مشکور چومتے جوڑوں اور مسرور گھومتے بچّوں کو دیکھنا تھا کہ ہمارے دیدہ و دِل کی گرہ کھل گئی۔ پھر ایک مدت تک شاور

(SHOWER) کے نیچے دم بخود کھڑے رہے تو ہمارے جسم وجاں کی کدورت دُھل گئی۔ پھر شلوار اور کرتا پہن کر آرام کرسی کی گود میں بیٹھے ہی تھے کہ ہوٹل کی کوئی دِلارام چائے لے آئی جسے جرعہ جرعہ پینے لگے اور جینے لگے۔ اور جب خاطر مکمل طور پر جمع ہو چکی تو لندن میں رہنے والے دوستوں کی فہرست بنانا شروع کی اور وُہ اس نیّت سے کہ قیامِ لندن کے دوران اس نایاب جنس سے ایک دوست روزانہ کے حساب سے لطفِ رفاقت اُٹھایا جائے۔ ساتھی کے بغیر سیاحت ایسی ہی پھیکی ہے جیسے شریکِ زندگی کے بغیر زندگی۔ تنہا سفر کرتے ہوئے ایک قسم کی بیوگی کا سا احساس ہوتا ہے۔۔۔ خدا جانے ہیون سانگ اور ابنِ بطوطہ کا کیا گزارا تھا؟ غالباً سیّاح تو وُہ اچھے تھے مگر آدمی گھگو ہی تھے۔۔۔ یہ درست ہے کہ اب تک کے سفر میں ہمیں ہر جگہ غیب سے مسیحا و خضر ملتے رہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا ان دونوں بزرگوں کی ملاقات سے بہتر ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ شام کرنل علی نواب [۴۵] کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کرنل علی نواب کو فون کیا تو بولے:

---

[۴۵] اب بریگیڈیر علی نواب۔ ان دنوں لندن میں پاکستان آرمی کی طرف سے ٹیکنیکل لی ایزان آفیسر یعنی PATLO تھے۔

"اگر لندن میں ہو تو تنہا بیٹھے کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟ فی الفور آؤ۔ اگر کھانے سے پہلے پہنچ سکو تو پلاؤ یقینی ہے، کوفتے اور پراُٹھے اغلب ہیں اور سیخ کباب ممکنات میں سے ہیں۔"

جنّت اور جم خانہ ساز چیزیں ہیں

بے شک کرنل علی نواب سے فقط مل لینا بھی بڑی خوشگوار تقریب تھی لیکن جس چیز نے شوقِ ملاقات کو سان پر چڑھا دیا اس میں ان خانہ ساز کوفتوں اور پراٹھوں کی پراسرار کشش کا شائبہ بھی تھا۔ چنانچہ کرنل صاحب کا ہدایت نامہ سفر لے کر جو انہوں نے فون پر لکھوایا تھا ان کے گھر واقع ہینگر لین کا رخ کیا اور اس ہدایت نامے پر چلتے، گاڑیاں بدلتے، قدم گنتے اور سڑکیں عبور کرتے کوئی پون گھنٹے میں ایک گھر کے دروازے کی گھنٹی پر جا انگلی رکھی۔ لاریب یہ کرنل صاحب ہی کا گھر تھا کہ جواب میں خود کرنل صاحب باہر نکلے۔

ہر گھر کا ایک ماحول ہوتا ہے جو سلیقے اور پھوُہڑ پن یا یُوں کہیں کہ جنّت اور جہنم کی مختلف مقداروں سے ترکیب پاتا ہے۔ مبارک ہیں وُہ گھر جن میں جنّت کا عنصر غالب ہوتا ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ ایسے مبارک گھر ہوتے کم کم ہی ہیں۔ اکثر گھر کیمیائی تجزیہ پر جہنم کے جراثیم کا بڑا مثبت ری ایکشن دیتے ہیں۔ ایسے گھروں میں مہمان کے آنے

پر کُچھ اس قسم کی افرا تفری مچ جاتی ہے جیسے ہوائی حملہ ہو گیا ہو۔۔۔ (جہنم +)۔ اور کئی گھروں میں مہمان کی آمد پر بے حسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مہمان خواہ گھنٹہ بھر بیٹھا یا کھڑا رہے گھر والے یہی سمجھتے ہیں جیسے مہمان نہیں کوئی راہرو ہے گزر جائے گا۔۔۔ (جہنم ++)۔ کئی گھروں میں میزبان کے تکلّف سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ کچن سے جوئے شیر کھود کر ڈرائنگ روم میں لائی جارہی ہے اور اسی رستے کھانے کے کمرے تک لے جائی جائے گی۔ (جہنم +++) اور کئی میزبان ہزار تواضع اور نیک نیّتی کے باوجود جب بھی قدم رکھتے ہیں، پاؤں مہمان کے پاؤں ہی پر پڑتا ہے۔۔۔ (جہنم ++++)۔ آخر میں خالص فائیو سٹار جہنم وہ گھر ہوتا ہے جہاں میزبان جوڑے کی خانہ جنگی میں مہمان بھی ثالث بالخیر بنتے بنتے منفی دو چار دانت گھر لوٹتا ہے۔ اس کے بر عکس بہشتی گھروں کا ماحول خاصا مختلف ہوتا ہے۔ مہمان آ جائے تو گھر میں یُوں سما جاتا ہے جیسے پھُولوں کی ٹوکری میں ایک اور پھُول رکھ دیا جائے۔ باہر آندھی ہو یا برسات، درون خانہ سدا بہار کا موسم رہتا ہے، شگفتہ شاداب اور شہوار۔۔۔ رہی تواضع تو وُہ بے حساب اور بے پایاں مگر تکلّف کا بھاری اور بھدا لحاف اوڑھے بغیر۔ لہٰذا سبک اور سلیس۔۔۔ کرنل علی نواب کے گھر کا ماحول کُچھ ایسا ہی بلکہ ذرا زیادہ صحت مند تھا۔ شاید اس لئے کہ گھر میں ڈاکٹر کا وجود بھی تھا یعنی بیگم علی نواب کا۔ اور میاں بیوی مل کر کیا خوش مزاج، خوش اوقات اور خوش ادا میزبان تھے! ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور

باتیں چلیں تو اس قدر دِلنشیں کہ معلُوم ہوا یہ باتیں ہی حاصلِ ملاقات ہیں۔ کھانے کے کمرے میں گئے اور کھانا چلا تو محسوس ہوا یہ کھانا ہی اس شام کا معنی دریاب ہے۔ بالآخر اس بے عیب تقریب میں ایک سقم نکلا تو وُہ صاحبِ خانہ کی میزبانی میں نہ تھا بلکہ ہماری اپنی مہمانی میں یعنی دستر خوان پر جملہ یقینی، اغلب اور ممکن نعمتوں کو موجود پاکر ہمارے ہاتھ سے اعتدال کا دامن چھوٹ گیا۔ کھانے کے باب میں تو ہم وطن میں بھی ایسے پرہیز گار نہ تھے۔ لہٰذا لندن جیسی بدخوراک جگہ میں حسنِ اتفاق سے گھر کا شیزان میسر ہو تو بخدا پرہیز حرام ہو جاتا ہے۔ مارک ٹوین کا کہنا ہے کہ زندگی کی کامیابی کا آدھا راز اس بات میں ہے کہ جو چاہو کھاؤ اور ہاضمے کے لئے خدا پر بھروسا رکھو۔ میاں محمّد صاحب کا ارشاد بھی کُچھ اسی قسم کا ہے۔

مالی دا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے

خالق دا کم پھَل پھُل لانا، لاوے یا نہ لاوے

چنانچہ ہمارا کام پلیٹیں بھر بھر کھانا تھا اور کھاتے رہے۔ آخری لقمے کے بعد ہاضمے کے میوے کے لئے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور کھڑکی سے جھانک کر خالق سے خاموش التجا کر دی۔۔۔ لیکن رخصت کا وقت آیا تو شکم نے مجال جنبش دینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں جامد دیکھ کر محترم میزبان فرمانے لگے:

"ہمارا دستور ہے کہ اپنے مہمانوں کو ٹرین سے آنے کی زحمت تو دیتے ہیں لیکن واپسی پر انہیں اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے جاتے ہیں۔"

ہماری دُعا کے جواب میں پہلا پھل لگ چکا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور کار میں بیٹھے گئے۔ ورنہ مشک بھر کوفتے اور پر اُٹھے کھانے کے بعد اس شام گاڑیاں بدلتا اور سڑکیں عبور کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔۔۔ نیم شب کے قریب جب ہوٹل کے دروازے پر اتر کر کرنل اور بیگم علی نواب کو شب بخیر کہا تو اس شب کے بیشتر لمحے زندگی کی خوشگوار اور پائیدار یادوں میں ڈھل چکے تھے۔

لندن میں آوارہ گردی آکسفورڈ سٹریٹ سے شروع ہوتی ہے

دوستوں کی فہرست پر اگلا نام نیاز مجید کا تھا۔ انہیں فون کیا اور معلُوم ہوا کہ وُہ چند دوستوں کے ساتھ پہلے ہی پروگرام بنا چکے ہیں۔ ہمیں بھی شامل ہونے کی دعوت دی جو ہم نے قبول کر لی۔ پروگرام یہ تھا کہ پہلے لندن کی آوارہ گردی کی جائے اور پھر اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھایا جائے۔ لندن میں آوارہ گردی کی ابتدا آکسفورڈ سٹریٹ ہی سے ہوتی ہے۔۔۔ قارئین میں سے جنہوں نے آکسفورڈ سٹریٹ نہیں دیکھی وُہ انار کلی

کی لمبائی کو دو چوڑائی کو تین اور اونچائی کو چار سے ضرب دے لیں تو اس کے جسم کا اندازہ ہو سکے گا اور انار کلی کے جملہ سیلز مینوں کو نکال کر ان کی جگہ مہ لقا و کافر ادا دوشیزائیں بھرتی کر لیں تو اس کی جان کا اندازہ ہو جائے گا۔ آکسفورڈ سٹریٹ کے ہجوم کے لئے آپ کو دو تین انار کلیوں کے گاہک یکجا کرنا پڑیں گے۔ رہی اس ہجوم کی ترکیبِ نسلی تو نصف کے قریب گورے، ایک چوتھائی کالے، لیکن پاکستانی اور بھارتی اور ایک چوتھائی کالے بھجنگ یعنی غرب الہند کے حبشی۔ دس سال پہلے لندن کے بازاروں میں ایک پاکستانی کے بعد دوسرا ایک مدّت کے بعد ملتا تھا اور اپنے ہم وطن کو دیکھ کر گلے لگانے کو چاہتا تھا۔ گزشتہ دس سالوں میں ہمارے میرپور ہی نے اپنے اتنے فرزند برطانیہ کو برآمد کیے ہیں کہ اگر آکسفورڈ سٹریٹ سے گزرتے ہوئے ہر ہم وطن سے گلے ملنے لگیں تو آخری ہم وطن کی ملاقات کے بعد نئے گلے کا آرڈر دینا پڑے۔ اور اگر حبشیوں کے ساتھ بھی اسی اخوّت کا مظاہرہ کریں۔۔۔ لیکن ان سرکش سینوں والی حبشنوں کو بادِل ناخواستہ حذف بھی کر دیں۔۔۔ تو معانقے کے لئے ایک گنجان اور تاریک کیو لگ جائے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نیا گلا ہی نہیں چیتے کا جگر بھی چاہیے اور شاہین کا تجسس بھی۔ چنانچہ ہم ازراہِ مجبوری جذبۂ اخوّت کو سینے میں دبائے آکسفورڈ سٹریٹ سے گزرنے لگے۔ اگر بندہ بشر ہے تو اس بازار کی دکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ونڈو شاپنگ سے مفر نہیں اور ہم مشرق کے مسکینوں کا دِل تو ہر اس

چمکیلی چیز میں جا اٹکا تھا جو انگریزوں نے بنا سنوار کر ہماری راہ میں رکھ دی یا رواں کر دی تھی۔ باوا آدم باغِ عدن میں دانۂ گندم دیکھ کر ہم سے زیادہ نہ للچائے ہوں گے۔ بہر حال ہم اپنے باوا جی سے زیادہ ثابت قدم نکلے۔ یعنی ہر چیز کو دیکھ کر مُنہ میں پانی بے شک بھر آیا لیکن کسی چیز کو دو بانہوں میں سمیٹ کر بغل میں لینے کی کوشش نہ کی۔ فقط دِل ہی دِل میں فہرستِ خواہشات بناتے گزر گئے اور انہیں پورا کرنے کی حسرت پر کم از کم عارضی قابو پالیا۔

عشّاقِ لندن کا قبلہ

ہماری اگلی منزل پکاڈلی سرکس تھا۔ پکاڈلی سرکس کے جواب میں لاہور اور کراچی کے پاس کُچھ نہیں۔ اور ہاں سرکس سے مراد محض گول سڑک یا چوک ہے۔ وہاں کوئی ہاتھی، چیتا، مسخرہ یا قلاباز نظر نہیں آتا۔ لیکن پکاڑلی سرکس دُوسرے معنوں میں بھی مسخروں اور قلابازوں سے کہیں زیادہ دِلچسپ ہے۔ ایک تو یہ چوک عشّاقِ لندن کا قبلہ ہے۔ لندن کے اکثر چاہنے والوں کی شبینہ ملاقاتوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ سرِ شام محبوب یا محبوبہ جو بھی زیادہ بے تاب ہو اپنے شریکِ محبّت کے انتظار میں مقررہ دُکان کے سامنے آ کھڑا ہو تا یا ہوتی ہے۔ اس مبارک کام کے لئے پکاڈلی ہی کیوں منتخب کی جاتی ہے۔ ہم نا محرمانِ راز کے لئے کُچھ کہنا مشکل ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ طرفینِ

محبّت آتی رات کی کامیابی کے لئے اس دیوتائے محبّت[76] سے بالمشافہ آشیر باد لینا چاہتے ہیں جو سرکس کے عین مرکز میں پَر پھیلائے کمان تانے کھڑا ہے اور جس کا تیر ہر جوڑا اپنے دھڑکتے دِلوں میں ترازو پاتا ہے۔ لیکن اس روز کہ ٹورسٹ موسم اپنے عروج پر تھا یورپ بھر کے ہپّی لڑکے اور لڑکیاں پکاڈلی کی سڑکوں سیڑھیوں اور سیٹوں پر کلبل کلبل کر رہے تھے اور وائے حسرتا کہ اس گندی گھناؤنی مخلوق کی یلغار کے آگے لندن کے نازک طبع عشّاق اپنا دیرینہ آستاں چھوڑ کر چل دیئے تھے۔ خدا جانے ہمارے یار محمّد خالد اختر نے ان ہپّیوں کو کس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے گن گائے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"یہ (بظاہر) بھونڈی نسل ایک انقلابِ عظیم کی علمبردار ہے۔ یہ نسل غرب و شرق، شمال و جنوب کے خطے کے ہر انسان کو ایک رشتے میں پرو دے گی۔ دروغ بانی و ریاکاری، توہم پرستی و پادشاہی، آدمی اور آدمی میں منافرت پر تعمیر کردہ یہ زنداں، کہ جس میں ہم تم رہتے ہیں، ڈھے جائے گا۔ دیکھو خضر کی پیش گوئی پوری ہو کے رہے گی[77]۔"

---

[76] پکاڈلی چوک کے وسط میں CUPID یا EROS کا مجسمہ نصب ہے۔

[77] عودِ پاک کے زیرِ عنوان خط۔ رسالہ فنونِ اپریل مئی ۱۹۷۲ء

منافرت کا زنداں ڈھانے کی ترکیب

میرے پیارے پیش گو، خالد اختر، عرف خضر۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن ایسا ہونے تک آپ ایک زحمت تو کریں۔ کبھی ایک اصلی ہپّی اور ہپّن کے ایک جوڑے سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر صرف ایک لمحے کے لئے ان کے پیرہن کی رنگینی کا تماشا تو کریں۔ ان کے بدن کی خوشبو تو سونگھیں اور ان کے دماغ کی روشنی سے کسب نور تو کریں۔ اس کے بعد اگر آپ اگلے ہی لمحے بھاگ کھڑے نہ ہوئے اور بحرِ ظلمات میں گھوڑے نہ ڈال دیئے تو آپ سچّے اور ہم جھوٹے۔ اور ہم آپ تو خیر کچے انقلابی ہیں، میرا خیال نہیں کہ خود چے گویرا[48] بھی اس پارچاتی زینت، جسمانی طہارت اور ذہنی لطافت کے سامنے ٹھہر سکتا وُہ آپ سے بھی تیز بھاگتا۔۔۔ سو براہِ کرم ہپیوں اور ہپنوں کو مشورہ دیں کہ اگر ہو سکے تو اپنی بنیائنیں دھو کر اور مہینے میں ایک آدھ مرتبہ نہا کر انقلابِ عظیم برپا کرنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم بڑی خوشی سے ان کے ساتھ ایک ہی رشتے میں پروئے جانے کو تیار ہیں۔ لیکن یار خالد، پرونے والوں کو ہدایت کر دیں کہ لڑی میں ہمیں اور آپ کو ساتھ ساتھ پرو دیا جائے یا زیادہ سے زیادہ درمیان میں ایک صاف ستھری، تنگ لباس اور امورِ خانہ داری کی ماہر ہپن پرو دیں اور بس۔ سینڈوچ وہی

---

[48] کیوبا کا مشہور انقلابی جو بولیویا میں بغاوت کی قیادت کرتا ہوا مارا گیا۔

اچھی جس میں خالص شہد کی دبیز اور لذیذ تہہ ہو۔۔۔ پھر لاریب یہ باہمی منافرت پر تعمیر کردہ زنداں ڈھے جائے گا۔

ونڈمل کب اور کیوں مری؟

ہمیں اچانک یاد آیا کہ پکاڈلی کی دلکشیوں میں سے ایک ونڈمل نائٹ کلب بھی تھی جہاں ہمیں دس سال پہلے اس قدر غیر مستور حُسن دکھایا گیا تھا کہ اگر ٹکٹ کی گرانی کا غم دیرپا نہ ہوتا تو حسنِ بتاں سے سیر ہو کر بعد کی تمام عمر یادِ خدا میں بسر کر سکتے تھے۔ بہر حال اب قریب سے گزرے تو ایک پرانی یاد تازہ کرنے کے لئے نیاز سے التجا کی کہ چلو، ایک لمحے کے لئے ونڈمل کے اندر جھانک تو لیں۔ نیاز نے ہمیں استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو ہم نے کہا:

”بد گمانی مت کیجو۔ ہماری نیّت نیک ہے فقط یہ کہ کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔۔۔“

نیاز بولے: ”جناب راہی صاحب۔ مُجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی منزل کا نشان اب باقی نہیں کیونکہ وُہ جو بیچتے تھے دوائے دِل وُہ دکان اپنی بڑھا گئے۔“

”یعنی ونڈمل بند ہو چکی؟“ ہم نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

بولے: "اناللہ۔۔۔"

"یہ ظلم کب اور کیسے ہوا؟" ہمارے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور وُہ اس لئے کہ دُنیا میں ہر در بند ہو سکتا تھا لیکن ونڈ مل کا بند ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ دُوسری جنگ کے دوران برستے بموں کے نیچے بھی ونڈ مل نے اپنے دروازے اپنی حسیناؤں کے گریبانوں کی طرح کھول رکھے تھے۔ بلکہ اسی لئے ونڈھ مل نے اپنا تمام تر فخر تین انگریزی لفظوں میں جمع کر کے بجلی کی روشنی سے اپنی پیشانی پر لکھ چھوڑا تھا[79] WE NEVER CLOSES ۔۔۔ نیاز کو خاموش اور غیر متوجہ پاکر ہم نے سوال دہرایا:

بولا: "صحیح تاریخ وفات تو وارثوں سے پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں لیکن مدّت سے اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور پیاری غالباً کمی استعمال کی وجہ سے ہوئی کیونکہ وُہ دائرے اور زاویئے جو ونڈ مل کی ایکٹرسیں ٹکٹ کے بدلے بے حجاب کیا کرتی تھیں آج کل کی دوشیزائیں ہتھیلی پر رکھ کر بازاروں میں لئے پھرتی ہیں اور اکثر اس صلائے عام کے ساتھ کہ۔۔۔ جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔"

---

[79] یہ نائب کلب کبھی بند نہیں ہوئی۔

اس مقام پر ہماری ٹولی کے ایک ریش بردار اور متشرع رُکن نے کہ انگلستان میں تازہ وارد تھے، نیاز سے سوال کیا:

"یہ لڑکیاں ایسی حرکت کیوں کرتی ہیں؟"

نیاز نے ہمیں آنکھ مارتے ہوئے مولوی صاحب سے کہا:

"مولانا حقوق العباد کے احترام میں۔"

اور مولوی صاحب بقیہ سیر کے دوران اپنے من میں ڈوب کر یہ فیصلہ کرتے رہے کہ مرحبا کہیں یا لاحول پڑھیں۔

لندن میں ہر دوار کی ملاوٹ

پکاڈلی سے نکلے تو تھوڑی سی دیر کے بعد ٹریفالگر سکویئر میں داخل ہوئے۔ لندن کے اس چوک کی تمام تر شہرت اس کے یادگاری ستونوں، چُگتے کبوتروں، کھیلتے فواروں اور لیٹے آواروں کی وجہ سے ہے۔ وُہ تو خیر آج بھی تھی لیکن عین اس وقت ایک نئی شہرت اس چوک میں داخل ہو رہی تھی یعنی انگریز سادھوؤں کا جلوس۔ شاید آتے تو وُہ بھی آواروں کے زمرے ہی میں تھے تاہم جیسا کہ وُہ انگریزی میں کہتے ہیں "ذرا فرق کے ساتھ۔" اور فرق یہ تھا کہ ہر چند کہ چہرے مہرے سے وُہ انگریز ہی تھے، لیکن چہرے

مہرے کو چھوڑ کر باقی ہر مقام پر اچھے خاصے ٹھیٹ دال خور لالے لگتے تھے۔ مختصر سی دھوتی بلکہ لنگوٹی، ننگی توندوں پر زنار اور موٹی گردنوں کے گرد ہار، ایک کے ہاتھ میں کھڑتال، دُوسرے کے گلے میں ڈھولک اور سب کے پاؤں میں کھڑاویں اور اس حلیئے کے بعد کھڑتالیں کھڑکاتے، ڈھولک بجاتے، ہرے رام، ہرے رام الاپتے جا رہے تھے۔ یہ خود تو تعداد میں چار پانچ ہی تھے لیکن بے فکرے تماشائیوں نے اچھا خاصا جلوس بنا دیا تھا۔ معلُوم ہوتا تھا لندن میں تھوڑا سا ہردوار اُٹھ آیا ہے۔ ہمارے مولوی صاحب نے انہیں دیکھا تو بولے:

"لیجئے۔ پاکستان پھر پیچھے رہ گیا اور لالے بازی لے گئے۔"

"کون سی بازی" نیاز نے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں انگریز ہندو ہو گئے؟" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

"تو ہونے دیں۔ یہ پہلے کون سے مومن تھے؟ RELAX مولانا۔۔۔"

"ٹریفالگر سے نکل کر ٹولی تھوڑی دیر کے لئے دریائے ٹیمز کے کنارے ستائی تا آنکہ نیاز نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا:

"چلیئے صاحبان اب گھر چلیں اور کھانا کھائیں جس کو ابھی پکنا ہے۔"

ہم نے کہا: ''اپنا کھانا آپ پکانا بے شک مستحسن فعل ہے لیکن پورے آٹھ آدمیوں کے لئے پکانا ذرا مشکل فعل بھی ہے۔ اتنے تھوڑے وقت میں کیسے پکایئے گا؟''

نیاز بولا: ''آپ کو کھانا کھانا ہے یا کھانا پکانے کی ترکیب کھانی ہے؟ آپ بے فکر رہو۔''

او فلودہ لے آ اوے منڈیا

چنانچہ بے فکر ہو کر ٹیوب ٹرین میں بیٹھ گئے اور کوئیز وے QUEENSWAY کے سٹیشن پر بر آمد ہوئے۔ سٹیشن سے چند قدم چل کر نیاز ایک دکان کے سامنے رکا جس کی پیشانی پر ایک غیر معروف سا لفظ DELICATASSEN (ڈیلی کیٹسن) لکھا تھا ۔سوچا: خدا جانے یہ کیا بلا ہوتی ہے؟ لیکن دیکھا تو نیچے ایک اُردُو سطر بھی درج تھی:

''رنگا رنگ پاکستانی کھانے بیٹھ کر کھایئے یا ساتھ لے جایئے۔''

اس ایک اُردُو سطر نے ہمارے دو معمے حل کر دیئے۔ ایک تو لفظ ڈیلی کیٹسن کا حسب نسب معلُوم ہو گیا۔ یہ غالباً DELICACY (ڈیلی کیسی) کے بطن سے پیدا ہوا تھا جس کے ایک معنی چیدہ اور نفیس پکوان بھی ہیں۔ دُوسرے نیاز کے اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی اصل جائے ولادت کا پتہ بھی چل گیا کیونکہ نیاز کے اشارے پر بھاری بھر کم مگر سبک دست دکاندار مختلف رنگوں سے کاغذی ڈبوں میں کھانے بند کرنے لگا۔

ہم نے نیاز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ہمارا سوال پی کر دکاندار سے ہمارا تعارف کرانے لگا:

''پہلوان جی یہ ہیں ہمارے دوست کرنل صاحب۔ ابھی ابھی وطن سے آئے ہیں۔''

پہلوان جی نے چمچہ ادھر رکھ دیا اور ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے:

''جی آیاں نوں۔ کی خاطر کریئے بادشاہو؟ آج گرمی اے، فلودہ پیو گے؟ او منڈیا۔۔۔''

ہم پاکستان بلکہ گوجرانوالہ پہنچ چکے تھے اور پوچھا تو معلُوم ہوا کہ پہلوان جی سچ مچ گوجرانوالہ ہی کے ایک اکھاڑے سے اُٹھ کر لندن آئے تھے۔ پہلوان کے پیار بھرے پنجابی لفظوں نے ہمارا دِل لوٹ لیا۔ خیر ہمارے دِل میں تو یُوں بھی پنجاب کا درد بھرا تھا۔ ہم نے سوچا: کیا مقامی اہلِ درد کو بھی یہ پنجابی اسی روانی سے لوٹتا ہے؟ اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اسی وقت دو میمیں دکان میں داخل ہوئیں اور وُہی پنجابی بولنے والا اکھڑ پہلوان انگریزی بولتا ہوا ریشم کا گول مول گدگداتا گولا بن گیا۔ بلکہ سچّی بات ہے میموں کی انگریزی تو ہماری سمجھ میں آگئی لیکن پہلوان کی بلاغت ہمارے ادارک سے دامن بچا کر نکل گئی مگر ٹھیک نشانے پر جا بیٹھی یعنی میموں کے دِلوں میں۔ اور ہمارے پہلوان نے ہمارے دیکھتے دیکھتے میموں کے دِل ہی نہیں، جیبیں بھی لوٹ لیں۔

پہلوان کو خدا حافظ کہا اور خوراک کے تھیلے اُٹھا کر نیاز کے فلیٹ پر گئے۔ یُوں جیسے شکار گاہ سے پکا ہوا شکار مار لائے ہوں۔ پھر نیاز نے جملہ حاضرین کو فرائض قبل طعام تقسیم کئے۔ کسی نے چولہا جلایا، کسی نے مُنہ جلایا، کسی نے ہاتھ دھوئے، کسی نے پلیٹیں دھوئیں۔ ہمیں مہمان سمجھ کر کوئی کام نہ دیا گیا۔ لہٰذا ہم گوشت اور پلاؤ کی حقیقت منتظر کو سونگھ سونگھ کر دندان آز تیز کرتے رہے۔ آخر کھانا چُنا گیا اور کھانے والے میز کے گرد اس طرح کھڑے ہو گئے، اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گرد سبیل۔ لیکن جو نہی پہلے مومن نے بعد از بسم اللہ پلاؤ پر ہاتھ ڈالا باقی مومنین کلمے کی گونج میں اس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے گویا ایک لمحے میں کنار سلسبیل سے ہٹ کر میدانِ دغا میں مالِ غنیمت لوٹ رہے ہوں لیکن جب لوٹ تھمی تو ہم پر پہلی مرتبہ ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا یعنی جو مزہ چھین جھپٹ کر کھانے میں ہے وُہ پیش کئے ہوئے کھانے میں نہیں۔ یہ سات مومنین کا ذاتی تجربہ تھا۔ لہٰذا اب ہمیں اقبال سے اتفاق کئے بغیر چارہ نہ تھا کہ شکار مُردہ سزاوار شاہباز نہیں۔

آخر اس شاہبازی سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کو لوٹے تو ایک بجے رات کا عمل تھا۔ اگلی صُبح اتوار تھا۔ چنانچہ ایک لمبی نیند کی نیّت سے سو گئے۔ لیکن ابھی چار ہی بجے تھے کہ ہماری آنکھ کھل گئی۔ اس لئے نہیں کہ اقبال سے اتفاق کے جوش میں ہم سے بھی لندن میں آدابِ سحر خیزی نہیں چھوٹے تھے بلکہ اس لئے کہ ہمارے ہاضمے کی نزاکت نے

ہمیں منزلِ اقبال بخش دی تھی۔ گوجرانوالے کا مرغ ہمارے پیٹ میں پہنچ کر فارغ نہ بیٹھا تھا۔۔۔ بہر حال ہم نے اپنی بے خوابی کا دینی فائدہ اُٹھایا اور چار بجے ہی اُٹھ کر نماز کی تیاری کی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو شکوے کی بجائے شکر ادا کیا کہ قدرت بُرے ہاضمے سے بدتر عطیہ بھی دے سکتی تھی۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ کھانسی ہو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تپ دق نہیں۔ سو دُعا مانگتے ہوئے ہم نے اپنے ہاضمے کی طرف کوئی اشارا نہ کیا۔ یُوں بھی وُہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے اور شاید ہماری یہی ادا قاضی الحاجات کو بھا گئی کہ ہمارا ہاضمہ مصلّے پر بیٹھے بیٹھے ہی سنبھلنے لگا۔ مصلٰے سے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا تو لندن ابھی سو رہا تھا۔

ہم دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے اور ہمیں نیند آ گئی۔ جاگے تو حسبِ معمول دس بج رہے تھے، یعنی شریفوں کے جاگنے کا وقت تھا۔ باہر لندن بقعۂ نور بن چکا تھا اور ہمارا دِل و دماغ پر اسی طرح تازہ تھا جیسا اس صبح کا اخبار جسے دِلارام چائے کے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔۔۔ اور لیجئے، پھر ہمارے مرغوب مضامین آ گئے۔ چائے نوشی اور اخبار بینی۔ لیکن یہ ہمارے ہی نہیں، جملہ اہلِ دِل کے محبوب مشاغل ہیں۔ اگر یہ دونوں مشغلے ساتھ ساتھ عمل میں آئیں تو ان کی محبوبیت باہم ضرب کھا جاتی ہے اور اگر بستر میں لیٹے لیٹے ہی عمل میں آئیں جیسے کہ ہمارے عمل میں آ رہے تھے تو حاصلِ ضرب

ناپنے کے لئے آئن سٹائن کا فارمولا[80] استعمال ہوتا ہے۔یعنی اسے روشنی کی رفتار سے دو دفعہ مزید ضرب دی جاتی ہے۔یُوں سمجھئے کہ لطف و سرور کا ایٹم بم پھٹ پڑتا ہے۔

لندن میں چھوٹا سابل کسر

آج اتوار تھا۔۔۔ دوستوں کی فہرست میں اگلا نام ایک ایسے دوست کا تھا جو وطن میں ہمارے قریب ہی کے رہنے والے تھے لیکن انہیں آج تک دیکھا نہ تھا۔ فقط ایک دُوسرے کے متعلق سُن رکھا تھا۔ یہ تھے محمّد نواز پنڈی سے چلتے ہوئے کیپٹن انور نے ان کا پتہ اور فون نمبر بھی دیا تھا اور انہیں خط بھی لکھ دیا تھا۔ اب فون کیا تو جواب میں کوئی محمّد اقبال بولے۔ ہم نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا:

"مُجھے محمّد نواز سے کام ہے۔"

جواب آیا: "وُہ تو اس وقت موجود نہیں۔"

کہا: "آئیں تو انہیں میرا نام بتا دیں اور یہ بھی کہ ان کا گاؤں میرے گاؤں سے صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔وُہ پہچان جائیں گے۔"

---

[80] آئن سٹائن کا مشہور فارمولا E=MC2 یعنی طاقت = مقدار x روشنی کی رفتار کا مربع۔اسی فارمولے سے ایٹم بم کی طاقت ناپی جاتی ہے۔

بولے: ”اور آپ ہی کے گاؤں میں میرا گھر آپ کے گھر سے صرف تین قدم کے فاصلے پر ہے۔۔۔ کیا مُجھے کسی خدمت کے قابل سمجھا جائے گا؟“

معاً ہمیں حاجی محمّد اشرف خان کا لمبا پتلا اور شرمیلا سالڑکا یاد آیا جو آج سے سات سال قبل اچانک گاؤں سے ولایت ”بھاگ“ آیا تھا۔ پوچھا تو بولا:

”آپ کا اندازہ ایک سو فی صد درست ہے۔“

الغرض آدھ گھنٹہ بعد دو نوجوان، دو نہایت ہی خوش طبع دوست۔۔۔ جو انگلستان کے بقیہ قیام میں ہمارے نہایت ہی پیارے رفیق ثابت ہوئے۔۔۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ محمّد نواز توقع سے کم عمر دکھائی دیئے یعنی پینتیس کی بجائے کوئی بیس بائیس سال کے لگے اور محمّد اقبال توقع سے کُچھ زیادہ اونچے یعنی چھ فٹ کے بجائے سوا چھ فٹ اور دونوں سراپا محبّت، سراپا تواضع، بلکہ اظہارِ تواضع کے لئے بے تاب بے قرار۔

ان کی بے تابی کو بمشکل روکا۔ انہیں وطن اور گاؤں کی باتیں سُنائیں کہ ہمارے پاس یہی بڑا تحفہ تھا۔ اس سال گاؤں میں کبڈی کون جیتا؟ بیل کس کا اوّل آیا؟ شادی کس کی ہو گئی؟ لڑائی میں کون پٹا؟ میلہ کیسا رہا؟ اور لندن کی باتیں ان سے سنیں کہ وہی اس کے رازداں تھے۔ تھیٹر کون سا دیکھیں؟ کلب کونسی جائیں؟ ریستوران کونسا اچھا ہے؟

سوٹ کہاں سے سلوائیں؟ سیر کہاں کی کریں؟ اتوار کہاں گزاریں؟ باتیں کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ کھانا کھایا اور پھر لندن کے ان دیرینہ مزاج شناسوں کی رہنما اور اقبال کی کار میں لندن گردی کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ تھیٹر ہے یا شہادت گاہ؟

اتوار کے دن لندن کی رونق بازاروں سے اُٹھ کر پارکوں، سینماؤں، کلبوں اور کھیل کے میدانوں میں بکھر جاتی ہے۔ چنانچہ اس سہ پہر کو رُخ لندن کو ہر ممکن زاویئے سے دیکھنے اور پرکھنے کے لئے کئی سبزہ زاروں میں پھرے، کئی تفریح کدوں میں جھانکا اور کئی بازی گاہوں میں گھومے اور آخر حسن و ہیجان سے مغلوب و مجبور ہو کر لیسٹر سکویئر کے ایک تھیٹر میں داخل ہو گئے کہ شاید اس جھولتے لندن SWINGING LONDON کی ہوشربا گردش کے بعد اعصاب و اعضا کو کُچھ سکون میسر ہو۔ لیکن یہاں بھی پردہ اُٹھا تو وُہی آسماں پیدا تھا بلکہ ذرا اور تجلّی خیز اور اشتعال انگیز ستاروں کے ساتھ۔ معلُوم ہوتا تھا ہر شہابِ ثاقب سٹیج سے ٹوٹ کر دِل ناصبور سے آٹکرائے گا۔ یعنی اعصاب و اعضا تو پہلے ہی تناؤ کی نذر ہو چکے تھے۔ اب ایمان پر بھی دباؤ پڑنے لگا۔ نہ باہر امان تھی، نہ اندر عافیت، دِل میں کہا: الٰہی اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟ بشارت ہوئی کہ کہیں نہ جائے۔ یہیں ٹھہرے اور اس کھلے کفر کے مقابلے میں ڈٹ کر

ایمان کی حفاظت کرے کہ یہی مومن کی شان ہے۔ بے شک ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ مسلمانی آسان کام نہیں۔ یہ شہادت گاہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ آج ٹکٹ لے کر براہِ راست شہادت گاہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ پردہ اُٹھا اور پہلے سین کے ستاروں سے ہی آنکھیں چار ہوئیں تو سر چکرانے لگا۔ پتہ چلا کہ ابھی پانچ سین اور باقی ہیں۔ یعنی ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ قصّہ کوتاہ متواتر تین گھنٹے ہم امتحان دیتے رہے۔ جب بھی نیا سوال سامنے آتا سر کے ساتھ ایمان کو بھی چکر آنے لگتا کیونکہ اکثر سوال ہمارے تہذیبی اور دینی سلیبس سے سراسر باہر تھے۔ چنانچہ پرچہ ختم ہوا اور ہم نے اپنے نمبروں کا اندازہ لگایا تو معلُوم ہوا کہ شاید بالکل فیل تو نہیں ہوئے لیکن بمشکل تھرڈ ڈویژن ہی ملا ہے۔ گویا شہادت گاہ سے شہید نکلے نہ غازی بلکہ WALKING WOUNDED[۸۱]۔۔۔ آپ کسی تازہ تھرڈ ڈویژن لینے والے کو چلتا دیکھیں تو معلُوم ہو گا کہ غریب کو سر کے علاوہ دونوں ٹانگوں پر بھی چوٹیں آئی ہیں۔۔۔ ہم تو خیر نو آموز تھے۔ ہمارے لندن شناس دوستوں کی رفتار میں بھی واضح ہزیمت تھی۔ بلکہ کُچھ یہی حال دیگر تماشائیوں کا بھی تھا جو دِل پر ہاتھ رکھے باقی شب

---

[۸۱] ان زخمیوں کے لئے قومی اصطلاح جو میدانِ جنگ سے خود چل کر واپس آسکتے ہیں۔

گزارنے جارہے تھے۔ اس رنگ و روشنی کے ہنگامے میں کئی تاریکیاں اور گہری ہو گئی تھیں۔

پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

کوئی ڈیڑھ بجے رات کا عمل تھا۔ ہم بھی ہوٹل پہنچ کر بستر کو گلے لگا کر سو گئے۔

رالف رسل غالب کو آگرے سے دِلی پھسلا لائے تھے

ہم نے پاکستان میں ایک مرتبہ پروفیسر رالف رسل کی ٹیلیویژن پر تقریر سُنی تھی اور کُچھ چونک پڑے تھے اگر کوئی روسی چینی یا حبشی یہ تقریر کرتا تو ہمیں تعجّب نہ ہوتا لیکن ایک انگریز کا معقول سے بیروں، خانساموں کی زبان بولنا بھی باعثِ حیرت ہوتا اور یہ انگریز تو براہِ راست کوثر میں دُھلی ہوئی قلعہ معلّٰی کی اُردو بول رہا تھا اور فقط اُردُو ہی نہیں، غالب پر بول رہا تھا! یعنی بیان کی تاثیر تو تھی ہی ذکر بھی اس پری وش کا تھا جو آسان کام نہ تھا۔ اس سے پہلے ہزاروں انگریزوں سے ملنے اور بولنے کے بعد ہمارا ایمان تھا کہ ایک سال چونچ اور صحت مند حلق والا طوطا تو اُردُو تلفّظ اور صرف و نحو پر عبور حاصل کر سکتا ہے مگر ایک انگریز "کرنے سکٹا" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ پروفیسر رسل کا شین قاف تو خیر تھا ہی درست، اور "ٹ" اور "ڈ"

بھی ان کی خانہ زاد تھیں، حیرت ان کی "ت" اور "د" کی آوازیں سن کر ہوئی جو کوار
گندل کی طرح ملائم اور کومل تھیں۔۔۔ گمان ہوتا تھا کہ اگر آپ نے خود نہیں تو آپ
کی زبان نے یقیناً دلی میں پرورش پائی ہے یا کم از کم آپ نے نوک زبان دلی سے بنوائی
ہے۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو آپ کا حلق بلاشبہ جامع ازہر کی ساخت تھی کیونکہ آپ
کا "غ" اور "ق" بھی گلے کی گہرائی سے اس قدر پالش ہو کر برآمد ہوتا تھا کہ اگر کوئی
عرب سُن پاتا تو جوشِ غیرت سے اپنے گلے پر چھری پھیر لیتا۔۔۔ اس قسم کے انگریز
سے ہمیں ملنے کا شوق تھا اور یہ شخص بذاتِ خود لندن میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام
ہم نے پاکستان سے چلتے وقت ہی اپنی فہرست میں لکھ لیا تھا۔

اب لندن میں ملکہ برطانیہ کو چھوڑ کر کسی دُوسرے شخص سے ملنا ہمارے لئے مشکل نہ
تھا۔ یہ ہمارا نہیں ہماری پروگرام ساز مس پارس کا دعویٰ تھا۔۔۔ چنانچہ ہم نے چند اور
ناموں کے علاوہ پروفیسر رسل کا نام بھی لیا تو بولی:

"اگر یہ شخص زندہ ہے اور لندن میں ہے تو مناسب وقت پر ملاقات کرانا میرا ذمّہ رہا۔
یہی تو میرا کام ہے۔"

اور پروگرام کے مطابق پروفیسر صاحب کو ملنے کے لئے آج صُبح دس بجے وُہ مناسب
وقت تھا۔ جائے ملاقات لندن یونیورسٹی کا سکول آف اورینٹل سٹڈیز تھا جہاں پروفیسر

صاحب شعبہ اُردُو کے استاد تھے۔ پہنچا تو انتظار کرتے پائے۔ ہم نے اکثر انگریزوں کے چہروں اور اندازِ گفتگو میں ان کی ظاہری خوش خلقی کے باوجود، نسلی رعونت کا شائبہ محسوس کیا ہے، رالف رسل کے چہرے یا زبان پر کوئی ایسا داغ یا دھبّہ نہ تھا۔ بچّوں کی طرح بے گناہ سا چہرہ، اور بچّوں ہی کی طرح مسکراتی، متجسس آنکھیں، زبان میں مروّت اور خاکساری اور دماغ تفاخر سے یکسر عاری۔ اور یہی حقیقی استادوں کا حسن عالمگیر ہے۔۔۔ تعارف کے ابتدائی مراحل ہی سے پتہ چل گیا کہ آپ بھی دُوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان اور برما کے محاذ پر لفٹینی کر چکے تھے۔ ساتھیوں کا ذکر آیا تو آپ نے کسی قدر عقیدت سے ایک برما کے رفیق اور اپنے اُردُو کے استاد لفٹننٹ محمّد نواز کا نام لیا اور نام سنتے ہی ہم حیرت سے سکتے میں آ گئے کہ آپ کے استاد لفٹننٹ محمّد نواز[۸۲]۔۔۔ جو ہمارے بھی رفیق تھے۔۔۔ مردان کے رہنے والے ایک ڈبل پٹھان تھے جن کی اپنی اُردُو اس وقت تک مُنہ سے نہیں نکلتی تھی جب تک اس کا ہر لفظ پشتو سے صحت کا سرٹیفکیٹ نہ لے لیتا۔۔۔ لیکن حیرت ایک طرف ایسے پرانے رشتے کی ناگہانی دریافت پر اکھڑ اجنبی بھی پگھل کر باہم شیر و شکّر ہو جاتے ہیں۔ اِدھر پروفیسر صاحب تو پہلے ہی ایک رواں دواں جوئے شیر تھے۔ بقدرِ توفیق تھوڑی سی شکّر ہم نے

---

[۸۲] بعد میں کرنل محمّد نواز ممبر انتظامیہ سی ڈی اے۔ اسلام آباد۔

بھی بہم پہنچائی اور یہ مختصر سی صحبت ایک نہایت ہی خوش ذائقہ اور خوشگوار محلول میں ڈھل گئی۔۔۔ لیکن جب غالب کا ذکر چھڑا۔۔۔ اور اس کا چھڑنا ناگزیر تھا۔۔۔ تو ہمیں پہلی مشکل پیش آئی۔ عام حالات میں ہم غیر ملکی اُردُو دانوں سے بڑی غریب نوازی سے ملتے ہیں کہ ہماری اُردُو ان کے مقابلے میں بہر حال معلٰی ہوتی ہے۔ پروفیسر رسل نے جب اُردُو میں گفتگو کا آغاز کیا تو ہم نے موقع پا کر اپنی اُردُو دانی کا ذرا عالمانہ سا مظاہرہ کرنا چاہا اور یکّے بعد دیگرے پہلے سے تیار کیلئے ہوئے چند بلیغ اور با محاورہ جملے چھوڑے جن میں الّا، البتہ، چہ جائیکہ وغیرہ کا استادانہ چھڑکاؤ تھا مگر جب جواب میں ادھر سے ''شمار صبحہ مرغوب بت مشکل پسند'' کا زوردار چھینٹا آیا تو ہماری بلاغت کے پَر بھیگ گئے۔ غالب کے چند شعر سمجھ لینا ایک بات ہے اور خود غالب کو سمجھنا دُوسری بات ہے۔ پروفیسر صاحب سالم غالب سے آشنا تھے۔ ہمیں غالب کے قریب ہونے کا کُچھ زعم تھا لیکن پروفیسر صاحب ہم سے کہیں زیادہ میرزا کے قریب نکلے۔ انہیں غالب کے کلام کے علاوہ اس کا شجرہ نسب بھی یاد تھا۔ وُہ تو ابن فریدوں سے لے کر توقان بیگ سے ہوتے ہوئے اسد اللہ خان غالب تک تمام ترکانِ سمرقد سے آشنا تھے اور نہ صرف غالب بلکہ غالب کے جملہ دوست اور دشمن ان کی گرفت میں تھے۔ میرزا کے بچپن کے قصّے یُوں بیان کرتے تھے جیسے آگرہ میں ننھے اسد کا پنگھوڑا اپنے ہاتھوں سے ہلاتے رہے ہوں اور بعد میں آپ ہی اسے بہلا پھسلا کر دِلی میں ننہال کے یہاں

لے آئے ہوں جہاں پال پوس کر اسے جوان کیا ہو۔ کوچہ بَلّی ماراں سے بے تکلّفی کا یہ عالم تھا کہ آج بھی انہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر کوچے کے ایک سرے پر چھوڑ دیا جاتا تو دیواریں چھوئے بغیر دوسرے سرے پر جا نکلتے۔ اگر غالب زندہ ہوتے تو راہ پر چپکے سے ان کی بیٹھک میں داخل ہو کر مرزا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتے۔ "بوجھو کون؟" پروفیسر صاحب کے پاس غالب کے معاشقوں اور مرافعوں، قرضوں اور جرمانوں، حسرتوں اور ارمانوں کا مکمل حساب تھا۔ وُہ ستم پیشہ ڈومنی کے غمزوں اور میرزا کی آہوں کا بھی صحیح ریکارڈ رکھتے تھے اور چنا جان اور منا جان کے چال چلن اور میرزا کی نیّت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔۔۔ قصّہ مختصر ہم غالب کے محاذ پر مغلوب ہو گئے۔ اگرچہ ہمیں اعتراف ہے کہ گھر سے ہم پروفیسر کو مرعوب کرنے نکلے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آخر ہم بھی ایک مصنّف قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ اپنی کتاب کی ایک جلد بھی ساتھ رکھ لی تھی کہ جب اپنی ہوشربا خطابت سے پروفیسر کو عارضی طور پر بے ہوش کر چلیں گے تو اُٹھتے وقت آخری وار کے طور پر اسے کتاب بخش کر ہمیشہ کے لئے اپنا حلقہ بگوش کر لیں گے لیکن تدبیر کند بندہ والی بات ہے۔ پروفیسر صاحب نے زبان کھولتے ہی وُہ قاطع برہان اولے برسائے کہ ہم باقی عمر کے لئے نائی سے بے نیاز ہو گئے۔ سر کے بعد کانوں کو ہاتھ لگایا تو ان میں چھوٹے چھوٹے حلقے لٹکتے محسوس ہوئے۔ چنانچہ کتاب بغل میں داب کر اُٹھنے لگے تو پروفیسر صاحب کی نگاہ اتفاقاً کتاب پر جا پڑی۔ بولے:

”یہ کون سی کتاب ہے؟“

ہم نے تقریباً اعترافِ جرم کرتے ہوئے کہا: ”یہ میں نے لکھی ہے۔“

”توماشاء اللہ آپ مصنّف بھی ہیں۔ میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“

”دراصل آپ ہی کے لئے لایا تھا لیکن۔۔۔“

”تولایئے۔“

کتاب لیتے ہوئے پروفیسر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور اسے دو تین جگہ سے کھولا۔ کُچھ دیکھا کُچھ پڑھا اور ہم اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ شاید اب آخری وقت ہی ہماری قدر و قیمت پہنچانتے اور ہدیہ تحسین پیش کرتے ہیں۔ پاکستان میں تو کئی مہربانوں نے کتاب پڑھے بغیر ہمیں مبارک باد کے خط لکھے تھے۔ آخر پروفیسر صاحب بولے:

”آپ کی کتاب کی چھپائی اچھی ہے۔“

ہم خاموش رہے کہ اس تحسین کا رُخ ہماری طرف نہ تھا، چھاپہ خانہ کی سمت میں تھا۔

”آپ کی تصویر بھی خوب ہے۔“

یہ بھی سراسر فوٹو گرافر کے ہاتھ کی صفائی تھی۔ ہم نے محض اخلاقاً سر خم کیا اور انتظار کرنے لگے کہ اب ہمارے زورِ قلم کی شدّت محسوس کرتے ہیں لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ

پروفیسر صاحب کتاب اور موضوع بند کر کے ہماری طرف الوداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ ہم نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا

"مُجھے کتاب کے متعلق آپ کی رائے سُن کر خوشی ہو گی۔"

"وُہ تو کتاب پڑھ کر ہی دی جا سکتی ہے، لیکن کوئی ایک سال بعد میں مصروف آدمی ہوں۔"

اور پھر آنکھ مارتے ہوئے ازراہِ شرارت کہنے لگے:

"لیکن داناؤں کا قول ہے کہ اگر ہر آدمی اپنی رائے شکر میں لپیٹے بغیر بیان کر دے تو دُنیا میں دوستیاں ختم ہو جائیں۔"

اس عارفانہ حکمت کے سائے میں کُچھ ہنستے کُچھ کانپتے پروفیسر صاحب سے رخصت ہوئے۔۔۔ اس بات کو پانچ سال ہونے کو آئے ہیں اور ابھی تک پروفیسر صاحب کی رائے آنا باقی ہے۔ شاید اسی لئے ہماری ان کی دوستی بھی باقی ہے۔

کیو گارڈن باغوں کا باغ ہے

ہوٹل میں پہنچے اور کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ہم نے فون اُٹھا کر ہیلو کہا تو ادھر سے آواز آئی:

"کیا یہ کرنل خان بول رہے ہیں؟"

مدّت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے مگر یہ آواز بلاشبہ مس این پارس کی تھی۔ ہمیں دِل لگی سوجھی اور ایک مقابلے کا سوال پوچھا:

"کیا یہ کوئی بُلبُل بول رہی ہے؟"

"دیکھیں، میں این ہوں۔ آپ کی شاعری کی داد تو بعد میں دوں گی۔ اس وقت یہ بتائیں کہ آپ کو پھُولوں میں دلچسپی ہے؟"

"دلچسپی نہیں، عشق ہے لیکن این پارس کے بعد!"

"تو اگر آج آپ صرف پھُولوں ہی پر قناعت کریں تو ایک پارٹی سرکاری کار میں کیو گارڈن KEW GARDENS کی سیر کو جا رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ بھی شامل ہوں۔"

"پارٹی میں اور کون ہو گا۔"

"ایک جرمن جوڑا اور ایک انگریز لڑکی۔"

"اگر اس انگریز لڑکی کا نام این پارس ہے تو ہم بھی جائیں گے۔"

”پھر پانچ بجے اپنے ہوٹل کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو جائیں اور اگر ہمیں اپنا انتظار کرتا نہ پائیں تو ہمارا انتظار کریں۔“

اور پانچ بجے شام ہم مس پارس کے قرب میں کیو گارڈن روانہ ہوئے۔ یُوں تو ایک امریکی نے جب پہلی مرتبہ انگلستان کے لامتناہی قدرتی سبزہ زاروں کو دیکھا تھا تو چلا اُٹھا تھا: ”ارے، یہ تو بہت بڑا پارک ہے۔“ لیکن کیو گارڈن باغوں کا باغ ہے۔ لیکن اس میں قدرت کے علاوہ انگریزوں نے بھی کُچھ کام کیا ہے۔ انگریزوں میں لاکھ خرابیاں سہی ۔۔۔ اور ان کا بین الاقوامی چال چلن بلاشبہ مشکوک ہے تاہم اپنے وطن کے اندر یہ لوگ ایسے بد چلن نہیں۔ ان کے بہت سے ادارے مثلاً برٹش میوزیم، رائل گیلری، کیو گارڈن وغیرہ دیکھ کر تو ان کی شرافت بلکہ عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمیں شالامار، باغِ جناح اور گلستانِ فاطمہ پر بجا طور پر فخر ہے لیکن یہ صرف باغ ہیں۔ کیو گارڈن محض باغ ہی نہیں برگ و گُل کی ایک وسیع اور خود مختار سی دُنیا ہے۔ جس کے اپنے عجائب گھر میں اپنی تجربہ گاہیں ہیں، اپنے کتب خانے ہیں ۔۔۔ الغرض یہ گلستان ہی نہیں، دبستان بھی ہے ۔۔۔ میر گاہ ہی نہیں درسگاہ بھی ہے۔ دُنیا جہاں کا کوئی پھل، پھُول یا پودا ایسا نہیں جو اس کی پہنائی میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر جملہ پھل، پھُول اور پودے اپنے اپنے خاندانوں کے لحاظ سے اپنے اپنے تختوں میں بستے ہیں ۔۔۔ رنگ و نسل کے مغالطے یا فساد کا کوئی اندیشہ نہیں۔ باغ میں سب سے اجنبی عمارت ایک چینی پگوڈا ہے

جس میں ہر چند کہ خدا کی پرستش نہیں ہوتی، تاہم رہتے وہاں خدا اور پھُول ہی ہیں۔ اور شاید پھُول کسی اور جگہ اتنے خوش نہ ہوں گے جتنے اس پگوڈے میں کہ انہیں کسی دُوسری جگہ اس سے بہتر صحبت میسّر نہ ہو گی۔ ہمیں خوش قسمت پھُولوں پر بہت رشک آیا اور اگر ہمارے ساتھ این پارس نہ ہوتی تو اور زیادہ رشک آتا۔ جرمن جوڑا کہ ایک سائنسدان قسم کی مخلوق تھی، ہنستے کھیلتے پھُولوں سے دامن بچا کر ایک لیبارٹری میں داخل ہو گیا۔ لیکن ہمیں ان تجربہ گاہوں میں جھانکنا گوارا نہ ہوا کہ وہاں پھُولوں کو چوما نہیں، چیرا جاتا ہے۔ مس پارس نے بھی ہماری تائید کی۔ بلکہ ورڈز ورتھ سے مزید تائید لائی کہ جہاں تک پھُول پتوں کے چیرنے پھاڑنے کے عمل کا تعلق ہے "WE MURDER TO DISSECT"[۸۳]۔ چنانچہ ہم ان کے ہم خیال اور ہم کنار ہو کر علیٰحدہ سیرِ گُل کو چل پڑے اور پھُولوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے رنگ و بو کا تماشا کرنے لگے۔ جرمنوں کی آنکھوں سے نہیں، بھونروں کی آنکھوں سے۔ اور یُوں معلُوم ہو تا تھا کہ ان آنکھوں سے دیکھا جانے کے بعد پھُول خوشی سے کھِل اُٹھے ہیں۔ بلکہ یُوں بھی کہ جیسے ان کے ننھے منے لبوں سے قہقہوں کی صدائیں اُٹھ رہی ہوں

---

[۸۳] ہم پھُول پتّے چیرتے نہیں، قتل کرتے ہیں ___ ورڈز ورتھ

ورنہ بخدا ہم بھی انہیں جرمن قصابوں کی نیّت سے دیکھتے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے۔

الغرض ہم بھونروں کی طرح چمپا کے تختوں سے چنبیلی کو جاتے، چنبیلی سے موتیا کو اور موتیا سے گلاب کو۔ لیکن گلاب کے تختوں میں گئے تو ان کے رنگارنگ پھُولوں نے ہمارا دامن تھام لیا، اودے، نیلے، پیلے، کالے لیکن سب سے پیارے لال مہکتے پھُول جیسے ہزاروں دلہنوں نے یکبارگی اپنے نقاب الٹ دیے ہوں۔ جس پھُول پر نگاہ پڑتی، اسی پر قربان ہو جاتی اور وُہ نگاہیں جو بچ گئیں، ان کے ننھے منے معصوم بچّوں پر نچھاور ہو گئیں جنہیں انگریز مائیں سیر باغ کو لے آئی تھیں اور جو اس وقت ماؤں سے بے خبر گلاب کی ایک پھلواڑی میں پھُولوں سے کھیل رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ بچّے پھُولوں سے کھیل رہے تھے یا پھُول بچّوں سے کہ بچّے بہت چھوٹے تھے۔ بمشکل ایک پھُول سے دُوسرے پھُول تک پہنچ سکتے تھے اور یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے پھُول بڑھ کر لڑکھڑاتے بچّوں کی انگلی تھام لیتے ہوں۔ بلکہ بعض اوقات تو بچّوں اور پھُولوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ خصوصاً بہت چھوٹے بچّوں اور بہت بڑے پھُولوں میں ایک سی رنگت ایک سی قامت اور ایک سی نزاکت۔۔۔ جمال سے ہم ہمیشہ اور ہر جگہ متاثر ہوئے ہیں کہ ہم طبعاً جمال پرست ہیں۔ جمال کا سب سے محبوب مظہر تو شاید عورت ہی ہے اور جملہ اہلِ دِل کی طرح ہمارے من مندر میں بھی کوئی مورت ہے تو اسی کی ہے

لیکن جمال کے دُوسرے مظہر بھی کُچھ کم دِلفریب نہیں، خصوصاً بچّے۔ بلکہ کوئی بچّہ انسان کا، اونٹ کا، بکری کا، جتنا کم سِن اتنا ہی دِلربا۔ کسی پنجابی نے کیا پیاری بات کہی ہے۔

بچّے جیسا پھل نہ [۸۴]ڈٹھا۔ جنا کچا انا مٹھا

کرنل بلمپ اینڈ کمپنی

شام میں کرنل کولسن نے رائل اوورسیز لیگ کلب میں ڈنر پر مدعو کر رکھا تھا۔ جان کولسن ہمارے یار تھے۔ لہٰذا ان کی دعوت کو رد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن یہ سوال کہ دعوت میں پہنچ کر کُچھ سرور بھی آئے گا یا نہیں ضرور پیدا ہوتا تھا کیونکہ رائل اوورسیز لیگ دقیانوسی بلمپوں[۸۵] اور سامراجی لاٹوں کی کلب تھی جو سرِ شام کپڑوں، مونچھوں اور دماغ کو کلف لگا کر اپنی مخصوص نشستوں پر آ بیٹھے تھے اور بدستور اس مغالطے کے تحت کہ سلطنتِ برطانیہ پر سُورج غروب نہیں ہوتا وہسکی سوڈے کے

---

[۸۴] بچّے جیسا پھل نہ دیکھا۔ جتنا کچا اتنا میٹھا۔

[۸۵] COLONEL BLIMP یہ کردار مشہور کارٹونسٹ ڈیوڈ کی تخلیق ہے: بے لچک، قدامت پسند اور خوش فہم کٹ معاملے میں انتہائی غلو کا قائل ہے۔

گلاس خالی کرتے رہتے تھے۔ ان امپیریل غافلوں کے گھڑیال نے ۱۹۴۷ء کے بعد مزید منادی بند کر دی تھی۔ چنانچہ ان سول اور ملٹری آثارِ قدیمہ کی صحبت کوئی بہت سرورآور تقریب دکھائی نہ دیتی تھی۔

کلب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ جان کولسن نے سچ مچ دو تین سخت جان خبطی مدعو کر رکھے ہیں۔ تعارف پر ایک تو سچ مچ ریٹائرڈ کرنل بلمپ ہی نکلے۔ (ساتھی انہیں بِل کے نام سے پکارتے تھے) دُوسرے ایک ریٹائرڈ آئی سی ایس تھے جنہوں نے ایک عمر متحدہ ہندوستان میں گزاری تھی اور تیسرے ایک بوڑھے سے اخبار نویس تھے۔ تینوں لاعلاج قسم کے امپیریلسٹ تھے اور یُوں ہماری خواہشوں اور دُعاؤں کی ضد۔ اور وُہ جنسِ لطیف جس سے تصویرِ کائنات میں رنگ بھرتا ہے، بالکل ناپید تھی۔ گویا خالص بارہ سنگھا[86] پارٹی تھی۔ ہم نے جان کولسن کو اس کا اپنا قول یاد کرایا کہ ''قیدِ تنہائی سے بدتر ایک ہی چیز ہے، بے زن پارٹی۔''۔ تو معافی مانگتے ہوئے بولا:

''قول تو اپنی جگہ درست ہے لیکن آج میری بیوی پارٹی میں شمولیت سے معذور تھی اور میزبانہ کی عدم موجودگی میں دوسروں کو بیویاں لانے کی دعوت دینا خالی از خلل نہ تھا۔''

---

[86] انگریز خالص مردانہ پارٹی کو STAG PARTY کہتے ہیں۔

وجہ معقول تھی ہم نے جان کو معاف کر دیا۔

تعارف کے بعد جان کے ایماپر ویٹر نے مہمانوں سے مشروبات کا آرڈر لیا۔ کرنل بلمپ نے مشین کی طرح "وہسکی اینڈ سوڈا" مانگا۔ دوسروں نے بھی ایضاً کہا۔ ہر طرف سے شراب کی مانگ دیکھ کر ہم نے ذرا جان بوجھ کر کہا:

"لائم جوس پلیز۔"

کرنل بلمپ جھٹ بولے:

"اگر آپ مذاق نہیں کر رہے تو یہ اس شام کی پہلی ٹریجڈی ہے۔"

کہا: "جناب لائم جوس نے کیا قصور کیا ہے؟ اور شراب کی کیا فضیلت ہے؟"

بلمپ ہم سے مخاطب ہو کر ایک بلندی سے بولے:

"مائی ڈیئر کرنل ہر مشروب کا اپنا اپنا مقام اور استعمال ہوتا ہے۔ شراب دیوتاؤں کا مشروب ہے، دودھ بچّوں کا، لائم جوس عورتوں کا اور پانی چوپایوں کا۔"

بلمپ کی بات پر قہقہہ بلند ہونے کو تھا کہ ہم نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر لمبی "شی" کی آواز نکالتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا:

"آہستہ بولیں کرنل صاحب اگر بارمین نے آپ کی بات سُن لی تو آپ کو پانی کے سوا کُچھ نہ دے گا۔"

اس پر ایک بلند قہقہہ گونجا۔ دراصل بلمپ کا جملہ ان بیسیوں ٹوٹکوں میں سے ایک تھا جو اس نے مختلف خراباتی مواقع کے لئے اپنی لمبی شرابی زندگی میں رٹ لئے تھے ورنہ بلمپ کے غبی اور غنودہ چہرے سے ظاہر تھا کہ وُہ کوئی بات سوچ کر کہنے کا اہل نہیں۔ چنانچہ اب ہمارے جواب میں کوئی موثر ٹوٹکا یاد نہ کر سکا تو ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا:

"آل رائٹ تم ایک پلس PLUSONE[۸۷] ہو گئے ہو، تم لائم جوس پی سکتے ہو۔"

اس ابتدائی جھڑپ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ صاحب بہادروں نے ہمیں بھی اسی سطح پر جگہ دے دی جس سے ہمیں ایک لمحہ پہلے ایک قدِ آدم کم سمُجھے تھے اور اب باہمی گفتگو میں کُچھ چہک اور چمک آ گئی۔ بلکہ ایک لمحہ کے لئے جملہ حاضرین کا روئے تمسخر غریب بلمپ کی طرف ہی ہو گیا۔ پرانا آئی سی ایس بولا:

"بل۔ مختلف مشروبات کے متعلق تمہارا فلسفہ تمہاری ذہانت سے ذرا بالا معلُوم ہوتا ہے۔ بتاؤ کہاں سے چرایا ہے؟"

---

[۸۷] تمہارا ایک نمبر زیادہ ہو گیا۔

جواب میں بلمپ نے ہنسی میں کھانسی ملا کر ایک عجیب سی طبلہ نما آواز میں کہا:

"ٹاپ سیکریٹ اولڈ بوائے ٹاپ سیکریٹ[۸۸]۔"

اور وسکی کا ایک بے پناہ گھونٹ پی کر دُوسرے جام کے لئے پکارا اور ساتھ ہی مضمون بدلتے ہوئے بولا:

"بائی دی وے نارمن۔ سُنا تم نے، یہ آئرش لونڈے پھر شرارتیں کرنے لگے ہیں؟ کل پھر دو کانسٹیبلوں کو پیٹ ڈالا۔"

جن حضرت کو نارمن سے خطاب کیا گیا تھا وُہ اخبار نویس تھے۔ وُہ نیا موضوع موافق پا کر بولا۔

"اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے؟ تمہیں معلُوم نہیں کہ ملک پر لیبر حکومت کا سایہ ہے۔"

پرانا آئی سی ایس کہ لیبر پارٹی کا دشمن تھا، بولا:

---

[۸۸] میرے دوست یہ خفیہ بات ہے۔

"اور وزیرِ اعظم کو یہ بھی معلُوم نہیں کہ اس کے پاس ایک شے ہے جسے فوج کہتے ہیں۔ تم وِلسن[۸۹] کو اپنے اخبار کے ذریعے یاد نہیں دِلا سکتے؟"

اخبار نویس بولا: "یاد کرا بھی دیا تو کیا ہو گا؟ ولسن ولسن ہے۔ چر چل نہیں۔"

یہ ان کی جماعتی سیاست تھی اور ہمیں اس میں دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ خاموش بیٹھے تھے کہ اچانک بلمپ نے پنگا لیا اور بولا:

"اور اس باب میں ہمارے پاکستانی دوست کا بھلا کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا: "حضور یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس کے سپاہیوں کو چند لونڈوں نے مارا پیٹا ہے تو ان کے خلاف پوری برٹش آرمی کا استعمال ذرا فضول خرچی نہ ہو گی؟ مکھی سے نمٹنے کے لئے مکھی مار کا استعمال تو درست ہے لیکن انفنٹری بریگیڈ طلب کر لینا ذرا زیادتی ہے۔"

اس پر ایمپائر کے تینوں فدائیوں نے ہمیں متفقّہ غضب سے دیکھا اور ان میں سے ایک نے ہمارے دوست کرنل کولسن سے طنزاً کہا:

"جان، تمہارے پاکستانی مہمان تو ماشاء اللہ سوشلسٹ معلُوم ہوتے ہیں۔ مبارکباد۔"

---

[۸۹] ہیرلڈ ولسن جو ان دنوں مزدور پارٹی کی طرف سے وزیر اعظم تھے۔

جان فوراً ہماری مدد کو پہنچا اور بولا: ”خیر مبارک۔ اگر آپ مکھی کے مقابلے پر بر گیڈ ہی لانا چاہتے ہیں تو خاکسار بھی سوشلسٹ ہے۔“

جان کی تائید ہمیں تو بہت موافق آئی لیکن اس شام کے لئے حقیقی ٹریجڈی ثابت ہوئی۔ ایک لمحے میں پارٹی کی چہک اور چمک ماند پڑ گئی۔ گلاس خالی ہونے کے بعد خالی ہی رہے اور جملہ شرکاء خاموشی سے کھانے کے کمرے کو چل پڑے۔ میز پر بیٹھے تو یُوں لگے جیسے کھانا کھانے کی بجائے پوکر کھیل رہے ہوں۔۔۔ پارٹی کا حشر کسی قدر حسرتناک تھا لیکن ہمارے خدشات سے زیادہ حسرناک نہ تھا۔ سو برداشت کر لیا۔

محمّد نواز اور محمّد اقبال کچن میں خود کفیل نکلے

دوسرے روز مس پارس نے ہمیں وار آفس اور پارلیمنٹ کی طویل مگر غیر دِلچسپ سیر کرائی۔ فارغ ہوئے تو ایک بجے کا عمل تھا۔ ہمارے اندر بھوک نے کروٹ لی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لندن میں کھانا ایک پرابلم ہے، خصوصاً ہم جیسے حساس معدہ اور۔۔۔ اجازت دیں تو۔۔۔ نفیس طبع خاکساروں کے لئے۔ کیا خوش قسمت ہیں وُہ روڈ رولر مزاج لوگ جن کے سامنے کھانے سے ملتی جلتی جو چیز بھی رکھ دی جائے اس اصول کے تحت چٹ کر جاتے ہیں کہ ”ہر چہ آید پیش مرداں نام گل بھا گال بھریست“ لیکن ہمارے مسلک میں بھا گاں بھری صرف وُہ جنسِ لطیف ہے جو رنگ میں عناب ہو،

بو میں گلاب ہو، ذائقے میں کباب ہو اور نشے میں شراب ہو۔ لندن کے انگریزی ریستورانوں میں یہ جنس ناپید تھی۔۔۔ لندن میں اچھے کھانے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ کسی ایسے پاکستانی دوست کے گھر کا سراغ لگایا جائے جو ساتھ دیسی بیوی یا بیوی سے مشابہ شے رکھتا ہو مگر ایک بیوی یا شے جو مینٹل پیس قسم کی بیگم نہ ہو۔ یعنی آئینے کے علاوہ چولہے کے سامنے بھی کھڑی ہو سکتی ہو اور شینل فائیو ۵ کے علاوہ پیاز اور لہسن کا سامنا بھی کر سکتی ہو۔ ویسے لندن میں بیگموں کو بھی آخر کار بیوی بنناہی پڑتا ہے کہ وہاں خاوند کے علاوہ نوکر بھی رکھا جائے تو تنخواہ اور نخرے کے لحاظ سے دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو صاحب اور بیگمیں وطن سے دیسی نوکر ساتھ لے جاتے ہیں۔ وُہ بھی بہت زیادہ عرصہ ان کی خدمات سے مستفید نہیں ہو سکتے کہ پاکستانی نوکر بھی زود یا بدیر انگریزی خربوزوں کو دیکھ کر انگریزی رنگ پکڑ لیتے ہیں اور کیوں نہ پکڑیں؟ خود صاحب اور بیگم کہاں کا پیدائشی رنگ رکھتے ہیں؟ چند سال پہلے یہ بھی بے رنگ ہی تھے۔ انہوں نے بھی دُوسرے خربوزوں ہی سے رنگ اخذ کیا ہے۔۔۔ خیر یہ ایک اور جملہ معترضہ ہے۔۔۔ سوال ہمارے سامنے کسی بیوی دار دوست کا تھا۔ ایک دو دوست ذہن میں آئے لیکن اگر دوست موافق تھا تو بھابھی ناموافق تھی اور وائسی ورسا[۹۰]۔

---

[۹۰] VICE VERSA لاطینی کی معروف ترکیب جس کے معنی ہیں: اس کا الٹ بھی درست ہے۔

آخر قرعہ دو ایسے یکجا رہنے والے دوستوں کے نام نِکلا جن کے پاس دوستی تو بے حساب تھی، بیوی ایک بھی نہ تھی۔ ہر چند کہ بوجوہ وُہ بیویوں کی کمی کے بجا طور پر حسرت سنج تھے تاہم چھ سال کی چمچہ رانی نے انہیں کچن میں خود کفیل کر دیا تھا۔ یہ تھے محمّد نواز اور محمّد اقبال۔ ہم نے انہیں فون پر اپنی آمد اور نیّت سے خبر دار کیا اور بیکر لو کی گاڑی میں ولسڈن گرین کا ٹکٹ لے کر بیٹھ گئے۔ جب بالآخر ان کے فلیٹ پر پہنچے تو ناگہاں دیارِ غیر میں وطنِ عزیز کے طعام خانوں کی مانوس خوشبوں کا جھونکا آیا۔ محمّد نواز ایپرن پہنے مرغ بھون رہے تھے اور محمّد اقبال نہایت چابکدستی سے پلاؤ دم کر رہے تھے اور کبابوں کی پلیٹ پہلے ہی سے سج کر ایک شیشے کے ڈھکنے کے نیچے بیٹھی تھی، جیسے دلہن کی کوئی سہیلی پیش از وقت ہی بن ٹھن کر نکلی ہو۔ اب اس تفصیل میں جانا لاحاصل ہے کہ کس مزے سے ہم نے اس مغلئی مرغ اس پادشاہی پلاؤ اور ان کو کلتاش کبابوں کو ٹھکانے لگایا۔ پھر کس نشے میں چور ہو کر بے سدھ لیٹ گئے اور آخر کس سکون سے ایک مدّت کے بعد جاگ کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو دیکھا کہ "تاروں بھری رات ہے پر تو نہیں۔" چنانچہ اُٹھے اور "تو" کی تلاش میں نکل پڑے۔

پاکستان ہائی کمشن: ایک پرانی یاد

مسافروں کو ممالکِ غیر میں اپنا سفارت خانہ اپنے وطن کا ٹکڑا محسوس ہوتا ہے اور سفیر اور دیگر اہلکار جگر کے ٹکڑے لگتے ہیں۔ گویا سفارتخانے کی دہلیز کے اندر قدم رکھا اور اپنے گھر میں داخل ہو گئے اور لختِ ہائے جگر سے مل کر اپنے جگر کو ٹھنڈک پہنچائی۔ لیکن بد قسمتی سے لندن کے پاکستانی سفارتخانے[۹۱] کی تاخیر ذرا مختلف رہی ہے۔ پاکستانیوں کے لئے اس غیر ملک میں اگر کوئی غیر تر مقام ہے تو وُہ پاکستانی ہائی کمشن ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں اس دورے میں ابھی تک اپنے ہائی کمیشن سے کام نہ پڑا تھا لیکن دس برس پیشتر جب ہمیں کام پڑا تھا تو ہمارا تجربہ دُوسرے ہموطنوں سے مختلف نہ تھا۔ ان دنوں پہلی دفعہ اپنے ہائی کمیشن کے دروازے پر پہنچے تو دو پاکستانی فٹ پاتھ پر بیٹھے روتے پائے۔ معلُوم ہوا کہ کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے اور اب سڑک پر بیٹھے دربان کے حسنِ سلوک اور کسی اندرونی صاحب بہادر کی فرض شناسی کو دُعا دے رہے ہیں۔ ہماری فوجی یونیفارم کے احترام میں ہمیں دہلیز عبور کرنے کی اجازت تو مل گئی لیکن جب اندر جا کر ایک چھوٹے صاحب سے عرض مدُعا کیا تو موصوف اس طرح پیش آئے جیسے ہم کسی بلوے میں پکڑے ہوئے آئے ہوں۔۔۔ دراصل ہمارا مدُعا صرف یہ

---

[۹۱] ان دنوں ہائی کمشن کہلاتا تھا۔

تھا کہ اگر ہمارے نام کی جی ایچ کیو پاکستان سے کوئی چٹھی آئی ہو تو ہمیں عنایت کر دی جائے یا ہمارے ہوٹل کے پتّے پر ہمیں بھیج دی جایا کرے۔۔۔ بہر حال چھوٹے صاحب کے دفتر سے جاں بخشی کے بعد نکلے تو اتفاقاً بڑے صاحب کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے باہم نظریں لڑ گئیں۔ پرانی فوجی روشنائی تھی۔ مروّت میں آ کر رُک گئے اور سلام کی خاطر ان کے کمرے کے اندر قدم رکھ دیا لیکن قدم رکھنا تھا کہ صاحب بہادر کے چہرے پر آناً فاناً قبض طاری ہو گی اور پیشتر اس کے کہ ہم سلام عرض کر سکتے۔ ارشاد ہوا:

''تمہارے آنے کی سرکاری اطلاع ہمیں نہیں ملی۔ لہٰذا ہم تمہیں انگلستان میں لُک آفٹر[۹۲] نہیں کر سکتے۔''

سبحان اللہ۔ حسنِ اخلاق کا کیا برجستہ اور ایمان افروز مظاہرہ تھا! ہم دہلیز کے پاس ہی رُک گئے۔ انہیں علم نہ تھا کہ ہم کسی اور کے مہمان ہو کر لندن میں آئے ہوئے ہیں اور صاحب بہادر کی دستگیری کے محتاج نہیں بلکہ پورے تین ماہ سے کُچھ ایسے دِلربا قسم کے میزبانوں کے ہاتھوں لُک آفٹر ہو رہے ہیں کہ صاحب بہادر جیسے کرم فرماؤں کی نظر

---

[۹۲] LOOK AFTER خبر گیری کرنا خیال رکھنا۔

سے ہمیں خسرہ نکلنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ بڑے صاحب کی بدتمیزی معاف کرتے ہوئے اور اپنا سلام دُعا میں بدلتے ہوئے دروازے سے کھڑے کھڑے کہا:

"حضور کا اقبال سلامت۔ دو پاکستانی آپ کی عنایت سے باہر فٹ پاتھ پر لُک آفٹر کیئے جا رہے ہیں۔ بندہ محروم بھی رہا تو کوئی بات نہیں۔"

الغرض یُوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی پاکستانی کا لندن کی فضا میں سانس لینا بھی خداوندانِ ہائی کمشن پر گراں ہے جیسے ہر پاکستانی سانس لیتے وقت ان کے حِصّے کی آکسیجن کھینچ رہا ہو۔

پاکستانی ہائی کمشن: ایک نیا تجربہ

اس پس منظر کے ساتھ آج دس سال بعد ہمارا پھر ہائی کمیشن جانا یُوں تو خارج از بحث تھا لیکن سخنِ گسترانہ بات اس مقطع میں آپڑی کہ لندن سے چند اشیا خرید کر پاکستان لے جانے کے لئے ہائی کمشن کی اجازت لازم تھی۔ چنانچہ انتہائی ہچکچاہٹ کے بعد فیصلہ کیا کہ چلو ملٹری ایڈوائزر سے بات کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس دفعہ کوئی معقول آدمی ہو۔ فون کیا تو ادھر سے جواب آیا۔

"بریگیڈیر حسن ہیر۔"

نام سنا تو خیال آیا کہ ان سے تو پنڈی میں مختصر سی ملاقات ہو چکی ہے اور یہ کہ آدمی شریف ہیں لیکن کیا معلُوم ہائی کمشن کی کرسی نے ان پر کیا اثر کیا ہو۔ عام حالات میں یہ بڑی قابض شے ہے۔ بہر حال عرض کیا۔

"السلام علیکم جناب۔ میرا نام محمّد خان ہے۔ کرنل محمّد خان۔"

اور جواب میں یہ سُننے کے لئے تیار ہو بیٹھا کہ یُوں ٹیلی فون پر ٹپک پڑنے والوں کو ہم لُک آفٹر نہیں کیا کرتے۔ لیکن حیرتوں کی حیرت! جواب آیا اور اشتیاق میں ڈوبا ہوا جواب۔

"وعلیکم السلام کرنل صاحب۔ کیا خوشگوار سرپرائز ہے؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

پتہ چلا کہ ابھی کُچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ عرض کیا:

"جناب میں لندن ہی سے بول رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے بڑی نیکی کوئی نہ ہو گی۔ لہٰذا دیر نہ کیجئے۔"

ہم نے دیر نہ کی۔۔۔ بریگیڈر حسن سے مل کر ہماری خوشی میں ایک نئی خوشی شامل ہو گئی کہ یہ پُر لطف ملاقات ہائی کمیشن کے اسی کمرے میں ہو رہی تھی جہاں سے دس سال قبل ہم دہلیز ہی سے لوٹ آئے تھے۔ کہاں وُہ بے سبب دِلآزاری اور کہاں یہ

بے حساب دلنوازی!۔۔۔ خواتین و حضرات اس مقام پر آپ کے لئے بھی ایک پیغام ہے اور وُہ یہ کہ خوش رہیے اور خوش کلامی کیا کیجئے کہ یہی اسمِ اعظم ہے۔ خواجہ حافظ نے بھی آسائش دوگیتی کے لئے یہی مشورہ دیا ہے۔ اور وُہ جو ایک جگہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ "جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا" تو وُہ محض معشوقوں کے لئے شاعرانہ رعایت ہے اور ایسے شیریں لب حسین خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ اگر ان چیدہ شیریں لبوں میں سے کوئی یہ سطور پڑھ رہے ہوں تو ان سے بھی التماس ہے کہ ذرا میٹھا جواب دے کر دیکھیں تو انہیں اور زیب دے گا۔۔ باتوں باتوں میں ہم بیگیڈیر حسن سے دور آن نکلے ہیں۔ بہر حال بریگیڈیر صاحب سے باتیں شروع ہوئیں تو ہم اتنے ہی قریب آ گئے کیونکہ ان کی ہر ادا میں کشش تھی اور جہاں کشش ہو وہاں فاصلے مِٹ جاتے ہیں۔ اس پر لطف ملاقات کے انجام پر رخصت ہونے لگے تو بریگیڈیر صاحب بولے:

"ہمارے ہائی کمیشن کے بڑے صاحب وطن لوٹ رہے ہیں۔ اگلے ہفتے ان کے اعزاز میں دعوت دے رہا ہوں۔ شامل ہو سکو گے ؟"

عرض کیا: "اگر مس پارس سدِ راہ نہ ہوئی تو یقیناً۔"

اور مس پارس کے سدِ راہ ہونے کا ڈر اس لئے تھا کہ اگلے ہفتے وُہ ہمیں سکاٹ لینڈ بھیجنے کے منصوبے بنا رہی تھی یا ایک پرانے منصوبے کی تجدید کر رہی تھی۔ لیکن تاریخ کا تعین ابھی نہیں ہوا تھا۔ وُہیں سے مس پارس سے بذریعہ فون رجوع کیا تو بولی:

”سکاٹ لینڈ اس ہفتے بھی اتنا ہی دِلکش ہے جتنا اگلے ہفتے ہو گا۔ آپ اسی ہفتے ہو آئیں یعنی کل نہیں تو پرسوں اور اگلے ہفتے چھٹی منائیں۔ لیکن واپسی پر یہ بتانا نہ بھولیں کہ سکاٹ لینڈ کے ہاتھوں آپ کے دِل پر کیا گزری۔“

ہم نے مس پارس سے وعدہ کیا اور دُعا دی اور بریگیڈیر صاحب کی دعوت قبول کر لی۔

ہم تاریخ میں دُوسرے نمبر پر آ گئے

جس دن ہم سکاٹ لینڈ پہنچے وُہ بڑا اہم دن ثابت ہوا۔ کیونکہ اس دن کو ہم نے اور نیل آرمسٹرانگ نے مل کر تاریخ میں جگہ دے دی۔ یعنی تقریباً اسی وقت جب نیل آرمسٹرانگ چاند کی سطح پر پہلا قدم رکھ رہا تھا۔ ہم نے ایڈنبرا اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ انفرادی طور پر تو آرمسٹرانگ اور ہمارے قدموں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ہم دونوں کو اپنی اپنی گاڑیوں سے نکل کر لامحالہ کہیں نہ کہیں قدم رکھنا ہی تھا لیکن لوگوں نے تقریباً بالاتفاق آرمسٹرانگ کے قدم کو ہمارے قدم سے ذرا زیادہ تاریخی

قرار دیا۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس کا سفر ہماری نسبت ذرا زیادہ عمودی تھا۔ اور وُہ کُچھ زیادہ فاصلہ طے کر کے ذرا زیادہ تیز رفتار سے ایک غیر مانوس دُنیا میں جا پہنچا تھا۔ ویسے ہم بھی ایڈنبرا سے ایسے مانوس تو نہ تھے لیکن شاید ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم منزلِ مقصود پر پہنچ کر خاموش رہے اور آر مسٹر انگ کی طرح قدم رکھتے ہی ڈینگ نہ ماری کہ ایک آدمی کے لئے تو یہ چھوٹا سا قدم ہے مگر نسلِ انسانی کے لئے فلک رس چھلانگ ہے۔ چنانچہ دُنیا نے اس کی باتوں میں آکر تالیاں بجانا شروع کر دیں اور ہماری باوقار خاموشی کا چنداں نوٹس نہ لیا۔ ہم بھی کسی لکھے پڑھے آدمی یا کسی بھرے ہوئے شاعر سے کوئی چبھتی سی ڈینگ لکھوا کر ساتھ لے جاتے اور پلیٹ فارم پر پاؤں رکھے ہی دہرا دیتے تو شاید ہمارے الفاظ کو بھی بی بی سی نے اُڑتی۔ بہر حال ایسا نہ ہوا اور تاریخ میں ہم دُوسرے نمبر پر آ گئے، مگر ہمارے میز بانوں نے ہم سے پہلے نمبر ہی کا سلوک کیا یعنی ہمیں جھلمل کرتی کار میں بٹھا کر ایک اوّل درجے کے ہوٹل میں لے گئے۔ بے چارے آر مسٹر انگ کو تو جیپ بھی میسّر نہ آ سکی۔ غریب پیدل ہی پتھر چُنتا اور خاک چھانتا رہا۔

ہوٹل میں داخل ہونے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے دروازے پر ایڈمرل اے۔ آر۔ خان کھڑے ہیں۔۔۔ ہمارے پرانے مہربان تھے۔ ہم نے مؤدبانہ کہا۔

"ہیلو سر۔۔۔ آپ یہاں کیسے؟"

لیکن ادھر سے جواب آیا:

"ہیلو گورنر، لائیے، میں آپ کا سامان اندر پہنچا دوں۔"

"سامان؟" ہم نے زیرِ لب کہا اور سوچا: "یہ ایڈمرل خان نہیں ہو سکتے۔"

اور ہم نے بڑے زور سے آنکھیں ملیں اور دوبارہ نظر جما کر دیکھا تو معلُوم ہوا کہ ہوٹل کا دربان ہے مگر بے عیب سفید یونیفارم، پُر رعب قد و قامت اور باوقار چہرہ جو ایڈمرل صاحب سے اس قدر مشابہ تھا کہ یہ جاننے کے بعد بھی کہ دربان ہے اس سے سامان اُٹھوانا بے ادبی معلُوم ہوا۔ بہر حال ہم نے اپنی غلطی کا ہی مذاق بناتے ہوئے اسے کہا۔

"ایڈمرل۔ کسی ماتحت کو حکم دے دو ہمارا سامان لے جائے گا۔"

بولا: "آئی آئی سر۔"

یہ ہمارے مذاق کا نیول جواب تھا۔ آدمی خوش مذاق تھا۔

عورت کا آخری داؤ

ایڈنبرا میں ہمارے رہنما لفٹیننٹ کرنل شپرڈ تھے۔ فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے لیکن اب دوبارہ بطور سویلین بھرتی ہو کر متفرق فنّی بیگاریں انجام دیتے تھے۔ مثلاً ہم جیسے

مہمانوں کا استقبال کرنا، دوسروں سے ملانا، کھلانا، پلانا، ہنسانا، گھمانا، الغرض انگریزی لفظوں میں لُک آفٹر کرنا۔ لیکن کرنل شپرڈ اپنی رنگا رنگ شخصیت سے بیگار کو بھی بہار بنا دیتے تھے۔ ہمارے لئے اور دِلچسپ ثابت ہوئے کہ ایک عمر غیر منقسم ہندوستان، خصوصاً پنجاب اور سرحد میں گزار چکے تھے۔ اُردُو خاصی بولتے تھے مگر ذرا بھاری بھر کم سی۔ کہتے تھے پنجابیوں اور پٹھانوں کے ساتھ استعمال کرنے سے ذرا پتھریلی ہو گئی ہے۔ عمر کے لحاظ سے تو اب جوانی کو پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن باتیں بدستور رنگین مزاجوں کی سی کرتے تھے۔ ہمیں مختلف مقامات و شخصیات تک لے جانے لگے تو کار میں بیٹھتے ہی بولے:

”کرنل خان' آپ غلط وقت پر ایڈنبرا آئے ہیں۔ لیکن کوئی ایک مہینہ قبل از وقت۔“

کہا: ”ایک مہینہ بعد کوئی نعمت تقسیم ہونے والی ہے؟ ہم پھر بھی آسکتے ہیں۔“

بولے: ”ضرور آیئے۔ اگلے ماہ ایڈنبرا میوزک فیسٹیول[۹۳] شروع ہو رہا ہے۔ بڑی غضب کی رقاصائیں آئیں گی۔“

---

[۹۳] ایڈنبرا میں ہر سال اگست کے مہینے میں رقص و موسیقی کا بین الاقوامی میلہ لگتا ہے

”وُہ تو ہم نے لندن میں بھی دیکھیں ہیں۔ یہاں کی رقاصائیں کُچھ زیادہ غضب کی ہوتی ہیں؟“

”رقص کے اعتبار سے تو نہیں، لیکن لباس کے لحاظ سے یقیناً۔“

”کون سا لباس پہنتی ہیں؟“

”کوئی سا لباس نہیں پہنتیں۔“

”تو یہی ہے وُہ نعمت جس کی آپ بشارت دے رہے ہیں؟“

”بے شک۔“

یہ کہہ کر کرنل شپرڈ ہمیں دار طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں کُچھ عرصہ رہنے کے بعد عریانی وُہ جنس نہیں رہی جسے دیکھ کر آدمی بے قابو ہو جائے۔ بلکہ حیرت تھی کہ کرنل شپرڈ ایک ایسے واقعہ کے تصوّر سے جو ایک ماہ بعد ہونے والا تھا جوانی کو اس زور سے آواز دینے لگے تھے۔ ان کا طویل رنڈوا پن بھی اتنی پیشگی چیخ پکار کا کافی جواز نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے کرنل صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور تھپتھپاتے ہوئے کہا:

”میرے دوست۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔“

بولا: ”ہمدردی کا شکریہ۔ لیکن وُہ رقاصائیں ظالم ہیں ہی بڑی صبر آزما۔“

”مُجھے آپ سے بھی زیادہ ان رقاصاؤں سے ہمدردی ہے۔“

”ارے تمہارا دِل ان ایمان شکنوں کے لئے بھی گداز ہونے لگا؟ بھلا کیوں؟“

”اس لئے کہ بے چاریاں زندگی کی دوڑ میں کپڑوں سمیت ناکام رہ گئیں تو کپڑے اتار کر دوڑنے لگیں۔“

”ارے میاں یہ کپڑے اتارنا نہیں، مجبوس جسم کو آزاد کرنا ہے۔ تم آزاد حسن کو ناکام کہتے ہو؟ حیف!“

ہم نے بھی ذرا فلاسفی جھاڑی اور کہا:

”کرنل، تمہارے اندر ایک حریص مرد بول رہا ہے ورنہ عریانی نسوانی حسن کا آخری داؤ ہے۔ جس عورت نے اپنے حسن کی نمائش کے لئے برہنگی کا سہارا لیا، اس نے گویا اپنا آخری داؤ لگا دیا۔“

بولا: ”ارے میں بھول رہا تھا۔ تم تو برقع فلاسفی کے قائل ہو۔“

”نہیں جناب۔ برقع ہم بھی ترک کر چکے ہیں۔ ہم شلوار قمیص فلاسفی کے قائل ہیں۔ خدا ہر دو کو استقامت بخشے۔“

”بڑی دِل سے دُعا نکل رہی ہے۔“

”اس لئے کہ ہماری شلوار اور قمیص بھی کُچھ دنوں سے مائل اختصار سی ہیں۔“

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا

اتنے میں کار ایک عمارت کے سامنے رُکی جس کی پیشانی پر لکھا تھا: ”سکاٹش کمانڈ لائبریری۔“ یہ ہماری سیر و تماشا کی پہلی منزل تھی۔ اندر گئے تو دفتر میں ایک ادھیڑ عمر کی ایک معتبر صورت خاتُون بیٹھی تھی جو لائبریرین لگتی تھی اور تھی۔ شپرڈ نے ہمارا تعارف کرایا تو محترمہ نے ہمیں پاکستانی پاکر قدرے فالتو شفقت سے خیریتِ مزاج پوچھی اور پھر بِلا تاخیر وجۂ شفقت بھی بیان فرمادی۔ یعنی یہ کہ آپ ایک پاکستانی داماد کی خوشدامن تھیں۔ لہٰذا ہم سے ایک رشتہ، ایک نسبت محسوس کرتی تھیں اور جواباً ہم نے بھی رشتہ داری کا اقرار اور اظہار کیا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک نوجوان سکاچ لڑکی قمیص شلوار پہنے مسکراتی مسکراتی کمرے میں داخل ہوئی۔ یہی محترمہ کی بیٹی یا ہمارے ان دیکھے پاکستانی بھائی کی بیوی تھی لیکن اب سخن گسترانہ بات صاجزادی کا پاکستانی بہو ہونا نہ تھا بلکہ پاکستانی قمیص شلوار میں ملبوس ہونا۔ ہم نے فوراً شپرڈ کو پورے فخر کے ساتھ اپنی خواتین کا قومی لباس دکھایا۔ لڑکی نے لباس کی تعریف کو اپنی بھی سمجھا تو خوشی میں اُٹھ کر پیشانی کی لٹ جھکا کر فیشن پریڈ کی ادا کے ساتھ تعریف کو اپنے گرد

چکر لگا کر دکھایا۔ گویا کہتی ہو۔۔۔ ”اب دیکھو۔“ پھر اسی موڈ میں دِلہنوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر نگاہیں پہلے نیچی کرتے ہوئے اور پھر ذرا اُوپر اُٹھا کر حاضرین کو دکھایا جیسے کہتی ہو: ”یہ بھی دیکھو۔“۔۔ اس کے چہرے پر لٹوں کی بہار بھی دیدنی تھی لیکن جب اس نے شفون کا دوپٹہ اوڑھ کر گھونگھٹ کا کونہ کھینچا تو غالب گواہ کہ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا۔۔۔ شپرڈ کے لئے یہ مشرقی ادائیں جتنی اجنبی تھیں، اتنی ہی دِلکش تھیں۔۔۔ مسحور سا ہو گیا اور اپنی ننگی رقاصاؤں کو دفعتاً بھول کر چلا اُٹھا: ”بیوٹی فل۔“۔۔ ہمیں تسلّی ہوئی کہ پاکستانی قمیص شلوار اور دوپٹے کے متعلق ہمارا حسنِ ظن بجا تھا۔

کاش کارنیگی پاکستان سے بھاگا ہوتا

دلہن کے بعد ہم نے لائبریری دیکھی لیکن لائبریری میں وُہ بات نہ پائی جو دِلہن کے بانکپن میں پائی جاتی تھی۔ بلکہ یہ برطانیہ کی پہلی لائبریری تھی جس کی حالت ذرا دُبلی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ وطنِ عزیز کی لائبریریاں کسی ایک برطانوی لائبریری کا مقابلہ تو کر سکتی ہیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے لئے ہم بھی سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے۔ مگر بہت تھوڑی دیر کے لئے کیونکہ ہماری اگلی منزل ایک ایسا بے مثل کتاب خانہ تھا جس کے سامنے یا جس کے خالق کے سامنے چار و ناچار سر تسلیمِ خم کرنا

پڑتا تھا۔ یہ تھی سنٹرل لائبریری اور اس کا بانی تھا اینڈریو کارنیگی۔ وُہ دریا دِل منعم جو لڑکپن میں ایڈنبرا سے بھاگ کر امریکہ میں کروڑپتی جا بنا تو اپنے بچپن کے شہر کو علم و دانش کا یہ انمول تحفہ پیش کیا۔ ہمارے دِل میں پھر وُہی حسرت بیدار ہوئی کہ کاش یہ شخص پاکستان سے بھاگ کر گیا ہوتا۔ گو وطن کو لائبریری کا تحفہ دینے کے لئے لازم نہیں کہ ایک دفعہ وطن سے ضرور بھاگا جائے۔ ملک کے اندر کمائے ہوئے کروڑوں سے بھی اتنی ہی خوبصورت لائبریری بن سکتی ہے جیسی کارنیگی نے بنائی تھی۔ بہر حال ہم نے کارنیگی کی مثال دے کر اس کارِ خیر کے لئے اشتعال تو دلا دیا ہے۔ اب مشتعل ہونا کسی پاکستانی کروڑپتی کا کام ہے۔

سر، آپ کا عصمت کی حفاظت کا انتظام کمزور ہے

لنچ کا وقت ہوا تو شپرڈ ہمیں سکاٹش کمانڈ کے میس میں لے گیا جو بھوکے باتونی افسروں سے بھرا پڑا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے میں مزا ہے تو ان کے کھانے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی برجستہ باتوں اور پوستہ گپوں کی وجہ سے۔ ہمارے فوجی میس کھانے کے لحاظ سے انگریزی میسوں سے بلاشبہ بہتر ہوتے ہیں لیکن جو کاری، کراری، مردانہ، بے باکانہ، بے دریغ، بھرپُور ٹیبل ٹاک انگریزی میسوں کا خاصہ ہے، ہمارے میسوں میں کم سُنائی دیتی ہے۔ ایک تو ہمارے میسوں میں فقط سینئر بولتا ہے، باقی صرف سُنتے

ہیں اور آخر میں یس سر کہہ دیتے ہیں یا اس کے ہزار بار سنے ہوئے لطیفوں پر جی کڑا کر کے کھو کھلی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ اگر سینئر کم ذوق یا ڈل ہو تو مجلسِ عزّا کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے بر عکس برطانوی افسر ایک دفعہ میس میں آ جائیں تو نہ کوئی بندہ رہتا ہے نہ کوئی بندہ نواز۔ بڑے بہت بڑے نہیں بنتے اور چھوٹے بہت چھوٹے نہیں رہتے۔ جونیر بولتا ہی نہیں، موقع پا کر چوٹ بھی کرتا ہے جسے سینئر خندہ پیشانی سے سُنتا اور سہتا ہے۔ لیکن دیسی اور برطانوی میسوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارے میسوں میں تند ترین مشروب لیمن سکواش یا کوکا کولا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے مشروب تزکیہ نفس میں ممد ہوں تو ہوں، محفل کو گرمانے اور رنگ پر لانے کی خاصیت ان میں نہیں پائی جاتی۔ ادھر برٹش میسوں میں اس شے کی فراوانی ہے جو ہمارے ہاں فقط شعروں میں ملتی ہے اور زبانی زبانی پی جاتی ہے۔ شے بے شک حرام ہے لیکن رونقِ بزم مَے نوشوں ہی سے ہے۔ یُوں نہ ہوتا تو غالب۔۔۔ جو کسی برطانوی میس کے ممبر بھی نہ تھے۔۔۔ کبھی نہ کہتے کہ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

ہم اینٹی روم میں داخل ہوئے تو افسروں میں کسی مسئلے پر بڑی پُرجوش بحث ہو رہی تھی۔ کُچھ سُننے اور سمجھنے کے بعد پتہ چلا کہ موضوع برلن وال BERLIN WALL ہے۔ یہ وُہ بدنام دیوار نہ تھی جو مشرق اور مغربی برلن کے درمیان روسیوں نے بنائی ہے بلکہ ایک مقامی دیوار تھی جو افسروں کے کوارٹروں اور قریب کی شہری آبادی کے

درمیان اس غرض سے کھڑی کی گئی تھی کہ شہری علاقے میں کُچھ سُرخ روشنی کے دھبے نظر آتے تھے جو اعلیٰ کمان کی نظر میں افسروں کی اخلاقی صحت کے لئے فائدہ بخش نہ تھے۔ لیکن اب جونیئر افسر اور خصوصاً کنوارے افسر ہائی کمان کے اس ظلم پر احتجاج کر رہے تھے کہ یہ اقدام بنیادی انسانی حقوق کے منافی ہے اور یہ تعمیر ان کی ذاتی تفریح میں سدِّ راہ ہے۔ اسی بیزاری کی شدت کے اظہار کے لئے ان لوگوں نے اسے۔۔۔ بدنام تر معنوں میں۔۔۔ برلن وال کا نام دیا تھا۔ جونیئر افسروں کا واویلا سن کر ایک بریگیڈیر صاحب جو حاضرین میں سب سے سینئر تھے بولے:

"یہ دیوار ضروری ہے۔ یہ شادی شدہ افسروں کی خانگی مسرّت اور کنوارے افسروں کی اخلاقی عصمت کی حفاظت کی ضامن ہے۔"

ایک نوجوان کیپٹن بولا: "معاف کیجئے گا سر اگر مقصد وُہی ہے جو آپ نے بیان فرمایا ہے تو آپ نے بیاہتا مسرّت اور بن بیاہتا عصمت کی حفاظت کا نہایت کمزور انتظام کیا ہے۔"

بریگیڈیر صاحب کی قدر حیرت سے بولے: ''تمہارا مطلب ہے کہ پندرہ فٹ اونچی دیوار پھاندی جا سکتی ہے؟ ناممکن۔۔۔ اگر کوئی افسر اس پر چڑھ کر دُوسری طرف سالم اُتر جائے تو میں اس کے لئے ملٹری کراس [94] کی سفارش کر سکتا ہوں۔''

اس پر ایک نوجوان سا میجر بولا: ''سر اگر یہ بات ہے تو کیپٹن گارڈنر کل رات سے ایم ٹی ایڈ بار [95] کے لئے کوالیفائی کر چکا ہے۔ یہ بہادر افسر نہ صرف دیوار پھاند کر اس طرف گیا بلکہ دوبارہ پھاند کر اس طرف بھی آیا اور سالم۔ دیکھیں وُہ بیٹھا ہے۔''

اس پر جملہ حاضرین نے کیپٹن گارڈنر کی طرف دیکھا۔ کیپٹن گارڈنر ایک خوش شکل اور خوش وضع کنوارا افسر تھا۔ اپنی نشست پر سے اُٹھا اور جھک کر بریگیڈر صاحب سے بولا:

''اور آپ کی نوازش کا شکریہ۔ لیکن میرے لئے ملٹری کراس قبول کرنا شاید مناسب نہ ہو گا۔ میری حقیر کوشش کا ثمرہ مُجھے مل چکا ہے۔''

اس پر جو قہقہہ بلند ہوا اس کی گونج بیشتر بریگیڈیر صاحب کے گلے کی مرہونِ منت تھی۔ جب قہقہہ تھما تو بریگیڈیر صاحب نے ازراہِ مذاق کہا:

---

[94] یعنی M.C. یہ برطانوی فوجی اعزاز ہمارے ستارہ جرأت کے برابر ہے۔

[95] ایم سی کا اعزاز دوبارہ ملنا۔

"جنٹلمین۔۔۔ آیئے، اس معاملے میں ہم اپنے پاکستانی مہمان کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔"

پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولے:

"کرنل خان بتایئے کیارائے ہے آپ کی؟ دیوار رہے یا گرائی جائے؟"

اب ایک ایسی محفل میں جہاں کنواروں یعنی دیوار شکنوں کی اکثریت تھی، یُوں بھی ہمارا قیامِ دیوار کی حمایت کرنا عقلمندی نہ تھا۔ لیکن مُڑ کر دیکھا تو غالب بھی سرگوشی کر رہے تھے:

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب؟

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضااور سہی

چچا کا اشارہ پا کر ہم نے بے محابا انہدامِ دیوار کے حق میں ووٹ دیا اور ڈٹ کر اعلان کیا:
"DEMOLISH TT (گِرادو!)۔"

اس پر کنواروں نے اس زور سے نعرہ بلند کیا جیسے دیوار گرانے کے لئے ڈائنامائٹ پھٹ گیا ہو۔

قلعہ ایڈنبرا کی تین منزلیں

پچھلے پہر شپرڈ نے ہمیں پرنسس سٹریٹ اور ایڈنبرا کاسل یعنی قلعے کی سیر کرائی۔ اس سیر کی ابتدا اتہ خانوں، قید خانوں، بلکہ عذاب خانوں سے ہوئی اور معلُوم ہوا کہ تاریخ کے مختلف اوقات پر ان برگزیدہ مقامات کے مکین کُچھ بادشاہ تھے، کُچھ ملکائیں اور کُچھ مختلف قدو قامت کے رؤسا۔۔۔ عوام اس عزّت سے محروم تھے کہ ان سے قلعۂ معلے کے باہر ہی نالیوں، بدروؤں اور تاریک راہوں میں یہی سلوک کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ ذرا بلندی پر گئے تو عجائب خانے اور صنم خانے تھے جن میں قلعہ کے پرانے ساکنین کے تبرکات اور مجسمے رکھے تھے۔ ان کی سیر سے فارغ ہوئے تو اور زیادہ بلندی پر انہی بادشاہوں کے عشرت کدے اور نعمت کدے تھے جہاں عذاب خانوں میں منتقل ہونے سے پہلے یہ لوگ رہا کرتے تھے۔ ہر دو قسم کے خانوں اور کدوں کو دیکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ قلعۂ معلے کی بجائے چک لالہ کے درمیانہ درجے کے غریب خانے میں بلاخوف بے دخلی رہنا کس قدر سکون بخش ہے۔ پھر عشرت کدوں سے بھی اور ایک فلک بوس عبارت کدہ تھا۔ اس کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ اسکی چھت پر کھڑے ہو کر ہاتھ اُٹھاتے اور اُوپر سے اتنا ہی ہاتھ معبود بھی آگے بڑھاتا۔۔۔ اور کُچھ نیکی بھی پلے ہوتی۔۔۔ تو معبود سے ہاتھ ملا سکتے تھے۔ لیکن سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس قدر

تھک چکے تھے کہ ہاتھ اُٹھانا تو درکنار، آنکھ اُٹھانا بھی دوبھر تھا اور ہمارا نیکی کا ریکارڈ بھی ایسا واضح نہ تھا۔ چنانچہ ہاتھ اُٹھانے کی جسارت کی نہ آنکھ اُٹھانے کی۔ اور کرتے بھی تو ہمارے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہ ہوتا جو اس سے پیشتر ہم سے ایک زیادہ معتبر شخص کے ساتھ طور پر ہو چکا تھا۔

پرنس کریم آغا خان اسماعیلیوں کے محلے میں

سیر سے فارغ ہو کر ہوٹل پہنچے تو کچھ آرام کیا کہ رات ایک اور طاقت ربا تقریب انتظار کر رہی تھی یعنی ایڈنبرا یونیورسٹی میں ڈنر اور ڈانس پارٹی۔ اہلِ جامعہ یہ تکلّف ہماری خاطر نہیں بلکہ حسبِ معمول اپنے طلبا اور طالبات کی خاطر کر رہے تھے۔ وُہ تو اتفاق تھا کہ ہم بھی شہر میں موجود تھے اور پردیسی جان کر ہماری موجودگی کا بھی فائدہ اُٹھایا جا رہا تھا۔

پارٹی پر جانے سے پہلے سوال پیدا ہوا کہ کپڑے کون سے پہنے جائیں۔ ڈنر جیکٹ تو ہمارے پاس تھا نہیں اور ایسی تقریب پر عام سوٹ پہننا اگر ناجائز نہیں تھا تو نامناسب ضرور تھا۔ ہم اپنے ساتھ ایک نسخہ اپنے قومی لباس کا بھی لے تو گئے تھے لیکن یہ خالص پاکستانی تقریب کے لئے تھا۔ اب کوئی حل نہ سوجھا تو ہم نے کرنل شپرڈ سے رجوع کیا۔ بولا:

"قومی لباس پہن کر دکھاؤ پھر فیصلہ دوں گا۔"

ہم ڈریسنگ روم میں گئے اور تھوڑی دیر بعد سیاہ اچکن اور سفید شلوار پہن کر نمودار ہوئے تو شیپرڈ دیکھتے ہی چلایا: "THIS IS IT" (بات ہوئی نا!)۔

سو ہمیں اپنی اچکن اور شلوار کی نامقبولیت کا خوف تو نہ تھا لیکن ہم محض گھر سے نکل کر بازار سے نہیں گذر رہے تھے بلکہ ایک خاص تقریب میں شامل ہو رہے تھے جہاں مرکزِ توجّہ بننے کا اندیشہ تھا۔ اور ہمیں اگر ایک چیز سے وحشت ہے تو وُہ ہزاروں آدمیوں میں مختلف نظر آنے سے ہے، نگاہوں یا اشاروں کا نشانہ بننے سے ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں زندگی کا لطف تماشا بننے میں نہیں، تماشائی ہونے میں ہے۔ اس لئے گمنامی کو ہم نے ہمیشہ ایک نعمت سمجھا ہے۔ لیکن آج ہم اس نعمت سے محروم ہونے والے تھے کہ فی الواقع بازاروں میں ایک بن کر جا رہے تھے۔

ہال میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ جملہ زن و مرد مع جن و ملائک ہمیں ہی گھور رہے ہیں۔ ہمیں اچانک احساس ہوا کہ ہمارا چلنے کا طریقہ وُہ نہیں جو ہم سے خاص تھا۔ بہرحال ہم شیپرڈ کے ساتھ چلتے رہے حتیٰ کہ آگے سے میزبان نے آکر ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمارا تعارف بھی آدھا ہی کرایا جا چکا تھا کہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا:

"آپ کو اس شاندار لباس میں دیکھنا کس قدر پر لطف ہے۔"

پھر اپنی بیوی کو بلا کر کہنے لگا: "جینی آؤ۔ اپنے پاکستانی مہمان سے ملو۔ دیکھو۔ بالکل پکچر کارڈ کی طرح نہیں لگتا؟"

"بے شک لگتا ہے۔۔۔" جینی نے اپنے خاوند کی تائید اور ہماری توصیف میں کہا۔

قریب کھڑے ہوئے لوگ جو کُچھ کر رہے تھے۔ وُہ چھوڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ یعنی وُہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ ہمارے تماشا بننے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ لیکن سوچا کہ اس رول سے اب کوئی مفر تو ہے نہیں۔ کیوں نہ ذرا وقار سے تماشا بنیں؟ اور ان معنوں میں تماشا بننا ایسا معیوب بھی نہ تھا۔ آخر ہر خاص آدمی عوام میں تماشہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ذہن کو کسا اور اعتماد کو جھنجھوڑا اور تشکّر میں تھوڑا سا رومان ملا کر اپنی میزبانہ سے کہا:

"داد کا شکریہ میڈم۔ لیکن کاش میں مصوّر ہوتا۔ پینٹ کرنے کو مُجھے ایسی صورت پھر کبھی نہ ملے گی۔"

تعریف کی تپش سے ہماری میزبانہ کھڑی کھڑی پگھل گئی۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو اپنے قدر دان کو دونوں جہاں بخش دیتی مگر فی الحال آنے والے مہمانوں کے استقبال میں مشغول تھی۔ چنانچہ زبانی فدا ہونے کے بعد ہمیں شپرڈ کو سونپتے ہوئے بولی:

"ٹونی۔ ہمارے پاکستانی مہمان کو آگے لے چلو اور دِلچسپ لوگوں سے ملواؤ۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہمیں کسی سے ملوانے کی حاجت نہ تھی۔ دِلچسپ اور غیر دِلچسپ لوگ خود کھنچ کر ہماری طرف لیکن ہمارے لباس کی طرف آ رہے تھے۔ بعینہٖ جیسے اسماعیلیوں کے محلے میں بغیر اطلاع کے پرنس کریم آغا خان آ نکلیں۔ مردوں سے نبٹنا آسان تھا۔ کسی نے ہمارے مزاج پوچھے، کسی نے پاکستان کے اور ہم نے ہر دو کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دونوں پر اللہ کا فضل ہے۔ لیکن عورتوں اور خصوصاً کالج کی چنچل لڑکیوں سے اس شتابی سے فارغ ہونا ممکن نہ تھا کہ وُہ مزاج سے کُچھ زیادہ پوچھنا چاہتی تھیں۔ ایک نیم عریاں بڑی بی نے جو بظاہر انڈیا دیکھ چکی تھیں اپنا لال لگام سنوارتے ہوئے ہم سے سوال کیا:

"آف کورس، تم مہاراجہ ہونا؟"

کہا: "محترمہ آپ کو میرے گلے میں ہار یا کانوں میں بندے نظر آتے ہیں؟"

میرے گلے اور کانوں کا ذرا غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے بولیں:

"نہیں۔"

عرض کیا: "تو پھر میں مہاراجہ نہیں ہو سکتا۔ اور بہر حال پاکستان میں بھیڑیا اور بن مانس تو ملتا ہے لیکن مہاراجہ نہیں پایا جاتا۔"

"تو پھر تم ضرور نباب ہو گے۔"۔۔ یہ تشخیص ایک سگریٹ نوش تنگ قبا خاتون کی تھی جن کا گاؤن ان کے جسمانی رازوں کا اتنا ستار نہ تھا جتنا غماز تھا۔ پہلے تو خیال آیا کہ ہاں کہہ دوں۔ آخر چک لالہ کا سرکاری مکان تو ہے ہی۔ اس میں تھوڑا سا مبالغہ ملا کر یعنی قرب جوار کا کُچھ علاقہ جمع کر کے نواب آف فیڈرل ایریا بن جاؤں لیکن ساتھ ہی اس نواب کے کُچھ ڈپلومیٹک عواقب بھی ذہن میں ابھرے۔ سوچا کہیں پیچھے اسلام آباد[٩٦] کو پتہ چل گیا تو کہیں ایڈ نبرا کا سل کے کسی تہہ خانے میں بطور امانت منتقل نہ کر دیا جاؤں۔ چنانچہ ارادہ بدل لیا اور کہا:

"نہیں محترمہ۔۔۔ میں نواب بھی نہیں ہوں۔"

"تو پھر تم کیا ہو؟" محترمہ نے فیصلہ کن مطالبہ کیا۔

میرا ہاتھ دیکھ برہمنا

ادھر سے رنگا رنگ گاؤنوں میں ملبوس چار پانچ نوجوان طالبات کی ایک ٹولی ہماری طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ اس ٹولی پر ہماری نگاہ پڑی تو ایک سُرخ پوش ساحرہ پر اٹک گئی کیونکہ وُہی اس سنسنی خیز خبر کی شہ سُرخی تھی اور دور ہی سے مطالعہ پر مجبور کر رہی

---

[٩٦] ان دنوں ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔

تھی۔ ظالم کے سینے پر گاؤن کا یہ عالم تھا جیسے دو چوبہ شامیانہ تنا ہوا ہو۔ قریب آکر رُکی اور گفتگو کا آخری حصّہ سُننے کے بعد ہم سے مخاطب ہوئی:

"مُجھے معلُوم ہے تم کیا ہو۔ تم پامسٹ[97] ہو۔"

اب ہم دست شناس تو نہ تھے لیکن تھوڑے سے میم شناس ضرور تھے اور جب دیکھا کہ ایک نہایت ہی خوبصورت تحریر کے زیرِ مطالعہ آنے کا امکان ہے تو اقبال کر لیا اور کہا۔

"ینگ لیڈی۔ میں پیشہ ور پاسٹ تو نہیں لیکن گاہے گاہے از راہِ شوق اس شغل سے انکار بھی نہیں۔"

"تو پھر پلیز میرا ہاتھ دیکھو۔" شہ سُرخی نے اچانک مطالبہ کیا۔

"یُوں کھڑے کھڑے ہاتھ نہیں دیکھا کرتے۔ یہ بڑا کوئی انہاک اور تنہائی کا معاملہ ہے۔"

بولی: "تو پھر آؤ ساتھ کے کمرے میں چلتے ہیں۔"

---

[97] ہاتھ دیکھنے والا۔ دست شناس۔

اور نیک بخت نے ہمارا بازو پکڑا یا زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ اپنا بازو پکڑوایا اور ہمیں اس کمرے میں لے گئی اور ہمیں صوفے پر بٹھا کر اپنا ہاتھ ہمارے زانو پر رکھ دیا۔ پھر کسی قدر اشتیاق بھرے انداز میں ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

"میں ایک مدّت سے پاکستانی پامسٹ سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی اچھی قسمت بتاتے ہیں۔"

"آپ کو کسی پاکستانی پامسٹ کا تجربہ ہے؟"

"ہاں ہاں، میری سہیلی الزبتھ کا ہاتھ بھی ایک پاکستانی ہی نے دیکھا تھا اور اسے قسمت کا حال صحیح بتا دیا تھا۔ حتیٰ کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی شادی بھی ہو گئی۔"

"کس کے ساتھ۔"

"اسی پاکستانی کے ساتھ۔"

ہم نے اپنے ہم وطن کو دِل ہی دِل میں شاباش دی اور سُرخ پوش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا لیکن اپنے ہم وطن کے نقشِ قدم پر چلنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا یا یُوں کہیں کہ توفیق نہ تھی۔ لٰہذا منجھے ہوئے نجومیوں کی طرح سب سے پہلے اپنے معمول کا یہی مغالطہ دور کیا

اور ایک مدت تک ہاتھ پر نظر جمائے رکھنے کے بعد ایک پراسرار آواز اور لے میں کہا۔

"اے لڑکی۔ تیری قسمت میں پاکستانی نہیں لیکن غم نہ کر۔"

"تو پھر کون ہے؟" لڑکی نے جائز مطالبہ کیا۔

"ایک لمبے بالوں والا شہزادہ جو تمہاری طرف چل پڑا ہے۔"

"شہزادہ؟ اوئی! کہاں سے؟"

ہم نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ لہرایا جس سے تقریباً چاروں سمتیں ظاہر ہوتی تھیں اور اس کی نگاہ میں اگر کسی طرف کوئی شاہزادہ تھا تو اپنی پسندیدہ سمت چُن سکتی تھی:

"کب آئے گا؟"

اس سوال پر معاً ہمیں وُہ شعر یاد آیا جس میں غائب یار سے ملاقات کا مثالی ٹائم ٹیبل درج ہے۔

میرا ہاتھ دیکھ برہمنا، میرا یار مجھ سے ملے گا کب

تیرے مُنہ سے نکلے خدا کرے اسی سال میں اس ماہ میں

ہم دِل میں شعر تازہ کر رہے تھے کہ سُرخ پوش نے بے تابی میں سوال دہرایا۔

"کب آئے گا پلیز؟"

ہم نے اس کے ہاتھ کو ذرا ترچھے زاویے سے دیکھا اور کہا: "اسی سال میں۔"۔

اس نے پھُول کی طرح کھلتے ہوئے پوچھا۔

"بلکہ اسی ماہ میں۔"

"سچ؟ اووہ!۔"۔ اور مکمل کنول بن گئی۔

اور پھر وُہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی معمول نے اپنے عامل کا ہاتھ کامل شوق کے ساتھ اُٹھایا اور لبوں تک لے گئی۔ لیکن اس حسین کالائمکس پر پہنچتے ہی چار اور لڑکیوں نے ہماری جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔ انہماک میں ہم نے یہ نہ دیکھا تھا کہ صوفے کے پیچھے امیدواروں کا کیو لگ رہا ہے۔ لیکن وہاں تو ہاتھ دیکھنے کے لئے ہمارے پاس پوری رات تھی۔ آپ کے پاس یہ کہانی سُننے کو وقت کہاں؟ آپ سو جایئے۔ شب بخیر۔ کل آپ سے لندن میں ملاقات ہو گی۔

دُوسرے روز شام کو لندن پہنچے۔ رات بھر آرام سے سوئے کہ یہی گزشتہ شب کے رَت جگے کا تقاضا تھا اور اگلی صُبح مُنہ دھو کر چاند سا مکھڑا لئے مس پارس کو سیر ایڈنبرا کی

رپورٹ دینے چل پڑے کہ یہی مس موصوفہ کا تقاضا تھا۔ مس پارس کے پاس مہمانوں کے لئے سکاٹ لینڈ کی سیر سب سے دِلکش تحفہ تھا اور ہمیں معلُوم تھا کہ وہ ہماری رودادِ سفر سُننے کو بے تاب اور سُن کر نہال ہو گی۔ ایڈنبرا میں ہمارا وقت یُوں بھی خاصا گزرا تھا۔ پارس کو نہال کرنے کے لئے ہم نے کُچھ مزید رنگ بھرا۔ بالخصوص یونیورسٹی کے ڈنر اور اپنے لباس کا ذکر کیا تو پھڑک اُٹھی لیکن جب اپنی پاسٹری کا واقع سنایا تو ذرا بگڑنے لگی۔ جیسے کہتی ہو: "اپنے گھر کا جو تشی اور ریکھا دیکھے غیروں کی!" ہم نے کہا: "بگڑنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کی ریکھا بھی دیکھ لیں گے۔ ذرا فراغت میسر ہو لے۔"

اور پھر اپنے سکہ بند جملے کا اضافہ کیا: "یکسوئی، انہماک اور تنہائی کا معاملہ ہے۔"

مس پارس عقلمند لڑکی تھی۔ ہماری بات سمجھ گئی اور اسی خوشی میں ہمیں مژدہ سنایا:

"اگلے ہفتے منگل کو آپ آکسفورڈ یونیورسٹی کا دورہ کر رہے ہیں جہاں جوڈی ایڈن آپ کی گائیڈ ہو گی۔"

اور ایک وقفے کے بعد اضافہ کیا۔

"اور اللہ آپ کا نگہبان ہو!"

اس پر ہم نے سوالیہ "ہوں؟" کی تو ادھر سے جوابیہ "اونھ" پر بات ختم ہو گئی۔

لیکن آکسفورڈ جانے سے پہلے ہماری دو اور اہم مصروفیتیں تھیں۔ ہفتے کے دن بریگیڈر حسن کی پارٹی جو وُہ رخصت ہونے والے ہائی کمشنر کے اعزاز میں دے رہے تھے اور اتوار کو برائٹن کی سیر جس کا انتظام محمّد اقبال اور محمّد نواز کے ہاتھ میں تھا۔

ہیلو ایڈمرل، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

بریگیڈیر حسن کا مکان ہمارے ہوٹل سے کافی فاصلے پر تھا۔ بسیں بدلتے بدلتے اور پیدل چلتے چلتے ذرا دیر ہو گئی اور آخر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ڈرائنگ روم مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور دروازے پر وُہ ایڈنبرا کے ہوٹل والا ایڈمرل نما دربان کھڑا ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا مگر ہم حیران تھے کہ اس کا یہاں کیا کام؟ بہرحال حسبِ معمول ہم نے ذرا سرپرستانہ انداز میں کہا:

"ہیلو ایڈمرل تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ادھر سے جواب آیا: "ہیلو محمّد خان۔ تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟"

جواب سُنتے ہی ہمارے مُنہ سے نِکلا:

"۔OH, HORROR IT IS THE INCHCAPE ROCK"[۹۸]

یہ تو اصلی ایڈمرل خان تھے اور ان کا ہمیں یُوں جھٹک دینا بجا تھا کہ پاکستان افواج میں ایک جونئیر افسر اپنے سینئر کو رینک سے نہیں بلاتا بلکہ سر کہہ کر خطاب کرتا ہے۔۔۔ رینک سے بلانے کی گستاخ طرزِ امریکی رسم ہے۔۔۔ ہمارے پاس اب غیر مشروط معافی مانگنے کے علاوہ اپنی بے گناہی کا ایک ہی ثبوت تھا کہ اپنی غلطی کا شانِ نزول تفصیل بیان کر دیں۔ چنانچہ ایڈنبرا ہوٹل کے دربان والی کہانی من و عن سُنا دی۔ ایڈمرل صاحب کہانی سُن چکے تو جتنے زور سے ہنسے اتنے زور سے ہی ہمیں معافی بھی دے دی اور ہمارے دِل سے شرمساری کی آخری رمق مٹانے کے لئے واپسی پر اپنی کار میں ہمیں ہوٹل میں چھوڑ گئے۔۔۔ اب ہم کسی کو سفید نیوی نما کپڑوں میں دیکھیں تو کلام کرنے سے پہلے بڑے غور سے اس کا خاموش مطالعہ کرتے ہیں شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔

---

[۹۸] یہ انگریزی کی مشہور فلم انچکیپ راک کی ایک سطر ہے، یہ الفاظ سر رالف بحری قزاق کی زبان سے اس وقت نکلے تھے جب رات کی تاریکی میں اس کا اپنا جہاز انچکیپ کی چٹان سے آ ٹکرایا جس سے اس نے خطرے کی گھنٹی اکھاڑ پھینکی تھی تاکہ دُوسرے جہازوں پر ڈاکہ ڈال سکے۔

ہم رات بھر اپنی روحانی مرہم پٹی کرتے رہے

دُوسرے دن اتوار تھا۔ مزے کی دُھوپ تھی اور ولایت میں دُھوپ کی آمد ایسی ہی ہے جیسے آپ صبح جاگیں اور آپ کے سرہانے برسوں کا روٹھا اور بچھڑا محبوب کھڑا ہو۔ نو بجے کے قریب محمدّ اقبال اور محمدّ نواز مع کار آ گئے اور ہم برائٹن کو روانہ ہوئے۔

برائٹن انگلستان کے جنوبی ساحل پر اپنی بیچ[99] BEACH اپنے جوئے خانوں اور دیگر خانوں کی وجہ سے بڑی مقبول تفریح گاہ ہے۔ ساری گرمیوں میں اور خصوصاً اتوار کے روز مرجع خاص و عام ہوتی ہے۔ لندن سے نکل کر سڑک پر آئے تو یُوں معلُوم ہوا جیسے ساری ٹریفک کا کعبہ برائٹن ہی ہے۔ جملہ موٹریں، بسیں، موٹر سائیکل اور سکوٹر رو بہ برائٹن رواں تھے۔ چنانچہ ہم بھی دِل میں شوق لیئے سوئے برائٹن بڑھے لیکن منزل پر پہنچے تو برائٹن موجود تھا مگر بیچ غائب تھی۔ اس کی میلوں کی لمبائی عریاں جسموں اور پریشان بالوں سے اٹی اور ڈھکی پڑی تھی۔ ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کا ستر پوشی کا واحد ذریعہ ان کے سر کے بال تھے ریت پر کُچھ اس طرح گڈمڈ بیٹھے یا لیٹے تھے کہ پتہ نہ چلتا تھا کون سی باہیں یا ٹانگیں کس دھڑ اور چہرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس

---

[99] سمندر کے ساحل کا ریتلا علاقہ

ہمہ گیر عریانی کی ولایت میں ہمیں اپنے آپ کو کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خلافِ قانون حرکت کر رہے ہوں۔ اور خدا جانے وُہ کون سا اندرونی قومی یا دینی انقلاب تھا جس نے ہمیں اپنے کپڑے نوچ کر اس برہنگی کے سمندر میں کود پڑنے سے باز رکھا۔ چنانچہ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ پکی سڑک پر ہی چلتے رہے۔ لیکن سڑک پر چلنے والوں اور والیوں کا چال چلن بھی کُچھ کم صبر آزمانہ تھا۔ دخترانِ فرنگ فیشن کی رو میں سینہ ننگا کرتے کرتے بہت نیچے چلی گئی ہیں اور رانیں برہنہ کرتے کرتے بہت اُوپر جا چکی ہیں۔ چنانچہ اس بے باک گریباں چاک ہجوم سے گزرنے کی کوشش کی تو اُوپر سے سینے سے سینہ چھلنے لگا اور نیچے ٹانگوں سے ٹانگیں الجھنے لگیں۔۔۔ خدا جانے پل صراط سے گزرنا کتنا مشکل ہو گا لیکن براِئٹن کی صراط پر چلنا بھی چنداں سہل نہ تھا۔۔۔ آخر رینگتے رینگتے آگے بڑھے تو ہمیں ایک طرف چائے خانہ نظر آیا اور ہم نے اس آڑے وقت میں خدا کا نام لے کر ہجوم کو زاویہ قائمہ پر چیرنا شروع کیا اور چند آڑھی ترچھی چوٹیں سہنے کے بعد چائے خانے میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ ہمارا جی تو چاہتا تھا کہ کوئی عبادت خانہ میسر ہوتا کہ بہ ہزار خشوع و خضوع حضور باری تعالیٰ میں سر جھکاتے اور جان و ایمان کی سلامتی چاہتے اور مزید دُعا یہ کرتے کہ اے خدا برائٹن میں ہمیں ایک ایسی راہِ مستقیم، ایک ایسی سڑک دکھا کہ جس پر جملہ جاندار ہوں، صرف بیبیاں نہ ہوں اور اگر ہوں تو پورے کپڑے پہنے، چادریں اوڑھے، نگاہیں

جھکائے، ایک محدود سی اقلیت میں پھر رہی ہوں اور پاس سے گزریں تو شرعی فاصلہ چھوڑ کر کہ سینہ فگار نہ ہو اور ایمان کو خراش نہ آئے۔ لیکن افسوس ہمیں مسجد میسر آئی، نہ دُعا ہی مانگ سکے اور نتیجہ یہ رہا کہ پچھلے پہر تک کفر نے ہمارا مکمل گھیراؤ کئے رکھا۔ دِل ناتواں نے مقابلہ تو بہت کیا مگر کہاں تک؟ وُہ وُہ چوٹیں کھائیں جو کبھی کھائی نہ تھیں۔ بالآخر ہمہ تن مضمحل و منفعل شام کو لندن پہنچے تو ہوٹل میں آکر جو سب سے پہلا کام کیا وضو تھا اور پھر مصلے پر بیٹھ کر رات گئے تک اپنی روحانی مرہم پٹی کرتے رہے۔

پھر وُہی دانستہ ٹھوکر کھایئے

لیکن معلُوم ہوتا ہے کہ ہماری دُعا کو لندن کے گھنے بادِلوں نے فلک تک جانے کے لئے راہ نہ دی کیونکہ دُوسرے روز آکسفورڈ پہنچے اور گاڑی سے اُترے تو ایک اور آزمائش ہمارے انتظار میں بیٹھی تھی، بلکہ استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ ہماری استقبال کنندہ ہرچند کہ واحد بی بی تھی لیکن یہ دشمن ایمان و آگہی اتنے اسلحہ سے لیس تھی کہ پورے برائٹن کی فائر پاور رکھتی تھی۔ بارود سے بھری اور شعلوں میں لپٹی ہوئی جوانی اور اس پر کوتاہ پیرہن، عریاں ساق، برہنہ بازو، گلابی لب، نیلی آنکھیں اور سنہری بال۔ خدا جانے گائیڈ بن کر کیوں وقت ضائع کر رہی تھی۔ بہر حال یہ تھا اس خطرے کا متن جس

کی وارننگ مس پارس نے دی تھی۔ بلکہ پارس نے خبر دار کرنے میں سخت کفایت سے کام لیا تھا۔ ابتدائے کلام سمتِ مخالف سے ہوئی لیکن نہایت موافقت تبسم کے ساتھ:

"آپ ہی مسٹر خان ہیں؟"

"جی ہاں۔"۔۔

"اور آپ ہی مس ایڈن ہیں؟"

"جوڈی ایڈن۔ مگر آپ کو میرا نام کیسے معلُوم ہوا؟"

"لندن میں چرچا تھا۔"

"مُجھے یہ مبالغہ پسند ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"اور آپ سے مل کر تو ناخوشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تھینک یو۔ مُجھے انوکھے انداز کی ستائش خاص طور پر مرغوب ہے۔"

ہم چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے تو یاددہانی کے طور پر بولی:

"آپ چپ ہو گئے۔۔۔ ہم ستائش کی بات کر رہے تھے۔"

"جی ہاں اس لئے کہ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔"

”خاموشی کے اتنے خوشگوار معنی میں نے آج تک نہیں سنے۔“

اتنے میں ہم گیٹ کے باہر آ گئے جہاں شوفر کار لئے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے جوڑی کو پہلے آپ کہا تو بولی:

”پہلے مہمان۔“۔ اور ہم شکریہ ادا کرتے ہوئے کار میں داخل ہو گئے اور پھر مس ایڈن داخل ہوئیں لیکن خدا جانے داخل ہوتے وقت آپ کا ہاتھ چوکا یا پاؤں پھسلا بہر حال حاصل لغزش یہ نکلا کہ آپ دھڑام سے مُنہ کے بل گریں۔۔۔ لیکن گرنے کے بعد آپ کی نامناسب تیزی کے بغیر نہایت سکون سے سلو موشن میں سنبھلیں اور اُٹھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگیں:

”میں معافی چاہتی ہوں آپ کو چوٹ تو نہیں آتی؟“

ہماری جگہ کوئی بے صبر اسا شاعر ہوتا تو شاید کہتا: ”اے جانِ بہار پھر وُہی دانستہ ٹھوکر کھایئے۔ پھر مری آغوش میں گر جایئے۔“لیکن ہم نے حسبِ معمول صبر و قناعت کا ثبوت دیا اور کہا: ”جی نہیں۔ چوٹ تو آپ کو آئی ہو گی۔ کوئی خدمت جو میں کر سکوں؟“

اور ساتھ ہی ہم نے جوڈی کے بیٹھنے کے لئے آدھی سے زیادہ سیٹ خالی کر دی۔ لیکن جوڈی بیٹھی تو ہم سے اتنی قریب اتنی قریب کے درمیان سے بال بھی نہ گزر سکے۔ اگر

یہ جوڈی کا معصومانہ اندازِ تواضع تھا تو آپ اتفاق کریں گے کہ ہر چند کہ پاکستان میں ہم لوگ تواضع کی قدر کرتے ہیں تاہم اتنی زیادہ معصوم تواضع کے عادی نہیں۔

یونیورسٹی میں پہنچے تو جوڑی نے ہمیں مسٹر ڈیوس کے حوالے کیا اور گھڑی دیکھ کر کہا:

"اس وقت ساڑھے دس بجے ہیں۔ میں پورے ایک بجے آپ کو لینے آؤں گی۔ خوب چل پھر کر یونیورسٹی دیکھیں اور اپنی بھوک چمکائیں کیونکہ آج آپ ایک اطالوی ریستوران میں لنچ کھانے والے ہیں۔"

ہم نے جھک کر "یس میڈم" کہا۔ جوڈی نے میدان چھوڑا تو ہمارا درجہ حرارت کسی بلندی سے اتر کر نارمل پر آ گیا۔ بلکہ مسٹر ڈیوس نے بھی جو صرف چند لمحوں کے لئے جوڈی کے محور میں آئے تھے، ایک گہرا سانس لیا اور اپنے دائیں ہاتھ کو جو ابھی تک دِل و جگر کے نواح میں پیوست تھا ڈھیلا چھوڑا اور سر ہلاتے ہوئے بولے:۔

"REMARKABLE"

ہماری رائے مسٹر ڈیوس سے مختلف نہ تھی لیکن ہم یہ مضمون ختم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا خاموش رہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پر بوڈین لائبریری کا سایہ ہے

گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے یونیورسٹی بند تھی اور طلبا اور طالبات کے بغیر یونیورسٹی کی سیر محض کھنڈروں کی سیر تھی۔ بہر حال ہم نے متعدد کالجوں کے درو دالان میں جھانکا اور یُوں محسوس ہوا کہ ادھر ہم نے قدم رکھا اور بیس پچیس چمگادڑیں ہڑبڑا کر اڑیں اور ہمارے گرد احتجاجی چکر کاٹنے لگیں۔ طلبا کے ہوٹل دیکھے تو محسوس ہوا یہاں بھکشو رہتے ہوں گے اور چند لڑکے جو وہاں موجود تھے، سچ مچ بھکشو لگتے تھے سوائے اس کے کہ ان کے بال اصلی بھکشوؤں سے ذرا زیادہ لمبے اور ان کے کپڑے ذرا زیادہ گندے تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی ہمارے ٹیکسلا کی ہم عمر تو نہیں لیکن ایسی نوخیز بھی نہیں۔ کوئی چھ سو سال کے پیٹے میں ہے مگر یہ انگریز کی ضد ہے کہ اپنی قدامت پرستی کے جوش میں ان کھنڈروں سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ اسے خوبصورت عمارت بنانا نہیں آتی۔ اس کی نئی عمارات تو خوابوں کی دُنیا سے لائی ہوئی لگتی ہیں۔ لیکن آکسفورڈ کی عمارتیں جتنی پرانی ہیں، تعلیم اتنی ہی نئی ہے۔ گویا انگریزوں نے یہاں بھی وُہی حرکت کی ہے جو پاکستانی مزاج کے منافی ہو۔ ہمارے مزاج کا تقاضا تو یہ تھا کہ کمپس اَپ ٹو ڈیٹ ہو، تعلیم خواہ ایک دو صدیاں پچھڑی ہوئی ہو اور ہماری جدید ترین تعلیمی دریافت کی تو

انہیں خبر ہی نہیں کہ یونیورسٹی موجود ہے مگر تعلیم مفقود کہ طلبا جلوس نکالنے چلے گئے ہیں اور استاد انتظار کرتے کرتے ریٹائر ہو رہے ہیں۔

لیکن آکسفورڈ کے کیمپس پر کوئی چیز چھائی ہوئی تھی اور وُہ بھی ایک کتب خانے کی عمارت۔ بوڈلین لائبریری۔۔۔ بوڈلین اس لئے کہ جن صاحب نے آج سے تین چار سو سال قبل اس کی بنیاد رکھی تھی، ان کا اسمِ گرامی بوڈلے تھا۔۔۔ ہمارے یہاں اس نام کے ملنگ ہوتے ہیں۔۔۔ مگر اس برطانوی ملنگ نے تکیہ کی بجائے کتب خانہ تعمیر کیا اور آج یہ عالم ہے کہ اگر اس ہفت منزلہ لائبریری کی الماریوں کو ایک سیدھی قطار میں رکھا جائے تو بقول مسٹر ڈیوس پورے پندرہ میل لمبی قطار بنتی ہے۔ لیکن لاہور سے کالا شاہ کاکو تک لمبی لائبریری! ظاہر ہے کہ ایک گھنٹے میں ساری لائبریری کو پیدل چل کر دیکھنا ممکن نہ تھا اور کار میں بیٹھ کر ہفت منزلہ عمارت کی سیر کی نہیں جاتی۔ چنانچہ ڈیوس سے ہم نے صرف ایک منزل دکھانے کی درخواست کی اور اس نے ہماری خاطر مشرق مخطوطات کا حصّہ چُنا مگر جب یکے بعد دیگرے اپنے آبا کی کتابیں یہ علم و حکمت کے موتی دیکھے تو بخدا دِل پارہ ہونے لگا لیکن کُچھ دیر بعد دِل اس خیال سے سنبھلنے لگا کہ اس دیارِ غیر میں ہمارے خزانے دیمک اور کباڑیوں سے تو محفوظ ہیں اور بوریوں کی بجائے شیشے کی الماریوں میں تو رکھے ہیں۔۔۔ اور مزید یہ کہ یہاں کوئی خدا کا بندہ انہیں پڑھنے کبھی تو آنکلتا ہے۔

جوڈی کی بلاغت اس کے گریبان میں تھی

پھرتے پھرتے ایک بجے مسٹر ڈیوس کے دفتر کو لوٹے تو اُدھر سے جوڈی کی کار آتی دکھائی دی۔ ہم نے ڈیوس سے رخصت لی اور حسبِ معمول طوعاً و کرہاً جوڈی کے قربِ تنگ میں بیٹھ کر ریستوران کو روانہ ہوئے۔۔۔ جوڈی کو ہٹ کر بیٹھنے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا۔۔۔ ریستوران میں داخل ہوئے تو ہمیں جوڈی کے حسنِ انتخاب کا اعتبار آیا اور ریزروشدہ میز کا محلِ وقوع دیکھا تو اس کے حسنِ ذوق کا ثبوت ملا۔ کھانا آیا تو وُہ بلاشبہ ایک چمکتی ہوئی بھوک ہی کے قابل تھا۔ لیکن جوڈی کی ہم نشینی میں سُخن گسترانہ بات، باتیں تھیں نہ کہ کھانا۔ اور باتوں سے ہم پر یہ راز کھلا کہ جوڈی محض بودی سی، انجان سی، کھلنڈری سی گڑیا نہیں بلکہ بڑی سوچتی سمجھتی، عاقل بالغ لڑکی ہے۔ رہا اس کا طرزِ گفتگو، ذوقِ لباس اور اندازِ لغزش تو یہ سب ایک ایسی خود مختار اور خود اعتماد حسینہ کی ادائیں ہیں جو زندگی سے نہایت شاہزادگانہ سلوک کرنا چاہتی ہے۔ ذرا بے تکلّفی بڑھی تو ہم نے ایک سوال جو صبح سے ہمارے ذہن میں کلبلا رہا تھا، پوچھ ڈالا:

”جوڑی۔ تم اس شکل و صورت کے ساتھ گائیڈ ہونے پر کیوں مائل ہو؟“

جوڈی ہنسی اور بولی: ”آپ پہلے آدمی نہیں جس نے یہ سوال پوچھا ہو۔“

"تو تم نے پہلے آدمی کو کیا جواب دیا تھا؟"

"بس یہی کہ مُجھے گائیڈ ہونا پسند ہے۔ میں دیس دیس کے لوگوں سے ملتی ہوں (ذرا مسکرا کر) آپ جیسے لوگوں سے۔"

"لوگوں سے ملنا تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

جوڑی نے جھلا کر کہا: "BUT PEOPLE ARE FUN[۱۰۰۱]۔"

جوڑی کی جھلاہٹ کا انداز کُچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں اتنی بڑی نعمت کا ذکر کر رہی ہوں تم سمجُھتے کیوں نہیں؟ اور سمجھنے کی کوشش کی تو اچانک ہم پر ایک بڑی سچائی کا انکشاف ہوا کہ سچ مچ، زندگی کی رونق تو لوگوں سے ملنے ہی میں ہے۔ خود ہماری اس لمحے کی رونق جوڑی سے ملنے میں تھی۔ بلکہ ہمارے سارے سفر کا حاصل رنگا رنگ لوگوں کی ملاقات ہی تھی اور یہ کتاب کیا ہے؟ یہ انہی ملاقاتوں کی روداد تو ہے۔ جوڑی کا انگریزی جملہ ہمارے ذہن میں گونجنے لگا: PEOPLE ARE FUN ویسے جوڑی نے کوئی نئی بات تو نہیں کی تھی۔ غالب یہی سبق ایک مدت ہوئی دے چکے تھے بلکہ غالب کو تو لوگوں سے ملنے پر کسی قدر ناز بھی تھا اور کم آمیز پیغمبروں کو بھی نہیں بنتے تھے:

[۱۰۰۱] لوگوں سے ہی رونق ہے

وُہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

لیکن مرزا اپنی بلاغت کے باوجود یہ سبق ہمیں اتنا اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرا سکے تھے جتنا جوڈی نے چند لمحوں میں کرا دیا۔ آخر بحیثیت استاد جن آلات سمعی[۱۰۱] و بصری سے جوڈی لیس تھی، میرزا ان سے یکسر محروم تھے۔ میرزا کی تمام تر بلاغت ان کی زبان میں تھی جو بتیس دانتوں میں بند تھی اور جوڈی کی بلاغت اس کے گریبان میں تھی جو نصف سے زیادہ چاک تھا۔ بہر حال جوڈی کو دیکھ اور سُن کر ہمیں خاص خوشی ہوئی کہ خدا نے بہت کم حسینوں یا حکومتوں کو ایسی خوشگوار اور آزاد خارجہ پالیسی کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ اس شام آکسفورڈ سے لوٹے تو ہر چند کہ ہمارا اس جگہ کا قیام مختصر تھا ہماری وہاں کی یادیں بڑی دیر پا تھیں۔

کلچر ایک چیز ہے اور وارنش دُوسری چیز

آکسفورڈ سے لندن پہنچے تو ہمارے دورے کی آخری بیرونی مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ اب ہمارے قیام لندن کے چند روز باقی تھے۔ دُوسرے روز مس پارس سے ملنے گئے تو

---

[۱۰۱] AUDIO VISUAL AIDS

معلوم ہوا کہ اگلی رات ہمارے میزبان ادارے کے ایک بڑے افسر نے ہمیں ارلز کورٹ EARLS COURT میں الوداعی ڈنز اور رائل ٹورنامنٹ شو دیکھنے کے لئے مدعو کر رکھا ہے۔ جواب میں ہم نے اس سے اگلی شب کے لئے مس پارس کو شیز ان لندن میں الوداعی عشائیہ کی بشارت دی کہ اس گرہ نیم باز کا ہمارے ناخن پر بڑا بھاری قرض تھا۔

اگلی رات ارلز کورٹ میں ڈاکٹر فاسٹر اور ان کی بیگم کے ساتھ کھانا کھانے اور تماشا دیکھنے کا وُہی لطف آیا جو حقیقی شرفا کے ساتھ مل بیٹھنے میں آنا چاہیے۔ ایمرسن کا کہنا ہے کہ کلچر ایک چیز ہے اور وارنش دوسری چیز۔ ہر چند کہ قیام لندن کے دوران ہمارا واسطہ لکھے پڑھے لوگوں ہی سے رہا تھا تاہم ان میں اکثریت وارنش والوں ہی کی تھی۔ ڈاکٹر فاسٹر اور ان کی بیوی میں ہمیں اصلی کلچر کی جھلک دکھائی دی۔ ہر دو نے باتوں کے لئے موضوع کا انتخاب کیا تو ارسطو اور شیکسپیر سے کم تر پر نگاہ نہ ٹھہری اور بولے تو یُوں جیسے ریشمی سرگوشیوں کے ساتھ نوکِ زبان سے گن گن کر موتے بکھیر رہے ہوں۔ کلچر کی شدت کی وجہ سے اکثر موتی تو ہماری گرفت سے پھسل گئے لیکن چند دانے ہمارے پلے پڑ بھی گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تین گھنٹوں کی ہم نشینی کے بعد اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر ہوٹل لوٹے اور وارنش شدہ ساتھیوں سے باتیں کرنے لگے تو درمیان میں شیکسپیئر حارج ہونے لگا اور ہماری زبان سے بھی اکا دکا موتی جھڑنے لگا۔ جارج نے

حیران ہو کر پوچھا کہ اس اچانک گوُہر فشانی کی وجہ؟ تو ہم نے اعتراف کر لیا کہ یہ غیروں کی صحبت میں بیٹھنے کا نتیجہ ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر کی عوامی گفتگو کے بعد شیکسپیئر چپکے سے فیڈ آؤٹ ہو گیا اور ہم اپنے سامعین کی طرح حسبِ معمول صرف و نحو کی سطح سے بلند اور بے نیاز ہو کر انگریزی بولنے لگے۔۔۔ کلچر اچھی چیز ہے مگر کیا کیا جائے، خدا نے وارنش والے زیادہ پیدا کئے ہیں۔

وُہ بات ان کو بہت خوشگوار گذری ہے

دُوسری شب ہم میزبان تھے اور مس پارس مہمان۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پارس شکل کی مقبول تو تھی مگر محبوب نہ تھی لیکن آج رات اس نے ایک اشتہا انگیز گاؤن پہن کر اور ایک ہوشربا خوشبو لگا کر تھوڑی سی محبوبیت کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ شیزان میں داخل ہوئی تو جی چاہا کہ اس خوبصورت پاکستانی ریستوران میں داخل ہونے پر اس کا میر کے شعر سے استقبال کریں۔

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے جو تجھ پہ نثار کریں

الّا لے کے بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

لیکن ایک تو اس شعر کی انگریزی نثر بالکل دیوالیے کی درخواست لگتی، دُوسرے ریستوران کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر زبانی پیار تو کیا جا سکتا ہے لیکن بغلی پیار مشکل ہے اور سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ آج رات ہم نے پارس کو اظہارِ محبّت کے لئے نہیں بلکہ اظہارِ ممنونیت کے لئے بلایا تھا کہ مس پارس نے پورے دوماہ ہمیں دیکھا بھالا اور پالا پوسا تھا۔ چنانچہ میر کی بجائے ہم نے غالب کے شعری پر اکتفا کیا کہ وہ آئیں گھر میں ہمارے۔۔۔ اور اظہارِ ممنونیت کے لئے اس سے خوبصورت تر طریقہ کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن اگر ہم نہیں تو مس پارس گہرے رومانی موڈ میں تھی۔ اچھی بھلی موسم کی بات ہو رہی تھی کہ اچانک ایک مخمور آواز سے بولی:

”آپ کو یاد ہے جب آپ پہلے روز آئے تھے تو آپ نے ایک بات کی تھی۔“

”مثلاً کون سی بات؟“

”یہی کہ جس لڑکی کو آپ چاہتے ہیں، اس کے لئے قلعے تعمیر کرتے ہیں اور پھر اسے ان قلعوں میں لے بھی جاتے ہیں۔“

اوّل تو جن قلعوں کا ہم نے ذکر کیا تھا وُہ خالص استعارے کے گارے سے تعمیر کئے گئے تھے اور پھر ہم سے مراد ہم خود نہ تھے بلکہ ہم جیسے لوگ۔ بہر حال اب مکر نا مناسب نہ تھا۔ کہا:

"جی ہاں، کُچھ اسی قسم کی بات کہی تو تھی۔"

"تو وُہ بات مُجھے بہت پسند آئی۔"

لیجئے، وُہ بات ہم نے کہی تھی جو استعارے میں۔ وُہ بات ان کو بہت خوشگوار گزری ہے!

لیکن کیا وُہ اب سچ مچ کسی قلعے تک پہنچنا چاہتی تھیں؟ اگر یہ بات تھی تو ہمیں مس پارس سے ہمدردی ضرور تھی لیکن قلعے تک سواری کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اب ہم نے بھی استعاروں کو لپیٹ کر سیدھی سادھی بات کی:

"این۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

بولی: "شادی بڑا نازک معاملہ ہے۔"

"اگر بہت نازک ہے تو شادی کے بغیر ہی چلی چلو۔"

"شادی کے بغیر چلے چلنا بھی نازک معاملہ ہے۔"

غرض مجنوں کی طرح مس پارس بھی دوگونہ عذاب میں مبتلا تھی۔ بلائے شادی و بلائے تنہائی۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ پارس اچانک بولی:

"مگر سوال یہ ہے کہ شادی کی جائے تو کسی سے کی جائے؟"

”میرے خیال میں تو یہ کوئی مشکل سوال نہیں۔ صرف لندن کی مردانہ آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے۔“

”پچاس لاکھ لندنی صبح سویرے میرے سامنے آکر پریڈ کرنے سے تو رہے۔“

”تو خاوند چننے کے لئے آپ کو پریڈ کے علاوہ کوئی اور طریقہ موافق نہیں؟“

”مثلاً کون سا طریقہ؟“

”بے شمار طریقے ہیں۔ منجملہ ہمارے راجگان قدیم کے ہاں تو ایک یہ طریقہ بھی تھا کہ راجکماری صبح سویرے جاگ کر محل کے باہر جھانکتی۔ جو شخص اسے سب سے پہلے نظر آتا اس کے گلے میں ہار ڈال دیتی۔ کتنا سہل اور سریع طریقہ ہے! یہ طریقہ تم بھی آزما سکتی ہو۔“

”اگر وُہ کوئی گداگر نکل پڑا تو؟“

”تو سمجھنا یہی رضائے الٰہی ہے۔ مگر وُہ کوئی رئیس بھی ہو سکتا ہے۔“

کہنے لگی:

”اوّل تو رئیس لوگ صُبح سویرے دوسروں کے مکانوں کا چکر نہیں لگایا کرتے اور اگر کوئی آ بھی نکلا تو بے خوابی کا مارا ہوا گھسیٹڑ سا گنجا سا رئیس ہو گا۔“

غالباً اس سے پہلے کسی راجکماری یا اس کے مشیر کو ایسے وسوسوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہو گا۔ بہرحال ہمیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ پارس کا دولہا شبِ اوّل ہی سے گنجا ہو۔ شوہر کا شادی کے بعد دھیرے دھیرے گنجا ہو جانا برحق ہے لیکن اس کا سہاگ رات ہی کو اپنا جگمگاتا، چمکارے مارتا سر دلہن کی گود میں جا رکھنا صریح ظلم ہے۔ چنانچہ پارس کو رعایت دیتے ہوئے کہا:

"چلو۔ تم ہار ڈالنے سے پہلے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلّی کر لینا۔"

قصّہ مختصر ڈنر ختم ہونے تک ہم مس پارس کی شادی کا انتظام تو نہ کر سکے لیکن مذاق مذاق میں ہی اسے بھیگی پلکوں، گہرے سانسوں اور بہکی باتوں کی منزل سے نکال کر شیزان کی ہنستی کھیلتی روشن دُنیا میں لے آئے۔ البتہ اسے نیم شب کے قریب گھر کے دروازے پر چھوڑنے گئے تو الوداعی مصافحہ میں جتنی دردمندی ملا سکتے تھے ملا دی اور پھر لندن کی آخری رات گزارنے کو پہاڑ جیسے بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے ہوٹل کو چل پڑے۔

چار شہر اُڑتے خاکے

محبّت فرانسیسی کی بجائے مادری زبان میں کرنا چاہیے

اگلی صُبح اُٹھ کر حساب کیا تو ہماری چھٹی کے آٹھ دن باقی تھے۔ ان دنوں کو ہم نے چار ملکوں۔۔۔ فرانس، جرمنی، ترکی اور ایران۔۔۔ پر تقسیم کیا۔ ہر ایک کے حِصّے میں دو دو دن آئے۔ ہم نے جلد جلد ناشتہ کیا اور پہلے دو روز فرانس کو بخشنے کی نیّت سے، صبح کی پہلی پرواز سے عازمِ پیرس ہوئے۔

پیرس کے حسن و جمال کے قصّے بچپن سے سن رکھے تھے لیکن دس سال پہلے کی طرح اس دفعہ بھی ایئرپورٹ پر اترے تو اہلِ پیرس کو بارش اور برساتوں میں مبتلا پایا اور برساتی میں حسن و جمال کا وُہی رنگ ہوتا ہے جو حزن و ملال کا ہوتا ہے۔ یورپ کی

برسات وُہ پاک و ہند کی دھانی دوپٹوں، مستانی پینگوں اور دیوانی جوانیوں والی برسات نہیں کہ حسن بھیگ کر اور نکھرتا ہے۔ یورپ کی برسات میں حسن گیلا ہو جائے تو گدلا ہو جاتا ہے۔ پھر اہلِ پیرس سے بات کرنے کی نوبت آئی تو موسم کے حزن کے علاوہ زبان کے ملال نے بھی آگھیرا۔ لکھی ہوئی فرانسیسی پڑھی جائے تو کئی انگریزی الفاظ فرانسیسی بھیس میں بھی پہچانے جاسکتے ہیں اور توکلّ پر کُچھ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے لیکن بولی ہوئی فرانسیسی؟ خدا کی پناہ معلُوم ہوتا ہے بولنے والا یا والی شاں، شاں، شاں کررہی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ خود ایک دُوسرے کو کیسے سمجھتے ہوں گے۔ سنا کرتے تھے کہ دُنیا کی سب سے میٹھی اور اظہارِ محبّت کے لئے موزوں ترین زبان ہے تو فرانسیسی! اب اس کا صحیح جواب تو فرانسیسی میں محبّت کرنے کے بعد ہی دیا جاسکتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر فریقین دم محبّت ایک دُوسرے کے کان میں موسلا دھار شاں شاں کرنے لگیں تو اس طوفان میں محبّت کسی حد تک فروغ پائے گی اور اگر آتشِ جذبات ذرا زیادہ بلند آواز میں بھڑک اُٹھی تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا اور کیوں نہ فی الفور فائر بر گیڈ طلب کرے گا۔ بہر حال فرانسیسیوں کے متعلق تو ہم کُچھ کہہ نہیں سکتے لیکن اپنے ہم وطنوں کے لئے ہمارا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ محبّت فرانسیسی کی بجائے اپنی مادری زبان ہی میں کرنا چاہیے۔ یا زیادہ سے زیادہ رومن اُردُو میں اور بہر حال دھیمی آواز میں کہ ممکن ہے پڑوس میں کوئی بیمار ہو یا کوئی طالبِ علم امتحان کی تیاری کر رہا ہو۔

حسینانِ پیرس و خبیثانِ پیرس

وسیع و عریض پیرس کی گلیوں سے گزرنے کے بعد ہوٹل پہنچے تو ایک دھچکا سا لگا کہ ہوٹل مگر بہ تنگی چشم حسود تھا۔ کمرہ دیکھا تو پلنگ کے سامنے صرف اتنا حاشیہ بچتا تھا جس پر سلیپر ایڑیوں کے بل کھڑے ہو سکتے تھے، لیٹ نہیں سکتے تھے۔ معلُوم ہوتا تھا پلنگ رکھ کر اس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ غسل خانے کا پتہ پوچھا تو سات کمرے چھوڑ کر ایک ڈربے کی طرف اشارہ کیا گیا اور ہمیں بتایا گیا کہ ہم اس کے سات دعویداروں میں سے ایک ہیں۔ نیز آج تک کوئی دعویدار ہمسایوں سے بلوہ کیلئے بغیر غسل خانے کی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔۔۔ ہم نے اپنے فرانسیسی قیام سے غسل خارج کر دیا اور غصّے سے تپنے لگے۔ ہوٹل کا انتخاب اور ریزرویشن ہمارے لئے مس پارس نے لندن سے کیا تھا۔ جی چاہا کہ پارس سے بذریعہ فون احتجاج کریں لیکن احتجاجی فون کی فیس ہمارے غصّے کی شدت سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ فون کرنے کی بجائے غصّہ پی لیا۔ دُوسرے یاد آیا کہ خود ہم ہی نے کم خرچ ہوٹل کی تاکید کی تھی اور یہ ہماری کم نصیبی تھی کہ ہوٹل کم خرچ ہونے کے علاوہ کم ظرف بھی نکلا۔ اب اس لغزش کی تلافی کی ایک ہی صورت تھی کہ سوائے رات کے چند گھنٹوں کے اس ہوٹل سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے اور باقی وقت میں، ایک انگریزی محاورے کے مطابق پیرس کو

سُرخ پینٹ[102] کیا جائے یا۔۔۔ اگر ایک اُردُو محاورہ ایجاد کرنے کی اجازت ہو تو۔۔۔ اسے سلطانی مہندی لگائی جائے۔ ہمیں پیرس سے بہت تفصیلی آشنائی تو نہ تھی لیکن چند ایسی جگہوں کا علم ضرور تھا جہاں مہندی لگانے سے رنگ چوکھا آ سکتا تھا۔ اور معاً سب سے پہلے ہمارے ذہن میں کیفے دوماگو (LES DEUX MAGOTS) کی یاد نے آنکھ کھولی۔ جس کی موجودگی میں پیرس کی رونقوں اور رعنائیوں کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس طعام گاہ کے برآمدے کی نشستیں پیرس کی جملہ رونقوں اور رعنائیوں کے لئے سلامی کا چبوترہ تھیں۔ ہم میترو سے سیدھے سین ژرمے (ST-GERMAIN) گئے اور کیفے دوماگو کی واحد خالی کرسی پر سرِ شام قابض ہو گئے۔ بارش تھم چکی تھی۔ مطلع صاف تھا اور روشنیاں بتدریج روشن تر ہونے لگیں۔ پھر ہمارے سامنے سے حسینانِ پیرس کی پریڈ گزرنے لگی۔ ان کے ملبوس؟ ہاٹ پینٹس (HOT PANTS) دہکتی پینٹیں بلکہ اِکا دکا بھاپ دیتی پینٹ، نیچے کھولتی انگیائیں، اُوپر بولتی بلاؤزیں اور بعض اوقات نہ انگیائیں نہ بلاؤزیں فقط کھلے پٹ کی ہوادار بنیانیں ان پر شوخ رومال اور رنگیلے منکے۔ دُوسری طرف مردوں کی خودسر زلفیں اور خودرو داڑھیاں۔ مونچھیں جیسے ہر دو گوشہ لب سے جونکیں جھول رہی ہوں اور قلمیں جیسے

---

[102] PAINTING THE TOWN RED یعنی رنگ رلیاں منانا۔

کانوں سے جرابیں لٹک رہتی ہوں۔۔۔ اور اس ہزاروں کی بارات میں شاذ ہی کوئی اکیلا یا اکیلی ہے۔ ہر طرف جوڑے ہی جوڑے ہیں۔ جوڑا اگر پیدل ہے تو وُہ اپنی ہم خرام کو بازوؤں میں لپٹے رواں ہے۔ اور اگر سکوٹر پر سوار ہے تو یہ اپنے ہم جلیس کو کلاوے میں لے اڑتی جارہی ہے اور جب سامنے ٹریفک کی بتی لال ہو جاتی ہے تو ہم جلیس یک لخت سکوٹر روکتا ہے اور اس خداداد فرصت میں رخ پیچھے موڑتا ہے۔ پھر کُچھ یہ جھکتا ہے۔ کُچھ وُہ ابھرتی ہے۔ لب لبوں سے ملتے ہیں اور غیر معینہ مدت کے لئے ملے رہتے ہیں تا آنکہ کوئی تیزی کا مارا موٹر سوار ہارن دے کر بتی کے سبز ہو جانے کی خبرِ بد سناتا ہے اور پھر اس وقت تک دونوں کی بد دُعائیں سنتا رہتا ہے جب تک کہ اگلے چوک کی لال بتی نہیں آجاتی۔

اور ادھر دیکھیے یہ بی بی خلافِ معمول تنہا چلی آتی ہے۔ چلی آتی ہے حتیٰ کہ ہمارے بالکل قریب آگئی ہے۔ اللہ یہ سچ مچ کوئی فتنہ روز گار ہے بالکل ارمالا دیوس[۱۰۳] لگتی ہے۔ اگر وُہ نہیں تو اس کی سگی بہن ہے۔ ہم اسے ارماہی کہیں گے۔ اس کے گریبان کی وی (V) کی شاخوں کی کشادگی ملاحظہ فرمائیں۔ اگر یہ وی ایک سوت اور کشادہ ہوتی تو سینے کی سرکشی راز نہ رہتی۔ اور اب بھی یہ راز جو جزوی طور پر ہی سربستہ ہے، مکمل طور پر

---

[۱۰۳] اسی نام کی فلم میں ایک طوائف کا کردار جسے شرلی میکلین نے ادا کیا۔

افشا ہونے کے لئے ایک چھوٹی سی چھینک یا ہلکی سی ہچکی کا محتاج ہے۔ ارما ہماری نشتوں کے بالمقابل پہنچ کر ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے دو فرانسیسیوں نے ارما کو غور سے دیکھا۔ باہم نوٹ ملائے اور پھر اس فرانسیسی زبان میں ایک چھتا ہوا آوازہ کسا جو ہماری سمجھ میں تو نہ آیا لیکن یوں معلُوم ہوا جیسے کہتے ہوں ”کاش! تیرے گریبان کا زاویہ ذرا اور کشادہ ہوتا۔“۔ اس پر ارما نے مڑ کر انہیں سوالیہ انداز میں دیکھا اور سینے کو مزید تان کر کُچھ کہے بغیر مسکرا دی۔ لیکن جو کُچھ ارما نے نہیں کہا تھا ارما کی مسکراہٹ نے کہہ دیا اور چونکہ مسکراہٹ کی زبان فرانسیسی نہیں ہوتی، لہٰذا ہم بھی ارما کا مدُعا پا گئے۔ ارما کہہ رہی تھی

میری اتنی روشنی سے دِل و جاں سلگ رہے ہیں

میں ذرا سی لو بڑھا دوں تو یہ بزم جل نہ جائے؟

اور بلاشبہ یہ خطرہ بالکل حقیقی تھا کہ ہمارے گرد و پیش ابتدائی دھواں اُٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اتنے میں کہیں سے ایک ان دھلا لونڈا آ نکلا اور بغیر کسی تمہید کارروائی کے سالم ارما کو اپنی بازووں میں لے کر پریڈ میں شامل ہو گیا۔

تفریحی بس میں تاریخی پیرس کی سیر

دوسرے روز ہمارا قبل دوپہر کا پروگرام تاریخی پیرس کی سیر تھی۔ وقت کم تھا۔ شہر دیکھنے کے لئے تفریحی بس سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم دس بجے کے قریب جاگے اور تیس منٹ کے اندر شیو بناتے، ڈرائی کلین کرتے، ناشتہ ٹھکراتے بس میں جا بیٹھے۔ سیر کی ابتدا فرانس کے مشہور اوپرا (L'OPERA) سے ہوئی۔ اوپرا کی عمارت بے شک دِلکش تھی اور پاکستان میں ہوتی تو اور دِلکش ہوتی۔ لیکن نہیں تھی لہٰذا جب دُوسرے لوگ اندر گئے تو ہم نے یہ تکلف نہ کیا۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی ایک اور بھوکے ساتھی کے ساتھ کیفے دی لاپے (DE LA PAIX) میں۔۔۔ جس کا تاریخی غرور اپنے ہمسایہ اوپرا سے کسی طرح کم نہ تھا۔۔۔ناشتے کے لئے داخل ہو گئے اور ناشتہ کیا۔ کانٹی نینٹل ناشتے کا نشہ تو یادگار تھا لیکن اس کا جثہ بہت کم مقدار تھا یعنی ایک پیالہ چائے، ایک ٹکیہ بسکٹ، تھوڑی سی خوش آمدید اور بس! مے ایں قدر نہ بود کہ رنج خمار برد۔

ہماری اگلی منزل میڈلین چرچ تھا۔ بھدا اور بھاری بھر کم۔ یُوں تو شاہی مسجد لاہور کا نمازی ہونے کی وجہ سے جس دِل پر ایسے خوبصورت خانہ خدا کا رعب جمال چھایا ہو اس کی آنکھوں میں کسی فرنگی عبادت گاہ کی شوکت نہیں جچتی، تاہم انگلستان یا کولون کے

گرجوں اور خود فرانس کے ناٹرڈیم کے ہوتے ہوئے میڈلین جیسے ٹھوس اور ٹھلے چرچ کی نازبرداری ایسی واضح نہ تھی۔ لیکن شاید جسامت میں کُچھ کشش ضرور ہے ورنہ زمین چاند کی بجائے سُورج کے گرد نہ گھومتی، چڑیا گھر میں ہرن کی بجائے ہاتھی مرجع عوام نہ ہوتا اور ٹیلی ویژن پر الن[104] کی جگہ ننھا مرکزِ توجّہ نہ بنتا۔

میڈلین گرجے سے سلام پھیر کر کنکارڈ میدان میں پہنچے۔ یہ میدان پیرس کی مشہور شاہراہ شانزلیزے کی تمہید ہے۔ چند لمحے پہلے ہمارے گائیڈ نے کہا تھا کہ پیرس کو رومانی موڈ میں دیکھنا مقصود ہو تو بارش کے بعد پہلی دُھوپ میں اس کی وسعت پر آنکھ کھولو۔ اتفاق سے ہماری بس کنکارڈ میں داخل ہوئی تو اس کی سطح پر اس صبح کی آخری بوند برس چکی تھی اور پہلی کرن پھیل رہی تھی۔ ہم نے اپنی گائیڈ کے نسخے کے مطابق ایک دفعہ آنکھ بند کر کے اچانک کھولی کہ سامنے رومان ہی رومان ہو گا لیکن دیکھا تو آگے ٹریفک کا طوفان تھا اور رومان سے دوچار ہونے کی بجائے کسی ٹرک سے ٹکرانے کا زیادہ امکان تھا۔ بلکہ معاً ایک ٹکّر سے بچنے کے لئے ہمارے ڈرائیور نے بس کو یکلخت بریک لگائی اور نتیجتہً ہماری ایستادہ گائیڈ پاؤں سے اکھڑ کر اپنے قریب کے تین چار مسافروں کی مشترکہ

---

[104] ۷۲-۱۹۷۱ء کے ٹی وی ڈرامہ سیریز الف نون کے دو کردار: الن پتلے سے اور ننھا خوب موٹا۔

گود میں جا پڑی۔ محترمہ کے مطمئن چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں اپنے حِصّے کا رومان حاصل ہو گیا ہے۔

کنکارڈ سے شانزلیزے میں داخل ہوئے اور یہی پیرس کا دِل ہے۔ شانزلیزے سے گزرتے ہوئے ہمیں اپنے لاہور کی مال یاد آتی، وُہی چھب اور وُہی چین، وہی روپ اور وہی بانکپن۔ کوئی فروشگاہ دیکھی تو الفلاح یاد آئی، کوئی ریستوران دیکھا تو شیزان یاد آیا۔ آئزین دیکھی تو نسرین یاد آئی اور موسیو مارخیم دیکھے تو حمید ابراہیم[105] یاد آئے۔ بس میں بیٹھے کسی قدر تیزی سے گزر رہے تھے۔ ہم نے شانزلیزے سے وعدہ کیا کہ تیزی معاف ہم بعد میں تمہارے حسن کا تفصیلی تماشہ کریں گے۔ تھوڑی دیر میں ہم محرابِ فتح (ARC DE TRIUMPHE) پر جا نکلے اور آناً فاناً ٹریفک کے گرداب میں پھنس گئے۔ جس نقطے سے پوری بارہ سڑکیں پھوٹتی ہوں اور جس کے گرد ہر لمحہ کوئی بارہ سو گاڑیاں گھومتی ہوں اسے گرداب کہنا کوئی زیادتی نہیں۔ زیادتی یہ ہے کہ اس گرداب میں ایک بار پھنس کر کوئی بے زباں یا بے داغ نکل آئے۔ اور ہمارے فرانسیسی ڈرائیور کی چابکدستی نے یہ معجزہ بھی دکھلا دیا۔ بالآخر ہماری بس گرداب سے

---

[105] ہمارے خوش پوش اور خوش طبع دوست کرنل حمید ابراہیم، سابق پرنسپل لارنس کالج گھوڑا گلی۔

بائیں ہاتھ مڑ کر عجائب گھر سے ہوتی ہوئی آئفل مینار کے سایہ میں جا کھڑی ہوئی۔ پھر جملہ سیر بین بس سے اترے اور مادام گائیڈ نے آئفل مینار پر اپنا رٹا ہوا لیکچر دہرانا شروع کیا۔

فرانسیسی مرد وزن اور پاکستانی چڑیاں چڑے

ہم لیکچر سن رہے تھے کہ بغل سے ایک فرانسی عجائب فروش نے ایک ہاتھ سے خوبصورت کف بٹن دکھا کر دُوسرے سے کہنی کی اوٹ میں چند تصویرِ بتاں کی جھلک دکھائی۔ جی ہاں یہ وُہی تصاویر تھیں جن میں بتوں کے علاوہ بت پرست بھی محوِ پرستش نظر آتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ کارڈ پیرس کا تحفہ سمجھے جاتے تھے لیکن آج کے پیرس میں یہ تصویریں دکھانا دریائے سین کے کنارے بیٹھ کر تیمم کرانا ہے کیونکہ جن تصاویر کے لئے کیمروں کو کبھی خوابگاہوں کے روزن تلاش کرنے پڑتے تھے، وُہ اب پارکوں میں بالمشافہ کھینچی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ہنگامِ تصویر کشی کیمرہ مین طرفین سے مسکراہٹ کی فرمائش بھی کر سکتا ہے۔ آج کل پیرس کے بیڈ روم بتدریج پھیل کر سڑکوں اور بازاروں کو دامن میں لے رہے ہیں اور اکثر فرانسیسی جوڑے جملہ مراحلِ محبّت پارکوں ہی میں طے کرتے ہیں۔۔۔ ان لوگوں کے مقابلے میں تو پاکستانی چڑیاں چڑے بھی زیادہ خلوت پسند واقع ہوئے ہیں۔۔۔ بہر حال ہم نے کارڈ فروش کو کسی

قریبی پارک میں جا کر بنٹے کھیلنے یا انگوٹھا چوسنے کا مشورہ دیا اور خود مادام گائیڈ کے منہ سے آئفل مینار کی تاریخ سننے اور بھلانے لگے۔ عجائب کو صرف دیکھنا اور دیکھ کر لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ان کی لمبائی چوڑائی کے کوائف گھر میں بیٹھ کر کتابوں میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔

آئفل مینار سے آگے ہماری منزل نپولین کا مقبرہ تھا جسے انو پلید بھی کہتے ہیں۔ دراصل یہ تغیر پیدائشی مقبرہ نہیں۔ کبھی لوئی چہاردہم کے سپاہیوں کی اقامت گاہ تھی۔ نپولین نے اسے موت کے بعد فتح کیا اور ایسا اندر داخل ہوا کہ اب اس کے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ نپولین کی طرف سے مکان خالی کرنے میں اب بھی مزاحمت کا امکان ہے بلکہ یہ کہ ممنون فرانسیسی اپنے نامور ہیرو کو ایسی عالیشان عمارت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ اپنی فتوحات کی بدولت نپولین اس مقبرے کا مستحق بھی ہے۔ نپولین ان آمروں میں سے نہیں تھا جن کی زندگی کی جملہ فتوحات ایک دو بنگلوں، دو چار کارخانوں اور پانچ سات عصمتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو اخباروں کے خاص ضمیمے چھپوا کر اپنی عظمت کی ہفتہ وار یاد دہانی کراتے رہتے ہیں۔ انہیں مرنے کے بعد مقبرہ تو کیا قابلِ شناخت قبر بھی مشکل سے میسر ہوتی ہے۔ ان سب باتوں سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اپنی عظمت کے اندازے میں غیر ضروری تیزی نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے لئے پہلے مرنے کی ضرورت ہے کہ اندازہ کرتے وقت ساری رقمیں

حساب میں لی جا سکیں۔ پھر یہ حساب عموماً ٹھیک بیٹھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے ملک میں سینکڑوں بڑے آدمی مر چکے ہیں لیکن قوم نے صرف دو ہی مقبرے تعمیر کئے ہیں: ایک لاہور میں اور دوسرا کراچی میں۔

مونالزا کھمبا نوچنا چاہتی ہے

آپ کے سامنے مشہورِ عالم عجائب گھر لوور ہے جس میں لاکھوں نوادر رکھے ہیں لیکن روایت محض اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مونالزا کی تصویر بھی دھری ہے۔ دانشوروں کا مقولہ ہے کہ اگر آپ نے پیرس جا کر مونالزا کی تصویر نہیں دیکھی تو آپ کا ذوق مشکوک ہے اور سفر مجہول۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم نے ڈٹ کر پیرس دیکھا۔ ڈٹ کر لوور کا عجائب خانہ بھی دیکھا مگر مونالزا سے اجتناب کیا۔ اور وجہ یہ نہیں کہ ہم دانشوروں کی توقعات پر پانی پھیرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ یہ ایک علیحدہ کارِ ثواب ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہم مونالزا کا مان توڑنا چاہتے تھے۔ اصل میں اس عورت کو لوگوں نے بلاوجہ بگاڑ رکھا ہے، اس کی مسکراہٹ کی داد کچھ اسی انداز سے دی جاتی ہے جیسے ہمارے مشاعروں میں طرفدار لوگ اپنے پیاروں کے گھٹیا شعروں کی دیتے ہیں: سبحان اللہ! مکرر! اور پھر شاعروں سے زیادہ سامعین مشاعرہ کرتے ہیں۔ کوئی مغربی طرفدار مونالزا کی مسکراہٹ پر ایک دفعہ واہ واہ کہہ تو بیٹھا ہے۔ اب باقی سامعین

روکے نہیں رُکتے۔ حالانکہ سچ پوچھیں تو مونالزا ایک گھامڑ سی خاتون ہے جو کھسیانی سی مسکراہٹ مسکرا رہی ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ آج بھی اگر یہ تصور کسی کھمبے کے ساتھ کھڑی کر دی جائے تو مونالزا تصویر سے نکل کر کھمبا نوچنا شروع کر دے۔ لیونارڈو دونچی نے اس سے بہتر تصاویر بھی بنائی ہیں اور اس تصویر میں بھی مونالزا کے ہونٹ نہیں، دونچی کی شہرت مسکرا رہی ہے۔ ورنہ مونالزا تو بے چاری وہی خاک ہے جو تھی۔ بلکہ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ مونالزا کی تصویر مونالزا سے قدرے بہتر ہے۔ اکثر تصویریں اپنی مونالزاوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ ہم نے زندگی میں فقط دو چیزیں ایسی دیکھی ہیں جو اپنی تصویروں سے زیادہ خوبصورت نکلیں: ایک تاج محل اور دُوسری غزالہ۔ اور دونوں کو علم نہیں کہ ہم نے انہیں کس حال میں دیکھا۔ مگر او خدایا، ہم مونالزا سے کہاں آ گئے؟ تاج محل دیکھ کر ہم شاہجان کے غم میں کھو گئے اور غزالہ کی دید نے ہمیں اپنا غم دے دیا۔ لیکن حاشا۔ ہم شکایت نہیں کر رہے۔ نہ تاج محل کو پشیمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ غزالہ کو کہ

نہ ہی غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گلہ کریں

یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دِل میں کبھو کی ہے

گلے ملنا مستحسن فعل ہے مگر

تاریخی پیرس کے بعد ہم نے تجارتی پیرس کو توجہ دی۔ یُوں تو ہم جملہ ضروریات اور تحائف وغیرہ لندن سے ہی خرید لائے تھے تاہم تبرکاً کُچھ پیرس کی نشانی بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ خصوصاً بیگم کے لئے مہکتے مسکراتے پیرس کا برگِ سبز بھی نسوانی دُنیا میں پارہ زمرد کی تاثیر رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم پیرس کے ایک مشہور ڈیپارٹمنٹل سٹور میں گئے۔ قریب ترین کونٹر پر رنگ رنگ کے خوبصورت سویٹر رکھے تھے۔ ہم نے سیلز گرل کو سویٹر دکھانے کو کہا۔ وُہ خود تو ہماری انگریزی سمجھ نہ سکی مگر شتابی سے ایک اور سہیلی کو پکڑ لائی جو انگریزی بھی بول سکتی تھی۔ انگریزی داں لڑکی مسکراتی آئی تو اپنی انگریزی دوانی کی اہمیت ہی سے نہیں، شکل و صورت سے بھی انتخاب نظر آئی۔ بالکل برشی باروت لگتی تھی۔ ہم سے انگریزی زبان مگر فرانسیسی لہجے میں بولی:

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

”مُجھے ایک زنانہ سویٹر چاہئے۔“

”اپنی لیڈی کے لئے۔“

یہ سوال غیر ضروری تھا لیکن بڑی تواضع سے پوچھا گیا تھا لہٰذا ہم نے بھی مناسب خوش مزاجی سے جواب دیا:

"جی ہاں۔۔۔ بالکل۔"

"کیا سائز ہے؟"

اور ہمیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ سویٹر خریدنے سے پہلے اس کا سائز معلُوم ہونا چاہیے جو ہمیں معلُوم نہ تھا۔ ہمیں اپنی سادہ لوحی کا احساس ہوا اور معافی مانگ کر لوٹنے ہی کو تھے کہ برشی بولی۔

"ٹھہریئے۔"

اور فرانسیسی میں ذرا بلند آواز سے کسی کو پکارا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف اونچائیوں اور گولائیوں کی چھ لڑکیاں اپنے کونٹر چھوڑ کر ہمارے سامنے سینہ تان کر قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ برشی نے ہمیں دعوت دی۔

"موسیو۔۔۔ ان لڑکیوں کو دیکھیں اور بتائیں کہ ان میں کس کا سائز آپ کی بیگم کی یاد دِلاتا ہے۔"

لڑکیاں دیکھنا شروع کیں تو جس پر نگاہ پڑتی، اسی کا کرشمہ دامن دِل کھینچ کر کہتا کہ جا اینجاست۔ اور بیگم کی یاد کی طرف بڑھنے نہ دیتا۔ کسے چنتے اور کسے رد کرتے؟ کُچھ فیصلہ ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ آخر ہم نے ناکامی اور نفی میں سر ہلا دیا لیکن اس پر بھی برشی مایوس نہ ہوئی۔ وُہی فاتح عالم مسکراہٹ لئے بڑی بے تکلفی سے آگے بڑھی اور ہمارے روبرو دو ملی میٹر کے فاصلے پر آ کھڑی ہوئی۔ پھر آرام سے ہمارے بازوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہمیں دعوتِ پیمائش دی۔ جو نہی ہمیں برشی کے منصوبے کا اندازہ ہوا ہم نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:

"میڈیم موزیل، مجُھے اتنے صحیح ناپ کی ضرورت نہیں۔ بس اپنے ہی سائز کا سویٹر دے دیں۔"

ہم نے اتنی جارحانہ سیلز مین شپ[۱۰۶] کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گلے ملنا بنیادی طور پر بے شک مستحسن عمل ہے لیکن اس کے پیچھے کُچھ شوق، کُچھ محبّت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وُہ گلے ملنا کس کام کا جس کا محرک سویٹر فروشی کا جذبہ ہو۔ بہر حال صحیح یا غلط؟ ہم نے برشی کے سائز کا سویٹر خرید لیا لیکن جب برشی نے سویٹر کا بل پیش کیا تو محسوس ہوا کہ

---

[۱۰۶] SALESMANSHIP مال فروشی۔

اس میں جتنی قیمت سویٹر کی ہے اتنی ہی فیس معانقہ بھی شامل ہے۔ یعنی دو قدم پیچھے ہٹنے کا قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

سویٹر کا بل ادا کرنے کے بعد ہمارے مزید شاپنگ کے عزائم کُچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ چنانچہ ہم نے خالی ہاتھ شانزالیزے کا الوداعی چکر لگانے کا فیصلہ کیا اور جب تھک گئے تو کھانے کے لئے ایک جگمگاتے ریستوران میں داخل ہو گئے جہاں ایک جھلملاتی ویٹریس یا میزبانہ نے ہمارا خیر مقدم کیا ہمیں میز تک لے گئی اور ہمارا آرڈر لیا۔ لیکن جب کھانا لائی تو اس میں یہ ریستوران والی جگمگاہٹ تھی نہ میزبانوں والی جھلملاہٹ۔ بالکل بے رنگ اور بے جان سا پکوان تھا۔ بلکہ سچّی بات تو یہ ہے کہ پکوان سے کہیں زیادہ میزبانہ غذائیت سے بھرپُور نظر آتی تھی۔ لیکن نیک بخت کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ہماری بھوک کے سائز کے متعلق استفسار کرتی حالانکہ یہ بھی برشی کے شہر میں رہتی تھی۔ ناچار ہم کھانا ہی کھا کر ہوٹل لوٹ آئے۔

اگلی صُبح جرمنی جانا تھا۔ صُبح سویرے اُٹھ کر تیاری شروع کی کہ پیرس کا قیام ہمیں کُچھ موافق نہیں آرہا تھا لیکن تیاری کے تیس منٹوں میں پیرس نے ہمیں تین نئے چرکے لگا دیئے۔ شیو کے بعد نہانا چاہا تو یاد آیا کہ اس عیش کے ہم ایک ہفتے تک مستحق نہیں۔ ناچار ہم نے خشک تولیے سے تیمم کر لیا۔ پھر بڑھیا ناشتہ لائی تو اتنا قلیل کہ اگر کسی

خوددار تیتر کے آگے رکھ دیا جاتا تو احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دیتا۔ ہم رات کے بھوکے تھے۔ چنانچہ ناشتہ تو کھالیا لیکن تیتروں کے غائبانہ طعنے مسلسل سنتے رہے کہ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی وغیرہ وغیرہ لیکن ہم نے کہا: اقبال کی اور بات ہے مگر ہم ایسے پیغام تیتروں کی زبان نہیں سنا کرتے۔

پھر بل ادا کیا اور ایئر ٹرمینل تک جانے کے لئے ٹیکسی طلب کی لیکن ٹیکسی والے نے سیدھا منزلِ مقصود کو لے جانے کی بجائے گولہ پھینکنے والوں کی طرح پہلے تو تین چکر ہمارے ہوٹل کے گرد لگائے اور پھر ایک میل کے پانچ میل بنا کر ایئر ٹرمینل پر جا پہنچا۔ ہم نے انگریزی میں احتجاج کیا تو وُہ فرانسیسی میں چنگھاڑا۔ ہم نے چپکے سے کرایہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ ہم چار پیسوں کی خاطر فرانس اور پاکستان کے تعلقات نہیں بگاڑنا چاہتے تھے حالانکہ فرانس نے ہمارے مزاج سنوارنے کا۔۔۔ بااستثنائے برشی۔۔۔ کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔

کارلی نے اپنے پیشرو کی کرسی مع سکیٹری سنبھال لی

ایئر ٹرمینل سے ایئر پورٹ پہنچے اور بخیریت۔ پیرس میں اتنا فاصلہ بخیریت طے کر لینا غنیمت تھا کہ اس شہر میں ایک گھنٹے کے سفر میں جیب کٹ جانے سے لے کر دِل لُٹ جانے تک سب کُچھ ممکن تھا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے تو قریب کی نشست پر ایک شکل

مانوس نظر آئی۔ اور غالباً ہم بھی اسے اتنے ہی مانوس لگ رہے تھے کہ باہم آنکھیں چار ہوئیں تو کافی دیر چار رہیں۔ پھر وُہ صاحب ضبط نہ کر سکے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر بولے:

"گڈ مارنگ۔۔۔ معلُوم ہوتا ہے ہم کہیں پہلے مل چکے ہیں۔"

اور اس شخص کا زبان کھولنا تھا کہ ہم نے پہچان لیا۔ آج سے دس سال قبل جب ہم جرمنی میں امریکی فوج کے مہمان تھے تو ہمارے میزبان ڈاکٹر سٹوارٹ کا ایک اسسٹنٹ ہوا کرتا تھا جو شکل سے پاکستانی، نسل سے یونانی، پرورش میں امریکی اور لہجے میں یینکی لگتا تھا اور فالتو وقت میں ہمیں بیس گز کی سیڈرین[107] میں ڈاؤن ٹاؤن فرینکفرٹ اور ہائیڈل برگ کی سیر کرایا کرتا تھا۔ اچھا خاصا پیچیدہ سا نام تھا: سکیلکارلس جو بالکل جنزک نام لگتا تھا۔ یُوں بھی یونانی باپ دادا رکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ بہر حال ہم اسے مذاقاً سکائی لارک پکارا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک مصنوعی مگر خوشگوار حیرت کے عالم میں پوچھا: "تم سکائی لارک تو نہیں ہو؟"

---

[107] امریکی بڑی کاروں کے لئے SEDAN کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اور جونہی اس نے اپنا خاص نام سُنا اسے خاص نام دینے والا یاد آ گیا۔ ہاتھ چھوڑ کر گلے لگ گیا اور اشتیاق بھرے لہجے میں بولا:

"مسٹر خان! بے شک یہ بہت چھوٹی دنیا ہے[۱۰۸] اور آپ سے یُوں ملنا کس قدر کم یاب مسرت ہے؟"

کہا: "کُچھ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ صرف تم نے اظہارِ مسرت میں ذرا پہل کر لی ہے۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ یہاں کیسے؟"

"اس میں تعجّب کی کون سی بات ہے۔ پیرس اکثر شریف مسافروں کے راستے میں پڑتا ہے۔ تم کہو تم یہاں کیسے؟"

"تو کیا میں شریف مسافر نہیں ہوں؟ بہر حال میں ویک اینڈ کے لئے پیرس کو ذرا سُرخ پینٹ کرنے آیا تھا۔" اور یہ کہہ کر مصنوعی قسم کی بد معاشانہ کھانسی کھانسا۔

"آپ نے دیکھا کس طرح بڑے آدمی ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔"

ہم نے کہا: "سُرخ پینٹ لے کر سیدھے واشنگٹن سے پیرس آئے تھے؟"

---

[۱۰۸] IT IS A SMALL WORLD یہ انگریزی کا محاوُرہ اس موقع پر بولا جاتا ہے جب کوئی آشنا صورت کسی غیر متوقع جگہ پر مل جائے۔

بولا: ”نہیں فرینکفرٹ سے۔ ہاں یہ تو آپ کو بتانا بھول ہی گیا کہ ڈاکٹر سٹیورٹ ریٹائر ہو گئے ہیں اور اب وُہ کرسی میں نے سنبھال لی ہے۔“

ہم نے کہا: ”مبارک باد، مگر ڈاکٹر سٹیورٹ کی کرسی ہی سنبھالی ہے یا سیکرٹری بھی؟“

سکیلارلس نے (جس کا پیٹینٹ نام کارلی تھا) سر سمیت آنکھیں مٹکائیں۔ اشارہ دس سال قبل کی اس کیفیت کی طرف تھا جب کارلی اپنے بوڑھے باس کی شعلہ بدن سیکرٹری جینیفر کی نگاہِ التفات کے لئے دن بھر ہدیۂ دِل پلیٹ میں رکھے اس کے گرد گھومتا رہتا تھا اور وُہ جفا گر اسے ایک تنکے سے زیادہ گھاس نہ ڈالتی تھی۔ مثلاً جینیفر سگریٹ سلگانا چاہتی تو کارلی جھٹ لائٹر پیش کرتا جسے جینیفر کبھی قبول بھی کر لیتی اور پھر کارل غریب سگرٹ لائٹر کے شعلے میں اپنے دِل کی آتش بھی شامل کر دیتا لیکن جینیفر کو ذرا تپش محسوس نہ ہوتی۔ اب جو اچانک یاد دلائی تو ہنس کر بولا:

”ارے جینی؟ وُہ تو گزشتہ دس سالوں میں چار خاوند عبور کر چکی ہے۔“

”تو پھر کیا گزارا ہے تمہارا؟ کوئی بیوی تو تمہارے ساتھ نظر نہیں آ رہی۔“

”بیوی تو فی الحال کوئی نہیں۔۔۔ البتہ سیکرٹری خدا نے دے رکھی ہے۔“

ہم نے بیتابی سے پوچھا: ”کیسی ہے؟“

خاکساری سے بولا: ''گزارا ہے۔ بہر حال فرینکفرٹ جا کر دیکھ لینا۔ اور ہاں کل لنچ میرے ساتھ کھانا۔۔۔ میں بارہ بجے سیڈین بھیج دوں گا۔''

کارلی ان کم یاب لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ باتیں کرنے میں بلا وقفہ لطف آتا ہے۔ یُوں جیسے دو تین برسوں کے بعد کوئی پیالہ بھرتا جائے اور خالی نہ ہونے دے۔ یہ بھرا پیالہ تھامے ہم پیرس سے فرینکفرٹ پہنچے۔

یہ ارض جرمنی ہے

دمِ پرواز ہم اس قدر خوش تھے کہ ہمارا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا اور ارضِ جرمنی پر پاؤں رکھا تو ہم خوشی سے اڑنے لگے۔ دراصل جرمنی کی فضا ہی کُچھ فرحتِ ساماں سی ہے۔ وُہ اس کی صاف ستھری طویل و عریض شاہراہیں، وُہ اجلے اجلے جلی حروف میں سائن بورڈ وُہ بھاری بھر کم دوہرے بار بردار ٹرک، وُہ ہلکی پھلکی تیز رفتار مرسیڈیز کاریں۔ وُہ اونچے لمبے درختوں کے امنڈتے چھاتے، وُہ گہری سبز گھاس کے پھیلتے قالین۔ وُہ ہر چیز کا ستھرا پن، سوُہنا پن اور بانکپن۔ ارضِ جرمنی پہلی نگاہ پر یُوں نظر آتی ہے جیسے ابھی ابھی بیوٹی سیلون سے بن ٹھن کر نکلی ہو۔ ہٹلر بے شک دیوانہ تھا ورنہ اتنی خوبصورت سرزمین کو جنگاہ نہ بناتا۔ اس خطۂ عرض کے حسن کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی حدود کے اندر پٹاخہ چھوڑنا بھی عروسِ فطرت کی سمع خراشی سمجھا جائے۔

ائیر پورٹ پر کارلی کو لینے کے لئے سیڈین آئی ہوئی تھی۔ اس نے تواضع کی رو میں ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا اور گھر جانے سے پہلے ہمیں اپنے ہوٹل میں چھوڑتا گیا۔ ہوئی دیکھا تو ایسا ہی تھا جیسے جرمنی کے ہوٹل کو ہونا چاہیے تھا۔ یعنی بالکل فسٹ کلاس جس میں ایک کشادہ اور آراستہ کرنے کے ساتھ ایک ایسا دِلکش غسل خانہ بھی شامل تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کپڑے اتار پھینکنے اور نہا لینے کو جی چاہتا تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اپنے جی کا کہا نہ مانتے۔ چنانچہ نہائے اور اس زور سے کہ پیرس کی دو روزہ نحوست ایک وار میں اتار پھینکی۔

سر منڈاتے ہی روٹھی رن منانا پڑ گئی

اب فرینکفرٹ میں ہماری تین مصروفیتں تھیں۔ ایک تو وُہی جو آپ کو پہلے ہی معلُوم ہے: کارلی کے ساتھ لنچ کھانا، لیکن یہ آنے والے کل کی بات تھی۔ دُوسرے اور آج ہی ایک دس سال پہلے کے پرانے پیارے، خوش مزاج اور مہمان نواز امریکی دوست کرنل مارک مرفی اور اس کی خوبصورت مگر تیز مزاج جرمن بیوی ریناتہ سے ملنا اور تیسرے حسبِ معمول کُچھ شاپنگ، کُچھ شغل اور کُچھ آوارہ گردی کرنا۔ نہانے کے بعد ہم نے فون اُٹھایا اور بسم اللہ کرنل مرفی سے کی۔ ویسے ہم نے اسے لندن ہی سے اپنی آمد کی اطلاع دے رکھی تھی۔ فون کے جواب میں بولا:

”تم آ گئے؟ اچھا ہوا۔ اسی وقت آجاؤ، مُجھے ایک ہمدرد کی فوری ضرورت ہے۔“

ہم بِدک سے گئے اور کہا: ”ہمدرد؟ خیر تو ہے؟“

بولا: ”تم آؤ تو سہی۔ مُجھے مل کر تو شاید تم ایسے خوش نہ ہو گئے لیکن مُجھے بہت خوشی ہو گی۔“

حیران تھا کہ ہوا کیا۔ مارک کی آواز میں مہمان نوازی تو شاید تھی لیکن خوش مزاجی سُنائی نہ دی۔ بہر حال گیا تو دروازے پر انتظار کرتا پایا اور اس مسکراہٹ کے باوجود جو اس نے ہمارے مقدم میں پیدا کی خاصا خستہ حال نظر آیا۔ غور سے دیکھا تو آپ کے چہرے پر بڑی واضح اور خوش خط خراشیں نظر آئیں۔ ہمیں شک سا ہوا کہ کہیں یہ بھابھی ریناتہ کے ناخنوں کی تحریر نہ ہو۔ ہم نے خراشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا شرارتاً پوچھا:

”صاحب بہادر۔ نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا۔“

جواب میں مارک ہم سے لپٹ گیا اور ایک گھُجی سی ہچکی کے بعد بولا:

”ہم لڑ پڑے ہیں۔“

اس ''ہم'' کے صیغے میں کرنل صاحب اور ان کی بیوی شامل تھے۔ گویا ہمارے شک کی تائید ہو گی اور یہی ان کے لپٹنے کی وجہ تھی۔ جس آدمی سے اس کی بیوی لڑ پڑے اسے دوسروں پر بڑا پیار آتا ہے۔ غریب چاہتا ہے کہ ہر ایک سے گلے مل کر روئے۔ ورنہ عام حالات میں یہی کرنل مارک مرفی ہم سے مردانہ وار ہاتھ ملایا کرتے تھے اور اپنی بپتا بیان کرنے کی بجائے ہم سے خیریت مزاج دریافت کیا کرتے تھے۔ اب کرنل کو ہم سے ہمدردی کی توقع تھی۔ جس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم بھی اس کے ساتھ مل کر آہ وزاریاں شروع کر دیتے اور کرنل صاحب کا بیڑا مزید غرق کرتے اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اسے کُچھ جسمانی اور کُچھ ذہنی گدگدی کرتے اور غریب کو رنج و محن کے گہرے گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ہم نے اس کے دُکھتے ہوئے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا:

''پھر لڑ پڑے ہو؟ شاباش۔ پھر راضی بھی ہو جاؤ کہ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے۔۔۔''

''یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ وُہ لڑ کر چلی بھی گئی ہے۔''

''تو کیا برلن وال پار کر گئی ہے۔ لاؤ فون، میں روسی سفیر سے بات کرتا ہوں۔''

''پھر مذاق؟ وُہ یہاں کسی ہوٹل میں گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک سوٹ کیس تھا۔''

”تو پھر وُہ آج نہیں تو کل ضرور لوٹ آئے گی۔ کوئی عورت صرف ایک سوٹ کیس کے ساتھ مستقل طور پر ناراض نہیں رہ سکتی۔“

بولا: ”وُہ خود کبھی نہیں لوٹے گی۔“

اور پھر ہمارا بازو تھام کر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا:

”خان۔۔۔ تم اسے منا کر نہیں لا سکتے؟ پلیز“

لیجئے ہم گھر سے جرمنی کی سیر کو نکلے تھے اور جرمنی میں سر منڈاتے ہی روٹھی رَن (عورت) منانا پڑ گئی جو کسی طور سیاحت کے ذیل میں نہیں آتا تھا ورنہ کوئی ایسا واقعہ ہیون سانگ کو بھی پیش آیا ہوتا۔ بہر حال جب ہم نے لندن سے مرفی کو خط لکھا تھا تو ہمارا خیال تھا کہ میاں بیوی ہمارے لئے چشم براہ ہوں گے اور حسبِ سابق پھُولوں اور پھلجھڑیوں کے ساتھ ہمارا استقبال کریں گے۔ اگر دیکھا تو بے چارے کرنل کے پھُول مرجھا چکے تھے اور پھلجھڑی جھڑ چکی تھی۔۔۔ بہر حال کرنل کی درد بھری درخواست کو ہم مذاق ہی مذاق میں فائل نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے لئے کوشش واجب تھی چنانچہ پوچھا:

”معلُوم ہے کس ہوٹل میں گئی ہے؟“

”یقین سے تو نہیں کہہ سکتا! البتہ پچھلی دفعہ ہوٹل پارک میں گئی تھی۔“

”تو ایک مرتبہ پہلے بھی روٹھ چکی ہے؟“

”جی نہیں، سات مرتبہ!“

ہم نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا: ”ٹھیک ہے۔ ہمیں ہوٹل پارک لے چلو۔ اگر ریناتہ وُہیں ہوئی تو ہمیں ہوٹل میں اتار کر تم کہیں گم ہو جانا۔“

”گم ہونے کی بجائے وُہیں ہوٹل کے دروازے پر تم دونوں کا انتظار کرتا رہوں تو کیا حرج ہے؟“

”حرج یہ ہے کہ اگر ریناتہ نے تمہیں ہوٹل کے دروازے پر دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کا شوقِ تحریر تمہارے چہرے پر نئی سطروں کا اضافہ کر دے اور عبارت آگے ہی کافی گنجان ہے۔“

کرنل مرفی نے اتفاق میں سر ہلایا، چہرہ سہلایا اور کہا:

”ٹھیک ہے میں گھر آجاؤں گا اور آپ کا انتظار کروں گا۔“

ہم نے اپنے دوست کی فراست کی داد دی: ”شاباش، تم بڑے معاملہ فہم دوست اور زن شناس شوُہر ہو۔“

کرنل مرفی ہمیں پارک ہوٹل کے دروازے تک لے گئے۔ ریسیپشن سے پتہ چلا کہ مسز ریناتہ مرفی اسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ ہم نے مارک کو ٹاٹا کیا اور خود ریناتہ کے کمرے کو چل پڑے۔ دروازے پر دستک دی تو ریناتہ نمودار ہوئی۔ ذرا جھجھکی اور پھر اسی روایتی جملے سے ہمارا خیر مقدم کیا:

"آہا! مسٹر خان۔ آپ کا آنا کس قدر خوشگوار سرپرائز ہے۔"

ہمارا یُوں ٹپک پڑنا سرپرائز ضرور تھا لیکن اس کی خوشگواری خاصی مشکوک تھی کیونکہ ریناتہ نے تو دروازہ اس توقع پر کھولا تھا کہ باہر کرنل مرفی حسبِ معمول دست بستہ کھڑا ہوگا۔ بہرحال ہم نے اپنی بھاوج کی سرپرائز کو سچ مچ خوش گوار کرنے کی کوشش کی اور کہا:

"مسز مرفی، آپ کو ملنا ایک ایسی مسرت ہے جس کے لئے فرینکفرٹ کے جملہ ہوٹلوں کی تلاش جائز ہے۔"

ریناتہ نے اپنا خراج پا لیا تو مسکراتے ہوئے بولی:

"شکریہ۔ مگر آپ کو یہ کیسے معلُوم ہوا کہ میں اس ہوٹل میں ہوں؟"

"علمِ نجوم کے زور سے۔۔۔" ہم نے کہا اور نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

"سچ۔۔۔" ریناتہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نجوم کے علاوہ کُچھ مارک نے بھی مدد کی تھی۔"۔ ہم نے سچّی بات کہ دی۔ مارک کا نام سنتے ہی ریناتہ کے نتھنوں سے دو ننھے سے شعلے نکلے۔ بولی:

"تو آپ اس سے مل چکے ہیں؟"

"نہ ملنے کے برابر۔ میں گیا تو وُہ سامان باندھ کر ایئر پورٹ کو جا رہا تھا۔"

"ایئر پورٹ؟ کس لئے؟" ریناتہ نے چونک کر پوچھا۔

"امریکہ جا رہا تھا۔ تیزی میں تھا۔ کہتا تھا جہاز کے جانے میں چند ہی منٹ باقی ہیں۔"

اب اس کے جواب میں ریناتہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ "جائے جہنم میں۔" مگر اس نیک بخت خاتُون نے وُہی کُچھ کہا جس کی توقع پر ہم نے یہ بے ضرر جھوٹ بولا تھا۔

"مسٹر خان۔ پلیز روکو اسے۔ وُہ مجھ سے خفا ہو کر جا رہا ہے۔"

ساتھ ہی ریناتہ کے نتھنوں کے دو ننھے شعلے بجھ گئے اور اس کے دو نینوں میں نیر بھرنے لگا۔ اتنا فوری انقلاب چلی کے علاوہ ایک عورت کے چہرے پر ہی آ سکتا ہے۔ بہر حال ہم نے مسز مرفی کو یاد دلایا:

"لیکن آپ بھی تو مارک سے خفا ہیں نا؟"

ریناتہ گھگھیا کر بولی:

"میں کوئی خفا نہیں مسٹر خان۔ مُجھے اس سے محبّت ہے۔ پلیز دیر نہ کرو۔ چلو ایئر پورٹ۔"

اور پیشتر اس کے کہ ہم کُچھ کہتے ریناتہ ہمیں کُچھ کر ٹیکسی تک لے گئی اور ہم ائیر پورٹ کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے خاموشی توڑنے کے لئے کہا:

"مسز مرفی۔ یہ آپ دونوں کی ناراضگی کیسی؟"

بولی: "آج تک لڑنے کے بعد مُجھے منا لے جاتا تھا۔ مُجھے معلُوم نہ تھا کہ میں اسے اس حد تک دق کر دوں گی۔ او مسٹر خان، سب غلطی میری تھی۔"

اور معاً ریناتہ کے مُنہ سے پیاری سی چیخ نکلی اور ہمیں کندھے کے ساتھ سر کے ٹکنے کا احساس ہوا۔۔۔ کوئی پندرہ منٹ میں ہم ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ٹیکسی سے اترے تو ریناتہ بھاگ کر دفتر معلُومات میں گئی اور ایک سانس میں کلرک سے پوچھ ڈالا:

"نیو یارک جانے والا جہاز جا تو نہیں چکا؟"

کلرک نے سر جھٹک کر دائیں طرف بورڈ کو دیکھا اور پھر اپنی گھڑی دیکھ کر بولی:

"اسے ٹیک آف کیے کوئی تیس منٹ ہو چکے ہیں۔"

ہم ریناتہ کے پیچھے ہاتھ پھیلائے اس انتظار میں کھڑے تھے کہ اگر ریناتہ ناموافق جواب سُن کر لڑکھڑا جائے تو اسے تھام سکیں۔ قصّہ مختصر اسے تھاما اور مزید حوصلہ افزائی کے لئے کہا:

''مسز مرفی۔ اگر جہاز گئے آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے تو ہو سکتا ہے کہ مارک نے جہاز مس کر دیا ہو۔''

ریناتہ بولی: ''تو پلیز چلو گھر چلیں۔''

اور گھر گئے تو آگے مارک مرفی صاحب اپنا سا مجروح مُنہ لئے بیٹھے تھے لیکن ریناتہ کے لئے اب یہی مُنہ یوسف گم گشتہ کا مُنہ تھا۔ زلیخا سے کہیں زیادہ بے تابی کے ساتھ اپنے یوسف سے لپٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے اپنے لبوں سے اس کے لب ڈھونڈنے لگی۔ کرنل مرفی نے بھی، ہمیں آنکھ مارتے ہوئے، مناسب اور مساوی جواب دیا مگر بے چارہ حیران تھا کہ یہ کیا اور کیسے ہو رہا ہے۔ ہم نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''مارک۔ تم تو امریکہ جا رہے تھے۔ کہیں جہاز تو مِس نہیں کر دیا؟''

مارک نے مدّعا پایا تو ایک لمحے کے لئے بوسے سے الگ ہو کر بولا:

”اویس۔ میں دو تین منٹ دیر سے پہنچا تھا اور شکر ہے دیر سے پہنچا۔“

اور اپنی جملہ توجہ کا رخ ریناتہ کے رخ کی طرف موڑ دیا لیکن اب جب کہ میاں بیوی باہمی دلچسپی کے امور پر کھلے بندوں تبادلۂ التفات کر رہے تھے۔ ہمارے لئے اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی فلمی دُھن گنگنائیں اور گنگنائی:

”یُوں ہی پہلو میں بیٹھے رہو، آج جانے کی ضد نہ کرو“

ایک مدّت کے بعد پیار کا مطلع صاف ہوا تو مدّت کے روٹھے ہوؤں کو ثالث بالخیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دفعتاً ہم سے بھی لپٹ کر، باستثنائے بوسہ، اسی زور سے اظہارِ معذرت کرنے لگے جس زور سے باہم اظہار محبّت کر چکے تھے اور کہانی پھر وُہیں سے شروع ہوئی جہاں سے شروع ہونا چاہیے تھی یعنی اس چائے سے جس پر میں بلایا گیا تھا۔ لیکن اب یہ محض دودھ چینی والی چائے نہ تھی۔ ہمارے میزبانوں نے ہمارے آگے دِل کھول کر رکھ دیئے۔ ہم نے اتنا ممنون خاوند زندگی بھر نہ دیکھا تھا اور نہ اتنی متشکّر بیوی! رات گئے ہم نے دوستوں سے رخصت لی تو محسوس ہوا کہ گلی میں شاہ سویڈن ہمارے لئے نوبل پیس پرائز لئے کھڑے ہیں۔

یہ جاپانی بغیر چابی کے چلتے ہیں

دوسری صُبح جاگ کر ناشتے کے لئے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہال میں جاپانی آئے ہوئے ہیں۔ یعنی کُچھ اسی تعداد اور انداز میں جیسے ٹڈی دل آیا کرتا ہے: بے شمار مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اور ہر ایک اپنے گلے میں دو چار کیمرے اور ایک آدھ دوربین لٹکائے ہوئے۔ معاً ذہن میں سوال اُٹھا کہ کیا یہ سب کے سب جیتے جاگتے حقیقی جاپانی ہیں یا پلاسٹک کے گڈی گڈے۔ کیونکہ اتنی تعداد میں اصلی جاپانیوں کا جاپان سے باہر یکمشت پایا جانا باور نہ آتا تھا۔ لیکن بھیڑ سے گزرتے ہوئے ایک دوسے ہمارے دست و بازو چھو گئے تو گوشت پوست کا احساس ہوا۔ سو یہ سچ مچ زندہ اور چابی کے بغیر چلنے والے جاپانی تھے لیکن لگتے گڈے ہی تھے۔ سارا ڈائننگ ہال کھلونوں کی دکان معلُوم ہوتی تھی۔ بمشکل ایک آدھی خالی میز پر جگہ ملی۔ میز کا دوسرا نصف ایک معتبر سے جاپانی کے قبضے میں تھا۔ بیٹھنے کی اجازت چاہی تو شریف جاپانی نے اُٹھ کر کمر سے جھک کر ہمیں پہلے بٹھا کر خود بیٹھنے کی جسارت کی۔ خیر یہ تواضع متوقع تھی۔ جاپانی تو اپنے دشمنوں کو قتل کرنے سے پہلے بھی کورنش بجالاتے ہیں۔ پھر اپنے کئے پر انتہائی ندامت کا اظہار کرتے ہیں اور آخر میں پورے احترام سے معزز دشمن کا سر قلم کرتے ہیں۔

ہم نے اپنے ہم نوالہ ساتھی سے اس تعداد میں جرمنی پر جاپانی یلغار کی وجہ پوچھی تو معلُوم ہوا کہ جاپان اب اسی بیماری میں مبتلا ہے جس کا آج تک صرف امریکہ مریض تھا، یعنی فالتو دولت کی بیماری۔ یہ بیماری زور پکڑے تو کیمروں، کاروں، کاروانوں، سیروں، سپاٹوں اور سرمستیوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم نے دِل میں کہا: خدایا یہ بیماری پاکستان کو کیوں نہیں لگتی؟ ایشیا میں جاپان کے بعد گراں خواب چینی بھی سنبھل گئے ہیں۔ اللہ کرے اب اگلا نمبر ہمارا ہو۔ حکیم الامت ہمیں بشارت تو کب کی دے چکے ہیں کہ

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اور ظلمتِ رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اور ہر چند کہ سحر کے آثار پیدا ہیں، تاہم ابھی نور عام ہے نہ ظلمت کے پاؤں ہی میں جنبش آئی ہے۔ بہر حال ہمیں حکیم الامت کے کہے پر اعتبار ہے۔ یہ ظلمت ایک دن ضرور چھٹے گی اور پھر ہم بھی گلے میں کیمرے لٹکا کر سیر جہاں کو نکل پڑیں گے۔ ایک باکس کیمرہ تو ہمارے پاس پہلے ہی موجود ہے۔

اگر ہماری ساری حسرتیں پوری ہو جائیں تو۔۔۔

معاف کیجئے گا ہم جاپانیوں اور ان کے کیمروں کو دیکھ کر للچانے لگے۔ آخر دِل ہی تو ہے۔ لیکن ناشتے کے بعد قیصر سٹراسہ میں شاپنگ کے لئے گئے تو میں دِل جرمن مصنوعات پر ڈولنے لگا۔ اور اگر جرمن دکانوں اور ان کی کھڑکیوں میں مختلف چیزیں دیکھنے کے بعد ہمارے دِل کی جملہ حسرتیں پوری ہو جائیں تو بازار سے لوٹتے وقت ہم اپنی نئی مرسیڈیز کار میں بیٹھے ہوتے۔ پیچھے ڈِگی، کیمروں، دوربینوں اور ٹیپ ریکارڈروں سے بھری ہوتی اور اس کے پیچھے کارواں میں مخملیں سفری بستر، رنگین ٹی وی سیٹ اور نمکین سوڈا فونٹین فِٹ ہوتے اور ہمارے پہلو میں ہماری ریشمیں سیکرٹری۔۔۔ لیکن چھوڑیئے اس قصّے کو کہ خواہ مخواہ آتا ہے داغ حسرتِ دِل کا شمار یاد۔ مختصر یہ کہ ہم ایک بال پوائنٹ پنسل خرید کر پیدل لوٹ آئے کہ زرِمبادلہ باندازہ شمار نہ تھا۔

بارہ بجنے کو تھے۔ ہوٹل میں پہنچے تو آگے سکائی لارک کا ڈرائیور سیڈین لئے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اتنا سویرے لنچ کیوں۔ ڈرائیور سے پوچھا تو بولا:

”سر، ہمیں لنچ تک پہنچنے میں بھی گھنٹہ پون گھنٹہ لگ جائے گا۔“

پوچھا: ”سکیکارلس صاحب فرینکفرٹ میں لنچ دے رہے ہیں یا واشنگٹن میں؟“

”ہوٹل شلاس میں جو یہاں سے بیس میل دور ہے۔“

”اس ہوٹل میں کیا خوبی ہے جو بیس میل بیرون شہر جا چنا ہے؟“

”سر، اس میں تین خوبیاں ہیں، ایک تو ہوٹل شلاس کسی زمانے میں شاہی محل رہ چکا ہے اور کسی محل کا شاہی رہ چکنا بڑی بات ہے۔ دُوسرے اس کے ساتھ دُنیا کا خوبصورت ترین گالف کورس ہے اور کارلی صاحب گالف کے دِلدادہ ہیں۔ تیسرے اکثر فیشن ایبل لوگ اسی ہوٹل میں جا کر شادی کرتے ہیں۔ اور کارلی صاحب آج گالف کھیلنے سے پہلے شادی کر رہے ہیں۔“

تو یہ بات تھی۔ کارلی نے یہ سارا اہتمام ہماری سرپرائز کے لئے ہم سے خفیہ رکھا تھا۔ ہم نے کہا:

”لیکن سکیکارس صاحب نے تو کھانے کے علاوہ ہمیں اپنی سیکرٹری دکھانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔“

”جی ہاں۔ اپنی سیکرٹری کے ساتھ ہی ان کی شادی ہو رہی ہے۔ وُہ بھی وُہیں ہوں گی۔“

یہ ہماری سرپرائز کی پشت پر آخری تنکا تھا۔ خیر ہم سیڈین میں بیٹھے اور ہوٹل شلاس کو روانہ ہوئے۔ شہر سے باہر نکلے اور جرمنی کے سبزہ زاروں سے گزرنے لگے تو پھر وُہی

جادو ہو گیا جو ہمیں سبزہ زاروں سے گزرنے پر ہوا کرتا ہے۔ ایک مدّت کے لئے ہم ہوٹل شلاس، کارلی اور اس کی سکتر کو بھول گئے اور فطرت کی حسین آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسحور بیٹھا کئے لیکن میرے محترم شہری قاری، شاید آپ کو بنوں سے وُہ عشق نہ ہو جو ہم دیہاتیوں کو ہے۔ لہٰذا آیئے، آپ کو ہوٹل کے اندر لے چلیں۔

ارے یہاں تو ہر طرف امریکی ہی امریکی بھرے پڑے ہیں، لمبے تڑنگے امریکی اور بانکی امریکنیں۔ موٹے امریکی اور بھدی امریکائیں اور وُہی ناگزیر کیمرے، گاگلز اور دوربینیں۔ یہ سب کارلی کے براتی تھے لیکن خود کارلی اور اس کی دلہن کہاں ہیں؟ ہم نے ایک لمحے کے لئے ایک خالی کرسی پر کھڑے ہو کر ہجوم کا معائنہ کیا تو ہمیں کارلی اور اس کی سفید پوش دلہن ہاتھ میں ہاتھ لئے مہمانوں سے باتیں کرتے آہستہ آہستہ چلتے نظر آئے۔ ہم نے بلندی سے ہاتھ لہرایا تو کارلی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ ہم نے بڑھ کر کارلی سے ہاتھ ملایا اور مبارکباد پیش کی:

بولا: ”شکریہ۔ اور ملیں میری سیکرٹری اور (گھڑی دیکھتے ہوئے) نصف گھنٹے کی بیوی ،جیکی سے۔۔۔ جیکی، یہ کرنل خان ہیں، میرے پاکستانی دوست۔“

جیکی نے دِلہن بن کر خوب روپ نکالا تھا۔ ہم نے اس سے رسماً مزاج پوچھا اور شرارتاً کہا: "کارلی اگر ہم تمہاری دِلہن کو بتا دیں کہ تم اسے بطور سیکرٹری محض گزارا سمجھتے تھے تو تمہارا جواب کیا ہو گا؟"

بولا: "اگر جیکی کو جواب پر اصرار نہ ہو تو میں خاموش رہنے کو ترجیح دوں گا۔"

جیکی نے بناوٹی غصّے سے کہا: "مُجھے یقیناً اصرار ہے۔ دو جواب۔"

کارلی بولا: "جانِ من۔ تم بیوی تو بالکل بے نظیر ہو مگر بطور سیکرٹری تم گزارے کے لئے بھی ناکافی ہو۔ تمہاری جگہ ٹائپ کر کر کے میری تو انگلیاں فگار ہو گئی ہیں۔"

اور یہ کہہ کر اس نے معائنے کے لئے ہمارے سامنے اپنی انگلیاں پھیلا دیں۔ لیکن جیکی نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھیں بند کر انہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ نئی شادی کی محبّت بڑی طوفانی ہوتی ہے اور ہاتھوں کو سینے سے لگانا تو ہوائے محبّت کا نرم سا جھونکا تھا۔

کارِ جہاں دراز ہے

ہم کارلی سے بہت دیر باتیں نہیں کر سکتے تھے کہ بہت سے دُوسرے مہمان مبارکبادیں لئے ان کی راہ میں کھڑے تھے۔ اور جب وُہ یہ راہ طے کر چکا تو اس کے سامنے

دروازے کے باہر شلاس کا مخملیں گالف کورس تھا۔ جہاں گالف کے کھلاڑی اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ کارلی نے دوستوں کی بے تابی کو بھانپ کر جیکی کو اجازت طلب نگاہوں سے اپیل کی۔ جیکی نے جواب میں فقط اپنی محبّت طلب آنکھوں سے بوجھل پلکیں اُٹھائیں۔ ایسے فصیح جواب کے آگے جملہ دِلیلیں باطل اور اپیلیں بے بس ہو جاتی ہیں۔ گویا کارلی کی اپیل سر سری سماعت پر ہی نامنظور ہو گئی اور بے چارا کچّے دھاگے میں جکڑا جیکی کے ساتھ ایک کمرے کی سمت روانہ ہو گیا۔ گالف کے کھلاڑیوں کا خیال تھا کہ کارلی کھیل کے لئے لباس تبدیل کرنے جا رہا ہے۔ لیکن ایک مدّت گزر گئی اور کارلی باہر نہ نکلا اور نہ کوئی پیغام ہی آیا سوائے ایک مصرعے کے جو حجلۂ عروسی کے کسی روزن سے نکل کر مہمانوں میں منادی کرنے لگا:

"کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر"

کارلی کے ہوٹل سے اپنے ہوٹل کو لوٹے تو ہمارے پاس اتنا ہی وقت تھا کہ سامان باندھ کر ائیر پورٹ پر پہنچتے اور جب پہنچے تو معلُوم ہوا کہ استنبول جانے والے جہاز کے آخری مسافر ہم ہی ہیں۔

یہ ہپّی ہمیں نماز پڑھوا کر چھوڑے گا

ہمارا جہاز استنبول کے ہوائی اڈّے پر اترا تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ شام کا جھٹپٹا کسی اجنبی شہر میں پہنچنے کے لئے موزوں وقت نہیں ہوتا۔ نہ مسافر شہر کے رنگ و رُخ کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ شہر مسافر کے حسن و ہنر کا۔ اور جب تک باہمی محاسن کا انکشاف اور اتصال نہ ہو سیر و تماشا کی ابتدا نہیں ہوتی۔ خیر یہ باہمی لطف و سرور تو بعد کی باتیں تھیں۔ فوری سوال یہ تھا کہ کسی ہوٹل میں پہنچ کر بستر تو کھولا جائے لیکن جس ہوٹل میں گئے؟ جواب ملا: "اگلی گرمیوں میں تشریف لایئے گا اس سیزن کے لئے ہوٹل پُر ہو چکا ہے۔" یہ کیفیت ہم نے لندن میں بھی دیکھی تھی۔ لیکن استنبول سے ہمیں ذرا بہتر سلوک کی توقع تھی۔ آخر اس شہر سے ہم علاقائی تعاون کے رشتے میں منسلک تھے لیکن آج شب اس شہر نگاراں کو سر رشتہ وفا کا ذرا خیال نہ تھا اور اس اندھیرے میں ہمارے ہاتھ میں سوائے اس کے کُچھ نہ تھا کہ ہر ہوٹل پر ناکام دستک دیئے جائیں۔ آخر بیسویں یا اکیسویں ہوٹل سے یہ امید افزا جواب ملا کہ اگر ایک دُوسرے مسافر کے ساتھ ٹھہرنے میں اعتراض نہ ہو تو ایک خالی بستر موجود ہے۔ دُوسرے مسافر

کے ساتھ ٹھہرنے میں اعتراض یا اشتیاق کا اظہار تو مسافر دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے لیکن نزاکتِ حالات کے پیشِ نظر ہم نے اس شرط پر بھی اصرار نہ کیا اور ہاں کہہ دی: شاید کہ غزال خفتہ باشد۔۔۔ لیکن کمرے میں پہنچے تو پلنگ[۱۰۹] ہی نکلا: لمبی مونچھوں، چوڑی قلموں، پھُولدار قمیص اور جھولدار پتلون والا ہپّی۔۔۔ لیکن بڑا خوش مزاج۔ مونچھوں اور قمیص کے علاوہ چیتے سے کُچھ مشابہت ہی نہیں رکھتا تھا۔ کمرے میں قدم رکھا تو ہمیں اس ادب اور اشتیاق سے ملا جیسے ہم کوئی ہپّی گرو ہوں۔ بے شک ہمارے سر کے بال کئی دنوں سے حجامت کے لئے چلا رہے تھے تاہم مجموعی طور پر ہماری حالت اتنی غیر نہ تھی کہ رشی بابا نظر آتے۔ دراصل یہ ہپّی تھا ہی خوش طبع اور خوش زبان۔ ہمیں دیکھتے ہی خوش آمدید کہا۔ ہم سے مزاج پوچھا۔ پھر ماحضر کے طور پر ہمیں چرس کا سگریٹ پیش کیا۔ اس تبرّک کی عنایت پر ہم بِدکے تو ذرا برہم نہ ہوا۔ بلکہ فی الفور ہماری پسند کا ایک غیر ہپّی مشروب یعنی کوکا کولا منگوا لیا۔ تعارف پر پتہ چلا کہ نام نیلسن ہے۔ سویڈن کا رہنے والا ہے اور دوستوں کے ساتھ سیر

---

[۱۰۹] بمعنی چاہنا۔

جہاں کو نکلا ہوا ہے۔ کوکا کولا کا گلاس ختم کر چکے تو نیلسن نے ہماری تھکاوٹ کے پیشِ نظر ہمیں غسل کا مشورہ دیا۔ ایک ہپّی کو غسل کی تلقین کرتے دیکھ کر ہمیں تعجّب ہوا لیکن تعجّب سے زیادہ اطمینان ہوا کہ اس شخص کے ساتھ ایک ہی کمرے میں ٹھہرنا گراں نہ ہو گا سوائے اس کے کہ آدھی رات کو جگا کر ہمیں تہجد کے لئے بھی مجبور کرنے لگے۔ اس ناصح ہپّی سے کُچھ بھی بعید نہ تھا۔

کھلی بنولے کے ساتھ کُچھ اُردُو شاعری بھی برآمد کریں

غسل خانے سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے پلنگ دوست کے ساتھ دو غزال بھی بیٹھے ہیں۔ تعارف پر ایک لوزینہ اور دُوسری لوتاشہ نکلی۔ یہ بھی سویڈنی ہپّنیں تھی۔ پوشش اور آرائش کے معاملے میں انہوں نے اپنے ساتھ کُچھ اچھا سلوک نہیں کر رکھا تھا لیکن فطرت نے ان کے ساتھ بڑا شاہانہ سلوک کیا تھا یعنی انہیں حسن بھی دے رکھا تھا اور شباب بھی۔ اور سچی بات ہے ان دو بنیادی حقائق کے بعد لباس اور آرائش کا عدم یا وجود برابر تھا اور ان دونوں نے عدم کو ترجیح دی تھی۔ معلُوم ہوتا تھا کہ دو چار گرہ کپڑے کو چھوڑ کر غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا۔ باتیں شروع ہوئیں تو یہ نیلسن سے بھی زیادہ پیاری اور رواں انگریزی بولنے لگیں۔ یہ معلُوم کرنے کے بعد کہ ہم پاکستانی

ہیں، ان کا شوقِ گفتگو اور تیز ہو گیا کہ لوزینہ نے اپنے ہی دوستوں سے پشاور اور پنڈی کے انڈر ورلڈ کے وُہ الف لیلائی قصّے سن رکھے تھے جن سے ہم پنڈی اور پشاور میں ایک عمر گزارنے کے باوجود ناواقف تھے۔ بہرحال ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لئے ہمیں ذرا ڈرامائی پارٹ ادا کرنے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً لوزینہ کے ساتھ کہ اسرارِ پاکستان سمجھنے کے لئے ہمارے قریب آ بیٹھی اور بولی:

"انگریزی آپ کی مادری زبان ہے؟"

ہم نے کہا: "خدا تمھیں لمبی زندگانی دے، انگریزی نہیں، اُردُو۔ وُہی میر اور غالب کی زبان۔ معلُوم ہے غالب کون تھا؟"

بولی: "کیا کہا کیلب۔"

ہم نے کہا: "کیلب پاکستانی[۱۱۰] کرسچن ہے اور ٹینس کھیلتا ہے۔ غالب ترک تھا اور شعر کہتا تھا۔"

پوچھنے لگی: "آپ کے ہاں شاعر بھی ہوتے ہیں؟"

---

[۱۱۰] پنڈی کی ایک شخصیت۔

عرض کیا: ”شاعروں کے سوا کُچھ ہوتا ہی نہیں۔ شاعری کے علاوہ کوئی دوسرا کام تو ہم اتفاق یا قسمت ہی سے کرتے ہیں۔“

”تو پھر کوئی اچھا سا شعر سناؤ۔“

ہم نے غالب کی بجائے ظفر علی خان کا شعر سنایا کہ اس وقت وُہی حسبِ حال تھا:

سرمایۂ نشاط تری ساق صندلیں

بیعانہ سرور ترا مرمریں بدن

جب ترجمہ سنایا تو پھڑک اٹھی اور کہنے لگی:

”شاعر نے یہ کسی کے متعلق لکھا ہے؟“

”اپنی محبوبہ کے متعلق[1]۔“

”تو وُہ بڑی حسین ہو گی۔“

”کُچھ تم سے ملتی جلتی ہو گی۔“

”کیا میں سچ اتنی پریٹی (PRETTY) ہوں؟“

---

[1] مولانا نے یہ شعر اپنی محبوبہ کے متعلق نہیں بلکہ ایک اور ضمن میں کہا تھا۔

”تو کیا تمھیں آج تک کسی نے نہیں بتایا؟“

”ان لفظوں میں نہیں۔“

”یہ تمہاری شاعری کا قصور ہے۔“

بولی: ”آپ کی شاعری تو جادو معلُوم ہوتی ہے۔“

اور یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا اور جب آنکھیں کھولیں تو ان میں ننھے ننھے تارے تیر رہے تھے۔ پھر اچانک اپنی کرسی سے اٹھی اور کھلی کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور ایک خود فراموشی کے عالم میں آسمان کو تکنے لگی۔

دیکھا آپ نے؟ اُردُو شاعری جسے وطن میں ایک بیکار مشغلہ سمجھا جاتا ہے پردیس میں کیا مقام رکھتی ہے۔ ذرا ایکسپورٹ پروموشن بیورو والوں سے کہہ دیں کہ کھلی اور بنولے کے ساتھ ساتھ باترجمہ اُردُو شاعری کی برآمد کے امکانات پر بھی غور کریں۔

بہر حال لوزینہ کے بعد ہم بھی اُٹھے اور کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ اور مسجد کے میناروں کے پیچھے سے چاند ابھر رہا تھا اور استنبول پر ایک ہلکی ہلکی چاندنی پھیل رہی تھی۔ لوزینہ نے ایک رومان انگیز لہجے میں کہا:

”کتنی پیاری چاندنی ہے!“

اُردُو شاعری کے پاس اس صورتِ حال کا جواب بھی تھا۔ ہم نے بلا تامّل کہا:

"یہ چاندنی نہیں ترے قدموں کی دھول ہے"

اور ساتھ ہی تشریح پیش کی۔ لوزینہ پر مطلب کا کھلنا تھا کہ اس کی آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ ذرا سنبھلی تو بولی:

"کتنا پیارا شعر ہے! کس کا ہے؟"

خدا جانے یہ کس شاعر کا مصرع ہے۔۔۔ بہر حال ہم نے تھوڑی دیر کے لئے ادھار لے لیا ہے اور کہا:

"اپنا ہی ہے۔"

"تو آپ شاعر بھی ہیں؟"

"نہیں، میری جان۔ میں بالکل شاعر نہیں ہوں۔ ایسا شعر تو تم سے انسپائر INSPIRE ہو کر ہر پاکستانی کہہ سکتا ہے۔ تم نے ہمارے حقیقی شاعروں کا کلام تو سُنا ہی نہیں۔"

بولی: "اگر میں پاکستان جاؤں تو کسی حقیقی شاعر سے مل سکوں گی؟"

"پاکستانی شاعروں کو اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہو گی۔"

قصّہ مختر اس گفتگو کا اور تھوڑی سی مزید گفتگو کا وہی نتیجہ نکلا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ لیکن خیر، نیلسن اور ہم نے مل کر بالآخر لوزینہ کو قائل کر لیا کہ آج اور اسی وقت پاکستان کو چل پڑنے کی بجائے اگر وُہ آتی سردیوں تک انتظار کر لے تو پاکستان کے حقیقی شعراء میں کمی آجانے کا کوئی خطرہ نہیں اور نہ ان کے شوقِ ملاقات کے سرد ہو جانے کا امکان ہے۔ لوزینہ کو پاکستان میں پشاور کے راستے داخل ہونے کا شوق تھا۔ چنانچہ اس کی مزید دِلجوئی کے لئے احمد فراز کے نام سفارشی خط بھی لکھ دیا۔ اس خط سے کُچھ احمد فراز کے دردِ آشوب کا مداوا بھی مقصود تھا کہ بے چارے ایک مدّت سے نہ صرف بذاتِ خود بلکہ بذریعہ مہدی حسن بھی کسی لوزینہ ہی کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں:

"رنجش ہی سہی دِل ہی دکھانے کے لئے آ"[۱۱۲]

اور لوزینہ اگر دِل لبھانے کا گر جانتی تھی تو دِل دکھانے کی تکنیک سے بھی واقف تھی۔

ان سویڈنی ہپّیوں کی موجودگی کے پیشِ نظر ہماری استنبول کی سیر خاصی ہونہار دکھائی دیتی تھی۔ لیکن صُبح جاگے تو معلُوم ہوا کہ نیلسن اپنی غزالوں کو مُنہ اندھیرے ہی

---

[۱۱۲] احمد فراز کی غزل کو مہدی حسن نے ایک دردانگیز لَے میں گایا ہے۔

سمیٹ کر چل دیا ہے۔ ہماری بے خبری میں صحبتِ یار بڑی بے دردی سے آخر ہوئی تھی۔

ٹر گیا ماہیا ہتھ پئی ماراں منجیاں تے[113]

خیر، مسافر کو ایسے گرم سرد مرحلے پیش آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کو ہم نے ایک گرہ میں باندھ کر خوشگوار یادوں کے خانے میں ڈال دیا اور استنبول کا قیام جاری رکھا یعنی کپڑے بدل کر نیچے کھانے کے کمرے میں گئے اور ہوٹل کے انتظام اور انتظامیہ سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ اس چھوٹے سے ہوٹل کی پردھان مادام چقماگلو تھیں جو اپنی مسند کی وجہ سے ہی نہیں، رنگ و رُخ کے اعتبار سے بھی پردھان لگتی تھیں۔ باقی کارندوں کے درمیان یُوں نظر آتی تھیں جیسے چند ٹمٹماتے دیوں کے درمیان ایک مرکزی بلب روشن کر دیا جائے۔ مادام کے جلو میں ایک بوڑھا سا گھسا پٹا شخص بھی تھا جو بیک وقت مادام کا خاوند بھی تھا اور خادم بھی۔ بے چارہ زمانے کی گردش کے علاوہ مادام کی گردش کے نیچے بھی آیا ہوا لگتا تھا۔ شکل و صورت سے یُوں دکھائی دیتا تھا جیسے قدرت نے اسے پاؤں دابنے کے لئے پیدا کیا ہو۔ مادام بھی بظاہر قدرت کا اشارہ سمجھ

---

[113] میرا محبوب چل دیا اور میں گھر کی چارپائیاں ٹٹولتی پھرتی ہوں۔

کر رہی اس سے سلوک کر رہی تھی۔ چنانچہ ہر چند کہ ہمارے سامنے اس شخص نے مادام کے پاؤں نہ دابے تاہم اسے مادام کے قدموں سے بہت دور بھی نہ پایا۔

ناشتے کے بعد ہم ہوٹل سے نکلے اور سیدھے پی آئی اے کے دفتر میں گئے کہ اگلی پرواز کے لئے دن کی روشنی میں ہی اپنی نشست پکی کرا لیں ورنہ ہمارے جہاز کا وقتِ رخصت تو آتی رات کے تیسرے پہر کے قریب تھا۔ یہ ہو چکا تو ہمیں یاد آیا کہ یہاں کے پی آئی اے کے سربراہ تو ہمارے یار گامے کے عم زاد، آغا ارشد ہیں۔ کیوں نہ اس اجنبی شہر کی سیر کے لئے ان سے رشد و ہدایت حاصل کریں۔۔۔ بابو نے بتایا کہ آغا صاحب ابھی گھر سے نہیں آئے۔ ہم نے ٹیلی فون پر ہی آغا صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور مدُعا عرض کیا کہ ہمیں سیر استنبول کی ترکیب درکار ہے۔ ادھر سے جواب آیا:

”آپ دفتر میں ہی تشریف رکھیں۔ میں ایک پاکستانی جوڑا لئے سیر استنبول کو نکلنے والا ہوں اور آپ ہی کے رستے آ رہا ہوں۔ کار میں چوتھی نشست خالی ہے۔

دولت ہست کہ یابی سر راہے گاہے

خدا بے شک مسبب الاسباب ہے۔ رات اس نے سویڈنی ساتھی پیدا کر دیئے تھے اور علی الصُبح انہیں چھین لیا۔۔۔ اور شاید اس میں بھی ہماری فلاح کا پہلو تھا۔۔۔ تو دن

چڑھے ایک اور احسان کر دیا یعنی آغا ارشد مہیا کر دیئے اور وُہ بھی کار اور ساتھیوں سمیت۔ سیر کو نکلے تو سب سے پہلے عجائب گھر کے اس حِصّے میں جا پہنچے جہاں دونوں جہاں کی نعمت میسر آ گئی یعنی حضور صلعم کے ذاتی تبرکات کی زیارت: آپ کی مہر مبارک کی، آپ کے فرمان کی اور اس صندوق کی جس میں آپ کا لبادہ بند تھا۔[114] اللہ! میرے یہ نصیب؟ کیا میں واقعی وُہ اشیاء دیکھ رہا تھا جنھوں نے سرورِ کائنات کے ہاتھوں کو مس کیا تھا؟ کیا میں سچ مچ اس دولت بیدار سے بہرہ ور تھا جو بے استحقاق میرے حِصّے میں آئی تھی؟ میرے کان میں قاری کی آواز گونجی "فبای الاء ربکما تکذبان"[115] میں سوچتا: کہاں یہ گنہگار آنکھیں اور کہاں یہ نعمتِ دیدار!

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم اس عجائب گھر کے باقی عجائبات پہلے دیکھتے اور آثارِ نبوی بعد میں کہ اس طرح بتدریج اپنی سیر کی معراج کو پہنچتے۔ اب اس مقامِ پاک سے نکلے اور عجائب گھر کے دُوسرے کمروں میں۔۔۔ جو دراصل پرانے شاہی محلات کے کمرے تھے۔۔۔ داخل ہوئے اور طلاء و نقرہ کی نادر مصنوعات، حریر و پرنیاں کے قدیم

---

[114] یہ اندازِ بیان مستنصر حسین تارڑ سے لیا ہے۔
[115] تم میری کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔ سورۃ رحمٰن

ملبوسات، لعل وجواہر سے مرصع تیغ و تفنگ اور نقش و نگار سے مزین چینی کے ظروف دیکھے تو وُہ لطف نہ آیا جو آنا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کہ ان شاہکاروں کے خالق یا ان کے عثمانی سرپرست لائقِ تحسین نہ تھے۔ فقط یہ کہ ان نوادرات کو باقیاتِ پیغمبر کے پہلو بہ پہلو رکھ کر داد کی توقع رکھنا عبث تھا۔

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو خور بہشت

پر کہاں یہ شوخیاں، بہ طور، یہ مجبوریاں

دراصل ان تبرکات کو عجائب گھر کا حصّہ بنانا ہی، اگر بے ادبی نہیں تو بے سلیقگی ضرور تھی۔ ان کے لئے صحیح مقام کسی خانۂ خدا کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔ مثلاً مسجد سلطان احمد میں جو ہماری سیر کی دُوسری منزل تھی۔

سلطان احمد کی تعمیر کردہ یہ مسجد جسے نیلی مسجد بھی کہتے ہیں، استنبول کی سینکڑوں مسجدوں کی سُرخیل ہے اور ان کے ہزاروں میناروں میں کہ جن پر ہجومِ نخیل کا گماں ہوتا ہے، اسی مسجد کے چھ مینار جلیل بھی ہیں اور جمیل بھی، کبیر بھی ہیں اور کثیر بھی۔۔۔۔ لیکن یہ مسجد کا اندرونہ ہے جو ہمارے لئے نیا بھی ہے اور نرالا بھی۔ ہر ملک میں تعمیرِ مساجد کا فن جداگانہ ہے۔ برصغیر کی مساجد کھلی محرابوں اور وسیع صحنوں کے طفیل کم و بیش OPEN AIR تعمیرات لگتی ہیں، لیکن شاید یہ آب و ہوا کا تقاضا

ہے یا ہمسایہ عیسائی معبدوں کا اثر کہ یہاں کی مساجد کا بنیادی اصولِ تعمیر بند ڈبّے کا سا ہے جس پر سپاٹ چھت کی بجائے اونچے گنبد کا ڈھکنا رکھ دیا جائے اور پہلوؤں پر مینار کھڑے کر دیئے جائیں۔ اس طرزِ تعمیر کا اپنا حُسن ہے لیکن ایک پاکستانی زائر کو چند لمحوں کے لئے نامانوس سا لگتا ہے۔ اسی مسجد کے اندر فرش سے بقدر دو قد آدم اونچا شہ نشیں بھی بنا ہوا ہے۔ استفسار پر معلُوم ہوا کہ سلاطینِ ترکی اس بلندی سے نماز میں شامل ہوتے تھے۔ یہ سوچ کر کہ شاہی مسجد لاہور میں سلاطینِ ہند اور مسجدِ نبوی میں شاہ دوسراؐ فرشِ زمین پر سجدہ ریز ہوتے تھے۔ سلاطینِ ترکی کا اندازِ عبارت نامانوس تر لگا، لیکن خیر یہ قصّہ ماضی ہے۔ جدید ترکی میں اس شہ نشین کا کوئی غیر جمہوری استعمال نہیں۔ اب کوئی ہماری مانے تو تبرکاتِ رسالتمابؐ کو عجائب گھر سے نکال کر اس خالی شہ نشین[۱۱۶] پر شیشے کے کیسوں میں دیدارِ عام کے لئے رکھ دیتے تا کہ آپ کے آثار تک ان غریبوں کی بھی رسائی ہو سکے جن کے وُہ آقا و مولا تھے۔

[۱۱۶] اسے محصورہ کہتے ہیں تا کہ سلاطین پر حالتِ نماز میں دشمن حملہ نہ کر سکے۔

آیئے، مادام چقماگلو کی چھاؤں میں ستایئے

معلُوم ہوتا ہے کہ استنبول کی اکثر عمارات کی تقدیر میں عجائب خانی لکھی ہے کیونکہ جن مقاصد کے لئے استنبول کے دو ہزار سال کے حکمرانوں نے کئی ہزار عمارتیں تعمیر کر دی ہیں وُہ مقاصد تو مر چکے ہیں لیکن عمارتیں زندہ ہیں اور بے مقصد عمارتوں کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں کہ انہیں عجائب خانہ بنا دیا جائے اور عمارتوں ہی پر کیا موقوف ہے۔ بے مصرف انسان بھی میوزیم پیس (MUSEUM PIECE) ہی لگتے ہیں۔ دیکھئے ہمارے ہوٹل کے مسٹر چقماگلو کو جو مادام چقماگلو کا خاوند کہلانے کے کام آتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ وُہ یہ مقصد بھی اچھی طرح پورا نہیں کر رہے۔ چنانچہ وُہ اس مجسمے سے بہت مختلف نہیں جو لاہور میوزیم کے دروازے پر رکھا ہے اور جس پر نگہبانوں سے آنکھ چُرا کر لونڈے اپنے دستخط کندہ کر جاتے ہیں۔ اس روز سیر کے بعد ہوٹل کو لوٹے تو مسٹر چقماگلو کو مادام سے اسی فاصلہ پر جو تقدیر نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا، ساکت بیٹھے پایا اور پھر ایک لمحے کے لئے ہمارے اندر کے لونڈے نے بھی بے اختیار چاہا کہ اس کی گنجی چمکتی چندیا پر بال پوانٹ سے اپنا نام مع تاریخ کھود کر لکھا جائے لیکن مادام کی سیاست سے ڈر گیا اور بال پوائنٹ کھولنے کی بجائے دانتوں میں دبا کر رہ گیا۔ رہی خود مادام تو وُہ ابھی عجائب گھر سے دس بارہ سال کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ بے شک

عمر کے لحاظ سے وُہ بھی کوئی کامنی کونپل نہ تھی بلکہ بھارے تنے کے شاہ بلوط کی طرح پختہ اور پائدار، مگر وہ شاہ بلوط جو لب جو اگ رہا ہو: سر سبز، شاداب اور سایہ دار اور جسے دیکھ کر ایک غریب الوطن مسافر کا جی چاہے کہ تھوڑی دیر کے لئے اس کی گھنی چھاؤں میں ستالے۔ مگر عرض کیا ہے نا کہ ہمارے پاس وقت کم تھا اور کُچھ شاید اس شاہ بلوط کا سایہ بھی ہماری ضرورت کے مقابلے میں زیادہ گھنا تھا۔

باسفورس کو دستِ قدرت نے شوقیہ بنایا ہے

استنبول میں رہ کر آبنائے باسفورس کی جھلک ناگزیر ہے اور ایک جھلک کے بعد باسفورس کے جادو میں گرفتار ہو جانا ناگزیر تر! یہ جھلک آج صُبح ہم نے شاہی محلات (عجائب گھر) کی سیر کرتے ہوئے دیکھی تھی۔ سمندر کہیں بھی ہو اس کی پنہائی میں رعب ہے، جلال ہے، ہیبت ہے لیکن باسفورس کے جھلملاتے پانی اس کے سیّال سونے میں حُسن ہے، جمال ہے اور لطافت ہے۔ شاید اسی لئے اس کی ایک شاخ کو شاخِ زریں کہتے ہیں اور یہ کہہ کر کوئی مبالغہ نہیں کرتے۔ یُوں معلُوم ہوتا ہے جیسے اس سمندر کو دستِ قدرت نے شوقیہ بنایا ہے۔ ہوٹل کے ایک مصری ساتھی عبد الکریم سے بات ہوئی تو وُہ بھی حُسنِ باسفورس کا دیرینہ قتیل نکلا۔ بولا

”چلو ابھی چل کر دیکھتے ہیں ورنہ کل تک شاید یہ ترک باسفورس کو بھی اُٹھا کر کسی عجائب خانے میں رکھ دیں۔ ان کے پاس فالتو کھنڈروں کی کمی نہیں۔“

ہمیں کریم کے ساتھ پورا اتفاق تھا۔ فوراً تیار ہوئے اور ہوٹل سے چل نکلے۔

ہمارے خیال میں باسفورس کو دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ جہاز میں بیٹھ کر یعنی سینۂ باسفورس پر تیرتے ہوئے اس کے جمال کا تماشا کیا جائے۔ ہمارے دوست کریم کی تھیوری یہ تھی کہ محبوب کا جلوہ ذرا ہٹ کر دیکھا جائے تو اس کے جوبن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نظریہ تھا تو ہمارے مسلک کے خلاف کیونکہ محبوب کے دیدار میں اس کا لمس بھی شامل ہو تو مزا کچھ دو آتشہ سا ہو جاتا ہے لیکن تجربے کی خاطر ہم نے کریم کی بات مان لی۔ اور تقسیم چوک سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر باسفورس کے ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کو بڑھنے لگے: ارے، کریم نے سچ ہی کہا تھا: ساحل سے محبوب کا سالم سراپا آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے لب و رخسار کی پُرنور فضائیں، اس کے قد و رفتار کی مخمور ادائیں، اس کے ڈھلتے ڈگمگاتے سفینے، اس کے جھومتے جگمگاتے خزینے، اس کی لہروں کی رسیلی صدائیں، اس کے دامن کی نیلی ہوائیں۔۔۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نگارِ باسفورس نے بن سنور کر صرف ہماری خاطر دیدارِ خاص کا اہتمام کیا ہو۔ اور ابھی سیر نہ ہو پائے تھے کہ امیرکان پہنچ گئے۔ آپ پوچھیں گے امیرکان کیا ہے؟ یہ

باسفورس کے کنارے چھوٹا سا فردوس ہے جہاں استنبول کے پری وش شام منانے آتے ہیں۔ ہمیں سوئٹزرلینڈ اور جنوبی انگلستان کے کوہ و دمن نے بھی پہلی نگاہ پر جادو کر دیا تھا لیکن امیر کان کے حُسن اور اس کے حسینوں کی چھب کی بھی کُچھ نہ پوچھئے:

وُہ سبزہ زار ہائے مطرا کے ہے غضب

وُہ نازنیں بتاں خود آرا کہ ہائے ہائے

اور ہم سے کہیں زیادہ وارفتہ کریم تھے کہ وُہ ہوٹل ہی سے دِل ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تھے اور جب تک اسے ایک ساقی لالہ فام کو ایک جام کے عوض دے نہ بیٹھے، انہیں چین نہ آیا۔ پھر اس ساقی کی رہنمائی میں شہر کو لوٹے جہاں پک نک ریستوران میں قیامِ استنبول کا پہلا لذیز کھانا کھایا۔ خدا جانے یہ لذّتِ طباخان پک نک کی کاریگری کی وجہ سے تھی یا چشمِ ساقی کے التفات کے طفیل، بہر کیف نتیجہ یہ رہا کہ زندگی کی یادگار شاموں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

ہوٹل کو لوٹے تو بارہ بجے کا عمل تھا۔ مادام دکان پڑھا چکی تھیں۔ کاؤنٹر پر موسیو چقماگلو بیٹھے تھے اور اس عارضی خود مختاری کے وقفے میں ان کے سر کے علاوہ چہرے پر بھی چمک تھی۔ ہم نے پوچھا:

"مادام کہاں ہیں؟"

ہونٹوں پر کھڑی انگلی رکھ کر بولے: ”شی۔ی۔ی! آہستہ بولیں۔ وُہ اس کمرے میں سو رہی ہیں۔“

ہم نے آواز دھیمی کرتے لیکن آنکھ مارتے ہوئے کہا: ”اللہ انہیں سکھ دے مگر آپ بھی کیوں نہیں سو جاتے؟ رات ڈھل چکی ہے۔“

اس کے جواب میں بوڑھے کے مُنہ سے بے ساختہ آہ نکل گئی۔ ذرا سنبھلا تو کپکپاتے ہونٹوں پر قابو پاتے ہوئے بولا:

”م م میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

موسیو چقماگلو نے قصداً مضمون بدلا تھا کہ اسے قصّۂ درد چھیڑنے کی تاب نہ تھی۔ ہمیں ترس آگیا اور بدلے ہوئے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

”براہِ کرم میرا بل بنا دیجئے۔ میں صبح چار بجے جا رہا ہوں۔“

چقماگلو صاحب بِل بنانے لگے اور ہم میر کا شعر گنگنانے لگے۔

میر صاحب بھی اس کے یاں تھے پر

جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

ساڑھے تین بجے رات کے قریب ٹیکسی آئی اور ہم ہوٹل اور استنبول کو الوداع کہتے ائیرپورٹ کو روانہ ہوئے جہاں پی آئی اے کا طیارہ صحیح وقت پر اُترا اور صحیح وقت پر بلند ہو کر عازمِ تہران ہوا۔

کیا جنٹلمین واقعی بلونڈ کو ترجیح دیتے ہیں؟

ہوائی سفر میں اکیلے مسافر کی قسمت کا یہ امتحان ہوتا ہے کہ اسے جہاز میں ہمنشین کون ملتاہے۔ آپ کو ہمارے گزشتہ سفروں کے کُچھ ہم نشیں یاد ہوں گے: چکلالہ اور کراچی کے درمیان وُہ تنک پوش میم، بیروت اور جنیوا والی وُہ دِلفروش مسز ش اور پیرس فرینکفرٹ والا وُہ عیش کوش سکائی لارک اور ہمارا آج کا ہمنشیں نکلا پرویز اعتمادی۔ پرویز ایک خوش رَو اور خوش قامت ایرانی نوجوان تھا جو بات کرتا تو ننھے ننھے پھُول جھڑتے۔۔۔۔ ہماری قسمت خراب نہ تھی۔

پرویز دس برس امریکہ میں رہنے کے بعد اقربا سے ملنے آرہا تھا یا جیسا کہ تھوڑی سی بے تکلفی کے بعد معلُوم ہوا اپنے ماں باپ کو سمجھانے آرہا تھا کہ اپنی ایرانی منگیتر کی بجائے ایک امریکی بلونڈ[117] سے شادی کرنے پر کیوں مجبور ہے۔ ہم نے پوچھا۔

---

[117] BLONDE ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والی عورت۔

"کیا مجبوری ہے؟"

"دِل کی بات ہے۔ اور کیا کہوں؟"

"دِل کی بات ہے یا اس لئے کہ جینٹلمین بلونڈ کو ترجیح دیتے ہیں[118]۔"

پرویز ہنسا اور بولا: "کہاوت تو یہی کہتی ہے۔ اور شاید جینٹلمین ترجیح بھی بلونڈ ہی کو دیتے ہیں مگر جس رنگ کی بھی میسر آ جائے لوٹاتے نہیں۔ میں وُہ جنٹلمین نہیں ہوں۔"

"یعنی بالکل یکجائی ہو؟"

"بالکل!"

"تو اپنی ہم وطن منگیتر کا دِل توڑ دو گے؟"

"ایک دِل کی بجائے دو دِلوں کا ٹوٹنا زیادہ سنگین ہے۔"

"تم اپنے ماں باپ کے دِل شمار نہیں کر رہے۔ وُہ بھی تو ٹوٹ سکتے ہیں۔"

"انہی دو دِلوں کی خاطر تو اتنی دور سے آ رہا ہوں۔ تم دُعا کرو۔"

---

[118] ایک معروف انگریزی فقرہ: GENTLEMEN PREFER BLONDES

”اگر میں نے کسی کے لئے دُعا کی تو ان میں تمہاری منگیتر بھی شامل ہو گی۔ اللہ تمہارے دِل میں اس بے کس دوشیزہ کے لئے بھی مہر ڈالے۔“

”آمین۔۔۔ اور اللہ اس دوشیزہ کے دِل میں اس بیکس کے لئے بھی کُچھ مہر ڈالے اور چھٹی دِلوا دے۔۔۔ اور ہاں اس دوشیزہ کا نام بھی مہر ہے، مہر النساء۔“

تین گھنٹے کے ہوائی سفر میں پرویز سے دُنیا جہان کی باتیں ہوئیں لیکن ہمارے ذہن سے یہ بات نہ نکل سکی کہ یہ بے چارا تہران پہنچنے پر اس محبّت کی مثلث بلکہ مخمس سے کس طرح سلامت نکلے گا اور پھر دفعتاً ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں مہر آباد کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں۔ جب چند لمحے بعد جہاز ایئر پورٹ کی عمارت کے سامنے رُکا تو پرویز نے اپنی ٹائی کی گِرہ درست کی اور جہاز کے دروازے کی طرف چلا۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

دروازے کی بلندی سے کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے عورتوں اور مردوں کی ایک پوری قطار پھُولوں کے ہار لئے کھڑی ہے۔ پرویز نے کُچھ صورتیں پہچان کر کہا: ”یہ لوگ میرے استقبال کو آئے ہیں۔“ اور پھر سیڑھی سے اُترا ہی تھا کہ ایک بزرگ نے بڑھ کر اس کے گلے میں ہار ڈالا اور پھر اس سے بغلگیر ہو کر اس کے گالوں اور آنکھوں کو چوم لیا۔۔۔ ایرانی ملاقات میں سب کُچھ ڈال دیتے ہیں: دست و بازو، لب و چشم، جان و

دِل۔۔۔۔ پرویز نے فارسی کے چند لفظوں میں ہمارا تعارف بھی کرا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ بزرگ نے جو پرویز کا باپ تھا ہمارے رخسار و چشم پر بھی وُہی عمل کیا اگرچہ خوش قسمتی سے اس میں وُہ پدرانہ شدّت نہ تھی۔ آگے پرویز کی بوڑھی ماں کھڑی تھی جو خوشی میں بیٹے کو پھُولوں کا ہار پہنانا تو بھول گئی لیکن اسے سینے سے لگا کر بوسوں کا ہار پہنا دیا۔ جب ماں سے مل کر پرویز آگے بڑھا تو اس پیاری پوپلی خاتُون نے از راہِ شفقت ہمارے گال بھی گدگدا دیئے۔ آگے پرویز کے چچے، چچیاں، خالو، خالائیں تھیں۔ انہوں نے بھی حسبِ دستور پرویز کو شش پہلو پیار کیا اور ہم سے بھی کسی نے ہاتھ ملایا اور کسی نے پیٹھ تھپکا دی۔ آگے مقطعے میں تھیں پرویز کی عم زادیاں اور خالہ زادیاں: ماڈرن، حسین، مہ جبیں اور دِل نشیں۔ ہاتھوں میں ہار لئے، ہونٹوں میں پیار لئے اور آنکھوں میں خمار لئے۔ اور یہاں سخن گسترانہ بات آ پڑی۔ پرویز سے تو وُہ بھی اسی طرح لپٹیں جیسے ماڈرن کزنیں COUSINS لپٹا کرتی ہیں مگر ہمیں محض سر کے خم یا لبوں کے تبسّم پر ہی ٹال دیا۔ بلکہ قطار کی آخری لڑکی نے تو ہمیں نہ صرف تبسّم سے محروم رکھا بلکہ اس طرح گھورا جیسے کہتی ہو تو "کیستی؟۔"۔ لیکن خیر مجموعی طور پر یہ تقریب ہمیں موافق ہی آئی۔ آخر ہمارے لئے یہ سب کُچھ جھونگا[۱۱۹] ہی تو تھا، بلکہ

---

[۱۱۹] پنجابی لفظ ہے۔ وُہ تھوڑی سی مقدار جو دکاندار گاہک کو خریدے ہوئے مال کے ساتھ مفت دیتا ہے۔

خاصا خوشگوار جھونکا۔ حسینوں کے معاملے میں صحیح فلاسفی وُہی ہے جو فیض نے بیان کی ہے:

گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اور اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پرویز ایک ایسی لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے جو کسی قدر ہٹ کر کھڑی ہے جیسے استقبال کنندوں میں شامل نہ ہو بلکہ تماشائی ہو اور لڑکی کیا تھی؟ یک دخترِ آفتاب شمائل، سعدی کا سرو سیمیں اور حافظ کا غزالِ رعنا مگر اداس اداس جیسے پلکوں پر آنسو آنے والے ہوں یا آکر گر چکے ہوں۔ پرویز اس کے قریب جا کر ایک لمحے کے لئے رُکا اور پھر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ ایک مدّت کے بعد پرویز نے ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ہمارے پوچھے بغیر بولا۔

"یہی مہر ہے۔"

اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گم ہو گیا۔۔۔۔ پرویز اب ہم ہی سے بے خبر نہ تھا اسے امریکی بلونڈ بھی کچھ ایسی یاد نہ تھی۔ محبّت کو اس قدر اچانک رُخ بدلتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ٹھیک ہے۔ چند لمحے پہلے ہم ہی نے اس مضمون کی دُعا کی تھی اور خود مہر کی آہوں کا منشا بھی یہی تھا، تاہم اس تیزی سے دُعائیں یا آہیں کبھی قبول نہیں ہوئی تھیں۔ یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے اللہ میاں نے صرف دُعا ہی قبول نہیں کی بلکہ سپیشل کیس کے

طور پر پرویز کو گردن سے پکڑ کر مہر کے قدموں میں بھی ڈال دیا ہے۔ چنانچہ وہی پرویز جو مہر سے پرہیز کرنا چاہتا تھا اب اسی مہر کے دہن میں آبِ حیات ڈھونڈ رہا تھا۔ پرویز اور مہر کو اس عالمِ شوق میں دیکھ کر حاضرین پر ایک خاموشی چھا گئی۔ اتنے میں کہیں سے غالب آ نکلے اور ہمارے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگے:

"دیکھا؟ صاحب کو دِل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا!"

پرویز کو ہیلو کہنا بے کار تھا۔ ہم نے اس کی سمت میں فقط الوداعی ہاتھ لہرایا اور خود کسٹم سے سامان لینے چل پڑے۔

ایرانی کسٹم میں غالباً حاتم طائی کی اولاد ہی بھرتی ہوتی ہے: سخی داتے، سیر چشم، وسیع القلب! مجال ہے جو آپ کے سامان کو میلی نگاہ سے دیکھیں یا اسے کھول کر تلاشی لینے کی گھٹیا حرکت کریں۔ ہم نے اپنا سوٹ کیس پیش کیا تو ابنِ حاتم نے ایک شانِ بے نیازی میں اس پر چاک سے نشان لگا دیا کہ "جاء لے جا جہاں تیرا جی چاہے" اور ہم نے ہزار افسوس کیا کہ کیوں نہ اسے چرس سے بھر لائے۔۔۔ جملہ یورپی ہپّی ایران ہی سے گزر کر آتے ہیں۔۔۔ یہ دُوسری بات ہے کہ اسی روز پچھلے پہر ایک چرس کے سمگلر کو سرِ بازار گولی سے اڑا دیا گیا۔ ہم نے یہ سُنا تو ہزار شکر کیا کہ ہمارے سوٹ کیس میں پی آئی اے کی سونف سے زیادہ منشی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایئر پورٹ سے باہر نکلے تو ٹیکسی ڈرائیور یا "راننده تاکسی" سے واسطہ پڑا۔ یہ ذات شریف جس خاندان سے بھی تھے۔ حاتم طائی نے ان کی کسی پشت میں افزائشِ نسل کی نیّت سے حصّہ نہیں لیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم گولی کے خوف سے سمگلنگ کا کاروبار نہیں کرتے ہم سے وُہی کرایہ مانگا جو ایک نامور بین الاقوامی سمگلر کی شان کے شایاں ہو اور ناچار ہم نے بھی اپنی جھوٹی شان کو بٹہ نہ لگنے دیا اور کرایہ ادا کر دیا۔

من یک کمرومی خواہم

ہوٹل انٹر نیشنل یا "ہتل انترنیشنال" میں پہنچے تو دیکھا کہ ہر طرف فارسی کا دور دورہ ہے۔ ایسے ماحول میں ہمیں انگریزی بولنا بے جا نظر آیا۔ چنانچہ ہم نے بھی فارسی بولنے کا فیصلہ کیا۔ آخر بی-اے میں فارسی آنرز کیا تھا اور پچھلے دنوں اپنی پرانی فارسی کی "فارسی امروز"[120] سے جھاڑ پونچھ بھی کی تھی اور ہمیں معلُوم تھا کہ جدید فارسی میں ہوٹل کا کمرہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے مینجر صاحب سے ایک سنگل روم کی درخواست کی:

"جناب منتظم۔ من یک کمرہ برائے شخص واحدے خواہم۔"

---

[120] محترم ڈاکٹر عبد الحمید عرفانی کی تالیف۔

مینجر ہمارا مُنہ تکنے لگا گویا ہم کوئی قدیم فارسی بول رہے ہوں۔ خیر، ہم نے شک کا فائدہ مینجر کو دیتے ہوئے اپنا جملہ ذرا سلیس لہجے میں دہرایا:

"جناب منتظم، (وقفہ) من یک کمرہ (وقفہ) برائے شخص واحد (وقفہ) مے خواہم (تبسّم)۔

مینجر زیرِلب منمنانے لگا: "منتظم؟ کمرہ؟ چہ؟"

اب اگر باہمی افہام و تفہیم میں کہیں خرابی تھی تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری اس کند ذہن مینجر پر تھی۔ ہمیں ایک ہی فقرہ تیسری بار دہرانے کا یارانہ تھا۔ چنانچہ کسی قدر جنجھلا کر انگریزی میں کہا:

"MR MANAGER, I WANT A SINGLE ROOM[121]"۔

مینجر جھٹ بولا:

"THEN WHY DON,T YOU SAY SO"[122]?

---

[121] مینجر صاحب مُجھے ایک سنگل کمرہ چاہیے۔

[122] تو پھر یوں کیوں نہیں کہتے۔

ہماری جھنجلاہٹ فی الفور زائل ہو گئی کیونکہ یہ شخص ہم سے انگریزی بھی بہتر بولتا تھا اور اس خرابی کی ذمّہ داری جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، بیشتر ہم پر ہی تھی۔ خواہ مخواہ تیزی میں ناپختہ فارسی بول کر سبکی کرالی تھی۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت؟ انگریزی کی معرفت کمرہ حاصل کر کے اُوپر گئے۔ سامان رکھا اور ذرا سوچنے کا موقع ملا تو دفعتاً ہمیں "فارسی امروز" کا سنگل کمرہ مانگنے کے لئے یہ فقرہ یاد آ گیا۔ ہمیں کہنا چاہیے تھا:

"آقائے مدیر۔ اطاق یک نفرے دارید؟"

ظاہر ہے کہ اس فارسی اور ہماری فارسی میں یک کے علاوہ کوئی لفظ مشترک نہیں تھا۔ بہر حال اب ڈاکٹر عرفانی کی کتاب کے چند مزید فقرے یاد آنے لگے تو جی چاہا کہ نیچے جا کر آقائے مدیر کے ساتھ از سرِ نو گفتگو کریں اور اپنی شکست کا بدلہ لیں لیکن کہیں سے ڈاکٹر عرفانی کی آواز آئی:

"دیکھو میاں، محض تین چار کارتوسوں کے ساتھ حریف کو للکارنا عقلمندی نہیں۔ پھر شکست کھاؤ گے اور اس صورت میں اگر گھر لوٹے تو حسبِ دستور ہم تمہارا استقبال توبروں سے کریں گے۔ تمہاری فارسی گولیاں کچی ہیں۔ انہیں ابھی مت کھیلو اور 'فارسی امروز' کو بھی رسوانہ کرو۔ چندے اور مشق کرو۔"

ہم ڈاکٹر عرفانی کی فہمائش کا تجزیہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ذرا زیادہ شفقت آمیز لہجے میں حضرت علامہ نے بھی مشورہ دیا:

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

آپ جیکب ملک ہیں یا آدم ملک

چنانچہ نالہ تھام کر ہم نے پہلے غسل کیا۔ پھر اطاق ناہار میں جا کر ناشتہ کیا اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے آپ کو سیر تہران کے لئے تیار اور مشتاق پایا۔ لیکن ہمیں تہران سے آشنائی تھی نہ کسی تہرانی سے۔ اور یُوں مُنہ اُٹھا کر گھر سے گلی میں نکل پڑنے کو سیر نہیں کہتے۔ چنانچہ چاہا کہ کوئی ایسا رہنما مل جائے جو تہران کی راہوں کا رازداں ہو۔ سوچا کہ پاکستانی سفارت خانے میں کوئی ملٹری اتاشی تو ہو گا جو ممکن ہے ہمارا واقف نکل آئے اور ناواقف بھی ہوا تو فوجی رشتہ تو بہر حال ہے ہی۔ اگر خود نہ آ سکا تو شاید ایک کار اور ڈرائیور ہی بھیج دے۔ چنانچہ پاکستانی سفارتخانے کو فون کیا۔۔ جواب میں ایک صاحب بولے جو اپنے آپ کو مَلک کہتے تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور پوچھا:

”میں ملٹری اتاشی سے بات کر سکتا ہوں؟“

جواب آیا: "وُہ تو موجود نہیں۔ لیکن آپ نے مُجھے نہیں پہچانا؟"

اب جو مَلک فوری طور پر ہمارے ذہن میں آئے ان میں سے فتح محمّد مَلک کے علاوہ دو تین جنرل مَلک تھے، پانچ سات کرنل اور میجر مَلک۔ سو اگر ہم دو چار وزیرِ خارجہ قسم کے مَلکوں مثلاً آدم مَلک، جیکب مَلک وغیرہ کو حساب میں نہ بھی لیتے، جب بھی یہ کہنا آسان نہ تھا کہ ہمارے مخاطب کون سے مَلک ہیں۔ اور اگر وُہ ان گنے چُنے مَلکوں کے زمرے سے باہر تھے تو ظاہر ہے کہ ان کو پہچاننا اور مشکل تھا کہ وطنِ عزیز میں وُہ آدمی بھی جو گھر کی چار دیواری کے اندر مَلک نہیں، اس کے باہر ضرور مَلک ہے۔ اور ایسے ملوک کی تعداد شمار اور شناخت سے باہر ہے۔ چنانچہ عرض کیا:

"معاف کرنا۔ آپ کون سے مَلک ہیں؟"

بولے: "جب آپ میٹنگ پر کراچی آیا کرتے تھے تو میں آپ کا ٹی اے بل بنایا کرتا تھا۔ یاد آیا؟"

ہمیں ٹی اے بل کی خوشگوار یاد کے باوجود اس کے خالق کی یاد نہ آسکی لیکن کس مُنہ سے کہتے کہ یار بھلا دی ہے۔ چنانچہ نہایت خندہ پیشانی سے ایک مصلحت سے بھرپور جھوٹ بولا:

"اچھا اچھا۔ یاد آگیا۔ آپ ان دنوں ٹی اے کلرک تھے نا؟"

”جی ہاں، تھا مگر اب آپ کی دُعا سے افسر ہوں۔“

سوچا، جو شخص افسر بن جانے کے بعد بھی اپنی کلر کی کو نہ بھولا ہو، کوئی با کردار آدمی ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دِلی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

”مبارک باد ملک صاحب مبارک باد۔“

بولے: ”شکریہ۔ اور اب فرمائیں، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

کہا: ”ملٹری اتاشی صاحب سے تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر مُجھے ایک کار اور ڈرائیور عنایت کر سکیں تو میں تھوڑی سی تہران کی سیر کر لوں۔ میں ابھی ابھی تہران پہنچا ہوں اور کل صبح وطن جا رہا ہوں۔“

”آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟“

”ہوٹل انٹرنیشنل میں۔“

”آپ ایک گھنٹہ اور انتظار کر سکتے ہیں؟“

”کس کا؟“

”اس خادم کا۔ میں پورے گیارہ بجے کار لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ میری کار ذرا چھوٹی سی ہے مگر دو آدمیوں کو سیر کرا سکتی ہے۔“

"آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟"

مَلک ہنسا اور بولا:

"میں کار کے ساتھ شکریہ کی ترکیب بھی لیتا آؤں گا۔"

میں تنہا نہیں، صرف چھڑا ہوں

بے شک یہ کوئی اصلی مَلک تھا اور بطور افسر تو شاید ابھی بہت جونیئر تھا مگر سفیر ہونے کے قابل تھا۔ پاکستانی مسافروں کے لئے پاکستانی سفارت خانوں کی طرف سے ایسی تواضع خاصی کم یاب نعمت ہے۔۔۔ لیکن ہم نے رسیور رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے اُردُو میں آواز آئی:

"اگر آپ کو سفارت خانے کی کار کی بجائے غریب خانے کی کار میں سیر کرنے پر اعتراض نہ ہو تو خاکسار مع کار حاضر ہے۔"

اور پھر اس آواز کا مالک جو ایک تپائی کے سامنے بیٹھا کافی پی رہا تھا اُٹھا اور بڑھ کر ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا:

"مُجھے جمال حسین شاہ کہتے ہیں، معاف کرنا میں اتنا قریب بیٹھا تھا کہ آپ کی ٹیلیفون کی گفتگو سُنے بغیر چارہ نہ تھا۔"

ہمارے سامنے ایک سُرخ و سپید خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔ تعارف کا کیا انوکھا مگر دلربا انداز تھا! ہم نے اس کا ہاتھ مزید دباتے ہوئے کہا:

"بھئی دِل تو آپ نے دو لفظوں میں ہی موُہ لیا ہے لیکن کُچھ یہ بھی معلُوم ہے کہ غالب کون ہے؟"

بولا: "غالب جو کُچھ بھی ہے میرے لئے اتنا کافی ہے کہ میرا ہم وطن ہے۔ میں ٹیکسلا کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ایران میں ایئرویز میں تین سال سے انجینئر ہوں۔ اسی ہوٹل میں رہتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ آج چھٹی ہے اور یہ ہے میری کار۔ اب کہئے یہ کار یا وُہ کار؟"

ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس نہایت ہی پیارے اجنبی کو گلے سے لگا کر اتنا بھینچتے کہ اجنبیت کا آخری قطرہ نچڑ جاتا اور جب نچڑ چکا تو ہم نے جمال کی سپورٹس کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ کار!"

لیکن کار میں بیٹھنے سے پہلے مَلک سے معذرت کرنا لازم تھا اور اس ان دیکھے محسن کو یُوں جواب دے دینا بھی آسان مرحلہ نہ تھا۔ لیکن جب اسے یقین دِلایا کہ ہم خود نہیں بھاگ رہے بلکہ ایک سیلِ محبّت ہمیں کہیں بہائے لئے جا رہا ہے اور یہ کہ یہ سیل ایک شخص مسمی جمال حسین شاہ کا لایا ہوا ہے تو مَلک ایک پُراطمینان لہجے میں بولے:

”اگر آپ جمال کے ہاتھوں میں ہیں تو بخدا مجھ سے بہتر ہاتھوں میں ہیں۔“

معلُوم ہوا کہ جمال کی شہرت سے خود سفارت خانہ اکتسابِ فخر کرتا ہے۔ بہر حال مَلک سے فارغ ہوئے تو جمال بولے:

”آیئے۔ اب ذرا سکون سے ایک پیالی کافی پئیں اور پھر سیر کو نکلتے ہیں۔“

کافی کی میز پر بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر آتا جاتا اور خصوصاً ہر آتی جاتی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک دو یا دس لمحوں کے لئے رکتی ہے اور ایک شوق بھرے انداز میں کبھی ہاتھوں سے کبھی آنکھوں سے اور کبھی باتوں سے جمال کے مزاج پوچھتی ہے اور پچھواتی ہے، مذاق کرتی ہے اور کراتی ہے اور ہر چند کہ بلائے جاں ہے غالب ان کی ہر بات، تاہم جمال ہر ایک سے علیٰ قدر مراتب معاملہ کئے چلا جا رہا ہے۔ پھر یہ دو طرفہ اشارت و شرارت اس قدر مسلسل ہے کہ ہم جمال کے کمال سے تو محظوظ ہوتے ہیں لیکن اس سے کلام کا وقفہ نہیں ڈھونڈ پاتے۔۔۔ بالآخر کافی ختم ہوئی اور جمال اپنی آخری قدردان کی جنبشِ چشم کا جواب جنبشِ لب سے دے کر اُٹھا اور ہم کار میں جا بیٹھے۔ کتنی دیر سے ہمارے ذہن میں ایک سوال کسمسا رہا تھا۔ اب موقع ملا تو پوچھا:

”جمال۔ تم نے تو کہا تھا کہ یہاں تین سال سے ہو اور اکیلے ہو؟“

”کہا تو یہی تھا۔ کیا اس میں کوئی سقم ہے؟“

"شاید وُہ بھی ہو، لیکن غلط بیانی ضرور ہے، جس شخص پر اتنے قلیل وقت میں اتنی کثیر چھوکریاں اس حد تک مہربان ہو جائیں کیا وُہ اکیلا کہلا سکتا ہے؟"

"جناب میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ بے یار و مدد گار ہوں۔ فقط یہ کہ بے زوجہ ہوں۔ دراصل مجھ سے ٹیکنیکل غلطی ہوئی ہے۔ میں اکیلا نہیں چھڑا ہوں[۱۲۳]۔"

"لیکن اس بہتات کے ہوتے ہوئے تمہارے چھڑا رہنے کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا۔"

"یہ بہتات ہی تو جواز ہے۔ اگر ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کر لی تو باقی سب سے کٹ جاؤں گا۔"

"لیکن وُہ ایک جس سے جڑ جاؤ گے۔ بڑی خاص شے ہو گی۔ شریکِ حیات، جانِ تمنّا، رفیقِ زندگی، حاصلِ کائنات۔۔۔۔"

"جناب ابھی تک اس شہر میں شریکِ حیات قسم کی لڑکی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔"

---

[۱۲۳] چھڑا پنجابی میں اس مرد کو کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو۔

”وُہ کیوں؟ تہران میں تو اس جنس کی کمی نہیں ہونا چاہیے۔ اس گل اندا موں اور شیریں کلاموں کے شہر میں۔“

”یہ لڑکیاں بے شک بڑی میٹھی چیزیں ہیں لیکن ان کی مٹھاس کو دوام نہیں۔“

”یعنی؟“

”یعنی بڑی پیاری رفیقِ حیات ہیں بشرطیکہ حیات کی توقع دو تین سال سے زیادہ نہ رکھی جائے۔“

”ان حالات میں تو تمہارا چھڑا رہنے کا خطرہ بالکل حقیقی ہے۔“

”نہیں نہیں۔ صحیح وقت پر مُجھے نہایت صحیح بیوی ملے گی۔۔۔ میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے میں بیوی کے لئے رحمت سے کیا کیا اُمیدیں باندھ رکھی ہیں؟“

”جی ہاں۔ ایک ایسی لڑکی جو دیدار میں فرنگن ہو، گفتار میں ایرانی اور کردار میں پاکستانی۔“

”گویا تین عناصر ہوں تو بنتی ہے جمالو؟“

"بالکل۔۔۔ مگر جمالو کی بجائے میں جمیلہ کو ترجیح دوں گا۔"

"لیکن تمہاری جمیلہ کا نسخہ ہے ذرا ٹیڑھا سا۔ اس کی تیاری میں تو رحمت کو تین ملکوں کا دورہ کرنا پڑے گا۔"

"رحمت سے کُچھ بھی بعید نہیں۔ وُہ جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب۔"

ہمیں اس خوش فہمی سے اتفاق تو نہ تھا لیکن دوست کی دِلجوئی کے لئے کہہ دیا:

"اللہ کرے، اگلی دفعہ حباب کی جگہ جمیلہ[۱۲۴] اُٹھے۔"

جمال نے بآوازِ بلند کہا: "آمین" اور مضمون بدلتے ہوئے بولا:

"اب ہم خیابانِ سعدی سے گزر رہے ہیں۔"

---

[۱۲۴] یہ ایک سال بعد کی بات ہے کہ جمالی مُجھے راولپنڈی میں ملنے آئے تو ساتھ اپنی حسین و جمیل دلہن کو بھی لائے۔ تعارف پر معلُوم ہوا کہ آپ سوئٹزلینڈ کی رہنے والی ہیں۔ فارسی بولتی ہیں اور پاکستانی طرزِ زندگی کی دِلدادہ ہیں۔ نام VERA تھا لیکن جمال کہنے لگا تمہارے لئے جمیلہ ہے! (مصنّف)

سردار جی' آپ اس جنگل میں کہاں ہیں؟

ہمیں اس خیابان میں شیخ سعدی یا ان سے ملتے جلے بزرگ تو نظر نہ آئے لیکن کُچھ ان سے بھی بھاری گاڑیوں اور لمبی داڑھیُوں والے سکھ چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔ ہمیں یاد آیا کہ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے گاؤں بل کسر کے بیشتر سکھ ایران میں تجارت کرتے تھے اور ان کے لڑکے ہمارے ساتھ گاؤں کے سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی حافظے کے پردے پر تیجا سنگھ، سردول سنگھ، کرپال سنگھ اور دُوسرے ہم جماعت نمودار ہوئے۔ ہم نے سوچا: کیا عجب کہ یہ لوگ اب یہاں ہوں۔ چنانچہ ہم کار سے باہر نکلے اور ایک پاس سے گزرتے ہوئے بھاری بھرکم دراز ریش سکھ کو ٹھہرا کر پوچھا:

"سردار جی یہاں کوئی بلکسر کے سکھ بھی ہیں؟"

بولا: "آپ نے کس کو ملتا ہے؟"

"کوئی ہو، مگر بلکسر کا ہو۔"

"ایک تو میں ہوں۔"

اور پھر ذرا غور سے دیکھنے کے بعد ہمیں کہنے لگا:

"اوئے توں تے محمّد خاں ایں۔ او سوہنیو، تسیں کیڑے پاسیوں"[125]۔

لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اپنی آمد کی سمت کا نام لے سکتے، سردار جی نے ہمیں بازوؤں میں لپیٹ لیا۔ یُوں جیسے روسی ریچھ نے گلے لگا لیا ہو۔ اس ہمکناری کے دوران ہم نے کسی نہ کسی طرح سانس لینے کا بندوبست کیا اور جب گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو پورا سانس لے کر اس بے تکلّف ہم جماعت کو پہچاننے کی کوشش کی اور کہا:

"تم تیجا سنگھ ہو نا؟

ہنس کر بولا۔ "نئیں۔ اک واری فیر بُجھ"[126]۔"

میں نے سردار جی کی داڑھی کے پھیلاؤ اور مونچھوں کے گھیراؤ سے گزر کر بائیس سال پیچھے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن روشنی نظر نہ آئی۔۔۔ توکل پر کہا:

"سردول سنگھ؟"

---

[125] ارے تو تو محمّد خان ہے۔ پیارے کس طرف سے؟

[126] ایک بار اور بوجھو۔

بولا: چھوڑ یار۔۔۔ تینوں[127] ساریاں چبلاں یاد نیں نے اپنے گوانڈھی نوں بُھل گیا ایں۔۔۔ میں کرپال آں۔"

معاً مُجھے وُہ گورے گلابی گالوں والا سکھ لونڈا یاد آیا جس کے ساتھ میں اپنی گلی میں پہروں[128] چینچی کھیلا کرتا تھا۔ میں نے اس کی موجودہ داڑھی کا سروے کرتے ہوئے کہا۔

"کرپال معاف رکھنا اب تمہاری آواز تو میں نے پہچان لی ہے مگر بتا سکتے ہو کہ تم خود اس جنگل میں کہاں ہو؟"

کرپال نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا:

"میں بالکل وُہیں ہوں جہاں نائی سے تیس سال دور رہ کر تم بھی ہو سکتے تھے۔"

کرپال کو اپنے حلیئے پر اختیار نہ تھا۔ لیکن اس کی ظرافت میں وُہی سکھوں کی روائتی توانائی تھی۔ جمال سے تعارف کرایا تو ہم دونوں کو کھینچ کر اپنی سپیئر پارٹس کی خوبصورت دکان میں لے گیا۔ اور اپنے ایرانی نوکر کو بڑی تیز فارسی میں چائے لانے کا

---

[127] چھوڑ یار۔ تمہیں سارے چغد یاد ہیں اور اپنے ہمسائے کو بھول گئے۔ میں کرپال ہوں۔
[128] ایک ٹانگ پر کودنے کا کھیل۔

حکم دیا۔ کرپال کے مُنہ سے فارسی سُنی تو مجُھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وُہ خود بھی مسکرا پڑا اور بولا:

"بھئی میں نے چائے کا آرڈر دیا ہے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔"

"لطیفہ تم نے نہیں تمہاری فارسی نے سُنایا ہے اور اس پر ضمیر کے دو مصرعے یاد آ گئے ہیں۔"

"اوئے جمیر کی کہندا اے؟"

"سردار جی، او کہندے نیں:

فارسی پنجاب کے کھیتوں میں دوڑائی گئی[۱۲۹]

---

[۱۲۹] سیّد ضمیر جعفری کی مشہور نظم قوالی سے۔ پورا بند یُوں ہے۔

اک دوہے کی "دوئی" سو بار دہرائی گئی
لے کبھی چھوڑی، کبھی پوری پکڑی، کبھی کھائی گئی
فارسی پنجاب کے کھیتوں میں دوڑائی گئی
شیخ سعدی کی غزل در گا میں در گائی گئی
سوُہنی جس موج میں ڈوبی وُہ جوئے شیر تھی
محمل لیلیٰ کو الٹایا تو اندر ہیر تھی

شیخ سعدی کی غزل در گا میں در گائی گئی"

بولا: "او شیخ سعدی کے مارے ہوئے، میں نے فارسی زبان گرامر کے زور سے تھوڑی ہی سیکھی ہے۔"

کہا: "خدا نہ کرے آپ گرامر کے محتاج ہوں۔ اور یہ تہمت میں گھڑ بھی کیسے سکتا ہوں؟ مُجھے معلُوم ہے خالصہ سکھاشاہی کے زور سے فارسی سیکھتا ہے۔"

بولا: "دیکھ۔ بات اتنی ہے کہ میں سالم موٹر نہیں بیچتا۔ موٹر کے سپئیر پارٹس بیچتا ہوں۔ اور سالم فارسی بھی نہیں بولتا۔ فارسی کے سپئیر پارٹس ہی بولتا ہوں اور گرو کی کرپا سے کاروبار ٹاپ پر ہے۔"

اتنے میں چائے آگئی۔ چائے مع تکلّفات دیکھی تو معلُوم ہوا کہ کرپال نے چائے کا آرڈر سالم فارسی ہی میں دیا تھا۔ چائے پی لی تو اگلا مرحلہ کرپال سے رخصت کا تھا۔ کہا:

"کرپال۔ اب اجازت! پورے تیس منٹ ہو چکے ہیں۔"

بولا: "میں تمھیں پورے تیس دن یہاں رکھوں گا۔"

"اگر میں تیس دن کی غیر حاضری کے بعد وطن لوٹا تو آگے کورٹ مارشل میرے انتظار میں ہو گا۔"

"تو مت جانا۔ تمھیں کہیں نوکری دِلا دیں گے۔"

"پاکستان میں نوکری کے علاوہ بیوی بچّے بھی ہیں۔"

"چلو بیوی کا بھی یہاں بندوبست کر دیں گے۔"

یہ سن کر جمال نے نفی میں سر ہلایا اور ہم نے بآوازِ بلند کہا:

"نامنظور۔"۔۔۔اور اُٹھ کھڑے ہوئے

یہ آپ کے سینے پر دال کیسی ہے؟

خیابانِ سعدی سے خیابانِ فردوس میں آئے جہاں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور یا فروش گاہیں ہیں لیکن مقصد خرید نہ تھا بلکہ خالص دید۔ کیونکہ تہرانی قیمتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر پوری آئل کمپنی کی نہیں تو کم از کم دو چار چشموں کی ملکیت لازم ہے اور ہمیں تو یہاں کسی پانی کی ٹونٹی پر بھی کوئی اختیار نہ تھا۔ لیکن خیابانِ فردوسی کی دید مفت تھی اور وہاں دیکھنے کو کیا کچھ نہ تھا؟ وُہ سلیقے سے سجی ہوئی دکانیں۔ وُہ طریقے سے گھومتے ہوئے خریدار اور وُہ عقیقے کی طرح مونڈتے ہوئے دکاندار۔ پھر ان سیدھے لمبے بارونق بازاروں کہ وُہ کوچہ کوچہ سبزہ زار، وہ خیابان خیابان ارم، وُہ روش روش گلزار اور سب سے بڑھ کر تہران کے لوگ: مرد خوش شکل اور خوش پوش اور وضع میں

خالص فرنگی۔ عورتیں خوب رو اور خوش لباس لیکن وضع میں مختلف منازلِ ارتقا پر اٹکی ہوئی۔ بیشتر لڑکیاں منی سکرٹ اور ہاٹ پینٹس کی منزل میں یا کسی قدر آگے لیکن کئی ایک سکرٹ پہننے کے باوجود اُوپر کالی چادر میں ملفوف، اگرچہ ایرانی چادر بھی اب پاکستانی برقعے کی طرح دیارِ حرماں سے کوسوں نکل چکی ہے۔ ہمارے یہاں تو خیر اب برقعے کے علاوہ دوپٹہ بھی رخصتی سلام کر رہا ہے کہ ایک عرصے سے دوپٹے کی صرف "د" ہی باقی ہے اور وُہ بھی محض علامتی شکل اختیار کرنے والی ہے۔ یعنی کسی دن کوئی پائنیر [۱۳۰] مزاج خاتُون دوپٹے کی بجائے سینے کی جیب پر ریشم سے حرف "د" کاڑھے گی اور پارٹی میں نکل آئے گی۔

خیابانِ فردوسی سے شاہراہِ رضا شاہ کو نکلے۔ یہ سیدھی قصرِ گلستاں کو جاتی ہے جہاں شہنشاہِ ایران رہتے ہیں۔ ہم محل کے اندر تو خیر نہ جا سکے لیکن اتنے قریب ضرور منڈلاتے رہے جتنا کوئی بن بلایا مہمان منڈلا سکتا ہے۔ اگر اندر سے شہنشاہ کسی کو ذرا اونچی آواز دیتے تو ہم شک کا فائدہ اُٹھا کر حاضرِ خدمت ہو کر کہہ سکتے تھے: "ارشاد، جہاں پناہ۔"۔۔۔ لیکن شہنشاہ لوگ کسی کو زور سے آواز دے کر بُلانے کے عادی نہیں ہوتے۔۔۔ شاہی کاروبار اشاروں سے ہی ہوا کرتا ہے اور اس محل میں کسی اشارے کا

---

[۱۳۰] PIONEER کسی بڑے کام کی پہل کرنے والا یا والی۔

روئے سخن ہماری طرف نہ تھا سوائے پاسبان کی ٹکٹکی کے۔ اور پاسبان کے قدم لے کر غالب نے کیا پایا تھا جو ہم یہ بے وقوفی کر بیٹھتے؟ بہر حال ہم نے دِل ہی دِل میں شاہ کو درازئ عمر کی دُعا دی اور چل نکلے۔

دن کا ایک بج رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دُوسرے کی حالت دیکھی تو اس بات پر متفق ہوگئے کہ بھوک لگ رہی ہے۔ جمال بولے:

"یہ تاریخی بھوک کسی معمولی ریستوران میں ضائع کرنے کی نہیں۔ یہ رائل تہران ہلٹن کی مستحق ہے۔" اور اگلے لمحے کار کا رُخ ہوٹل ہلٹن کی طرف تھا۔

کسی عورت کا تیسرا خاوند بننے میں احتیاط لازم ہے

تہران شہر سے ہوٹل ہلٹن جانا ایسا ہی ہے جیسے راولپنڈی سے اسلام آباد سیکرٹریٹ کو جانا۔ وُہی گہرے نیلے پہاڑوں کا پس منظر، وہی تازہ تازہ اجلی اجلی بکھری بکھری عمارتیں، وُہی عمارتوں کے درمیان سست کیسہ مالکوں کے بے شمار خالی پلاٹ اور یوں ان جدید عمارتوں کے درمیان چونے اور پینٹ کے ساتھ جنگلی گھاس اور تازہ مٹّی کی خوشبو جو تمام نئی بستیوں کا خاصہ ہے۔ لیکن ایک دفعہ ہلٹن میں پاؤں رکھا تو جنگلی گھاس اور مٹّی تو درکنار خود تہران کسی بغلی دروازے سے کھسک گیا اور ہم ایک چھوٹے سے

امریکہ میں آ نکلے! وُہی قطار اندر قطار امریکی ٹورسٹ لگاتار جگالی کرتے ہوئے اور بے شمار گپیں ہانکتے ہوئے۔ وُہ گپیں جو جگالی کرتے ہوئے بر آمد ہوں اکثر ناک کے رستے نکلتی ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات یہ غلط شبہ ہونے لگتا ہے کہ امریکیوں کے حلق میں خدا نے بنی بنائی تنوین رکھ دی ہے۔ لیکن جب بھی مُنہ کھولیں معلُوم ہوتا ہے آناً فاناً و طوعاً و کرہاً کا ورد کر رہے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ ان کے لہجے سے کان مانوس ہو جائیں تو امریکی ہیں رونقِ محفل۔ انگریزوں کی طرح انہیں سماجی قبض نہیں۔

ایک تو خوش ہاضمہ آدمیوں کی طرح کھل کر ملتے ہیں۔ دُوسرے اپنے مخاطب سے ہم سطح ہو کر بات کرتے ہیں۔ انگریزوں کی طرح دمِ گفتگو نسلی ایڑیاں نہیں اٹھا لیتے۔ چنانچہ لونج میں داخل ہوئے تو ناواقف امریکیوں اور امریکنوں نے بھی نظریں ملتے ہی بھری مجلس میں ہنسی بھری علیک سلیک کی۔ اِکا دُکا تہرانی بھی نظر آئے۔ ان لوگوں نے اظہارِ تواضع میں ابتدا تو نہ کی لیکن ہم نے اپیل کر دی تو نہایت شیریں ادائی سے جواب دیا:

”مرحمت شمازیاد۔ سایہ عال مستدام۔۔“

اور ہم نے محض فارسی کے میٹھے جملے سننے کے لئے ہر ایرانی اور ہر ایرانن کو دیکھتے ہی سلام مسنون پہنچانا شروع کر دیا۔ اور ہر بار شہد میں لپٹی ہوئی رسید پائی۔ تا آنکہ ایک

تاب شکن ایرانی دوشیزہ تک جا پہنچے جو خالص شہد کی ٹیوب لگتی تھی۔ لیکن ایسی ٹیوب کہ شہد حاصل کرنے کے لئے اسے کسی مقام پر دبانے کی ضرورت نہ تھی۔ خود بخود بات بات پر لچک کھا کر تھوڑا سا شہد انڈیل دیتی تھی۔ جمال کو دیکھتے ہی بولی:

"چہ خوب شد، شمارا دیدم۔ بفرمائید۔ چشمِ ما روشن، لطفِ فرمودید۔"

جی ہاں، وُہ تھی تو ہلٹن کی ایک افسر مہمان داری لیکن اگر وُہ ہوٹل کا مخصوص لباس اتار کر سر پر تاج رکھ لیتی تو کئی چھوٹے موٹے شہزادے اسے تخت بھی پیش کر دیتے۔ بہر کیف اگلے نصف گھنٹے میں اس کی تخت نشینی کا امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس ہو سکنے والی ملکہ نے نہایت اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ ہماری۔۔۔ یا یُوں کہیں کہ جمال کی۔۔۔ تواضع کی اور بیرے کو ہماری خاطر خصوصی ہدایات دیں۔۔۔ تعارف پر معلُوم ہوا کہ جمال کی پرانی کرم فرماہیں اور روحی کہلاتی ہیں۔۔۔ کھانا آیا تو لذیذ پایا لیکن روحی یا روحی کی باتوں سے زیادہ لذیذ نہ تھا۔ بار بار کہتی:

"خواہش می کنم ازیں ہا میل دارید۔"

"چشم۔ بہ طور کہ میل شما باشد۔۔۔"

روحی اپنی باتوں کے رستے براہ راست ہمارے دِل میں اترنے لگی تو ان دونوں کی فارسی گفتگو میں ہم اُردُو میں مخل ہوئے اور جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”جمال، یہ کتنی پیاری لڑکی ہے یار۔ میری مانو تو اس سے آنکھیں بند کر کے شادی کر لو۔“

جمال نے اُردُو میں جواب دیا: ”بہت اچھا۔ مگر کسی عورت کا تیسرا خاوند نے سے پہلے تھوڑی سی آنکھیں کھول لی جائیں تو کوئی حرج ہے؟“

ہم ٹھٹھک سے گئے اور کسی قدر بوکھلا کر بولے:

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ محترمہ اس عمر میں دو چار خاوندوں سے سبکدوش ہو چکی ہیں؟“

جمال سنجیدگی سے بولا:

”حضور! یہاں تک آپ نے ٹھیک سمجھا ہے۔ اور اس کے بعد آپ کو یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہونا چاہیے کہ محترمہ اب تیسرے کی گھات میں ہیں اور ایسے شکار کے لئے ہلٹن سے بہتر کوئی کمین گاہ نہیں۔“

تو اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ۔ ہم نے بیرے سے ٹھنڈے پانی کا گلاس مانگا۔ جمال سے باتوں میں مخل ہونے کی معذرت چاہی اور اس کی شادی کا منصوبہ منسوخ کرتے ہوئے صرف روحی کی روح افزا باتیں سننے لگے کہ بطور

بیوی کتنی ہی مضرِ صحت سہی، بطور ہم نشیں روحی سے زیادہ صحت بخش کوئی جنس نہ تھی۔ باتوں باتوں میں، آخر کار جمال پر اپنے جادو کا گھیر اتنگ کرتے ہوئے کہنے لگی:

"دیشب بخیال تو بخواب رفتم۔ باور کن، تا صبح نقش روئے تو در دیدہ من بود[131]۔" روحی کے کلام کا ہم پر پر اثر ہونے لگا۔ روحی فقط آواز سہی لیکن آواز تو بلبل کی تھی۔ ہم نے چپکے سے جمال کو کہا کہ میاں شادی نہ سہی اسے جھوٹ موٹ ہی دِل تو پیش کر دو۔۔۔۔ لیکن جمال کہ دِلبرانِ تہران کے سہ سالہ خوابوں کا تجربہ رکھتا تھا، جادو کا گھیر اتوڑتے ہوئے بولا:

"روحی از لطف شما خیلے ممنونم۔ امشب من ہم بخیال تو بخواب خواہم رفت[132]۔ حالا بل بیار۔۔۔"

گویا ہدیۂ دِل پیش کرنے کی بجائے جمال کہہ رہا تھا کہ بل پیش کیجئے۔ چنانچہ بل آیا، ادا ہوا اور ہم سیر تہران کے اگلے مرحلے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

---

[131] کل رات تمہارے خیال میں سو گئی۔ اور یقین جانو کہ صبح تک تمہاری تصویر میری آنکھوں میں رہی۔

[132] روحی تمہاری مہربانی کا شکریہ آج رات میں بھی تمہارا خیال کرتے کرتے سوؤں گا۔ اب ذرا بِل لاؤ۔

طے پایا کہ ابھی مضافاتِ تہران کی گردش کی جائے۔ اور شام کرنل نقی کے ساتھ گزاری جائے۔ جمال نے کرنل نقی کو فون کیا تو اُدھر سے جواب آیا:

"آپ نے میرے پاس آنے کے لئے بڑا صحیح دن چُنا ہے کہ آج ہی بیوی گھر میں نہیں۔ افراد کی زندگی میں ایسی نادر ساعتیں قسمت سے ہی آتی ہیں۔ آیئے یہ جشن مل کر منائیں۔ میں دو دوست اور بھی بلا رہا ہوں۔"

ایران میں جملہ جذبات بوسوں کی راہ ہی اظہار پاتے ہیں

الوند کے دامن میں دربند کی طویل سیر کے بعد شام کو نقی منزل پہنچے جہاں کرنل صاحب کو انتظار کرتے پایا۔ توقع سے زیادہ کم عمر نظر آئے۔ جمال نے بتایا تھا کہ ابھی ابھی فوج سے ریٹائر ہوئے ہیں لیکن شکل وصورت سے یُوں لگتے تھے جیسے کپتانی ہی میں استعفی دے دیا ہو: لب ور خسار جانانہ، اطوار عاشقانہ اور گفتار فاسقانہ۔ ہم سے بغلگیر ہوئے تو ہمارے گلے پر دونوں طرف دو دو بوسے ٹائپ کر دیئے۔ پوچھا:

"کیا ایک ایک کافی نہیں؟"

بولے: "تمہارے لئے ہیں اور دو کشورِ عزیز پاکستان کے لئے۔"

پتہ چلا کہ کُچھ عرصہ قبل کشورِ عزیز پاکستان کے مہمان رہ چکے تھے۔ اور اب تک اپنے لب و دہن میں پاکستانی تواضع کا ذائقہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اب پاکستانیوں کو دیکھ کر ان کا جوشِ ممنونیت لب و دہن کے رستے ہی امڈ آتا تھا۔۔۔۔۔ ویسے بھی ایران میں جملہ جذباتِ شوق بوسے کی راہ ہی اظہار پاتے ہیں خواہ مقابلے میں کرپال چسگھ ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ چنانچہ واضح تھا کہ نقی چار بوسوں کے بعد بھی کسی قدر تشنگی محسوس کر رہے ہیں اور چو کنا رہنے کا مقام ہے۔

صحن میں چند خالی کرسیاں رکھی تھیں۔ جمال نے پوچھا:

"تو کیا ابھی تک دُوسرے دوست نہیں آئے۔"

بولا: "اندر بیٹھے ہیں۔"

ڈرائنگ روم میں گئے تو صوفے خالی پڑے تھے۔ بیٹھنے لگے تو نقی بولے:

"اور اندر آیئے۔"

اور اگلا دروازہ کھلا تو اس تکلّف سے گویا بتکدے کا در کھلا۔ حیرت میں ہمارے مُنہ سے نکلا:

"خدایا، ہم رنگ و بو کی کون سی دُنیا میں آ نکلے ہیں؟"

نقی نے مسکراتے ہوئے ہمارے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا:

"گھبرائیے نہیں۔ اپنا ہی گھر ہے، فقط آپ نے خاکسار کی پرائیویٹ بار میں قدم رکھا ہے۔"

ایک کرنیل کے گھر میں پرائیویٹ[133] بار! ایک پورا ذاتی مے کدہ! یعنی اپنے ہی غم اور اپنی ہی صہبا، اپنے ہی سبو اور اپنے ہی جام، اپنے ہی ساقی اور اپنے ہی پیمانے۔ اس عیاشی کا یقین نہیں آتا تھا۔ آخر ہم بھی کرنیل تھے لیکن جتنے نقی کی بار میں آبگینے تھے اتنے ہمارے گھر میں آبخورے بھی نہ تھے۔ کیا ہماری کرنیلی محض کاغذی کرنیلی تھی؟ کیا ہمیں آزاد اور خود مختار مملکتِ پاکستان نے کمشن نہیں دیا تھا؟ کیا وُہ نمرود کی خدائی تھی؟ اور چلو ہم تو ٹی ٹوٹلر[134] فقیر سہی، ہم نے پاکستان اور انگستان میں کئی اصلی مے نوش کرنیلوں اور جرنیلوں کے گھر بھی دیکھے تھے اور وُہ سب اس تہران گھر کے مقابلے میں چیل کے گھونسلے لگتے تھے۔ پھر کرنل نقی کوئی رائج الوقت کرنل بھی نہ تھے۔ ریٹائر ہو چکے تھے اور قاعدے کی رُو سے انہیں یُوں لگنا چاہیے تھا جیسے وُہ جا رہا ہو

---

[133] مَے خانہ

[134] شراب سے اجتناب کرنے والا۔

کوئی شبِ غم گزار ک۔ لیکن وُہ یُوں لگتے تھے جیسے مستقل طور پر حجلۂ عروسی میں قیام پزیر ہوں اور فقط ہوا خوری کے لئے باہر نکلتے ہوں۔ ہم پوچھے بغیر نہ رہ سکے ؟

"کرنل صاحب، گستاخی معاف۔ ریٹائر شدہ کرنیلی میں یہ اللّے تللّے کیسے ؟"

نقی بولے: "ہمارے ہاں پنشن تنخواہ سے قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں ریٹائرڈ کرنل کُچھ اور زیادہ گراں بہا ہو جاتا ہے۔۔۔۔ ایلیمنٹری، مائی ڈیر واٹسن!"

ہم خاموش ہو گئے کہ ہمارے ہاں یہ خوبی فقط ہاتھی میں پائی جاتی ہے۔ اور ہاتھی کو بھی اس خوبی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے پہلے ذرا مرنا پڑتا ہے۔ ایرانی کرنل کو اتنا انتہائی قدم اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ صرف ریٹائر ہونا کافی ہے۔۔۔ اور ابھی ہم نے سارے اللّے تللّے بھی نہ دیکھے تھے۔ نقی کے دوست بار کے روبرو اپنے چرمی سٹولوں پر ہماری طرف پشت کیلئے بیٹھے تھے۔ ہم قریب پہنچے تو ان دونوں نے اٹھے بغیر اپنے رُخ ہماری جانب موڑے۔ بار کی دھیمی روشنی میں معاً ہمیں یُوں محسوس ہوا جیسے کسی سامنے سے آنے والی کار نے اچانک ہیڈ لائٹس روشن کر دی ہوں۔ ایک مدّت تک ملنے کے بعد ہماری چندھیائی ہوئی آنکھوں کی بینائی بحال ہوئی تو درخشندہ نجوم کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہم نے نقی سے پوچھا:

"آپ کی پرائیویٹ بار میں کیا یہ آپکے پرائیویٹ ستارے ہیں؟"

بولا: ”آج کی رات یُوں ہی سمجھ لیں۔ اور آیئے ملئے ان ستاروں سے: یہ ہے زہرہ اور یہ ہے نجمہ۔“

اگر زہرہ واقعی زہرہ تھی تو نجمہ محض نجمہ نہ تھی، آفتاب تھی۔ ہم نے ان نجوم سے ہاتھ ملایا تو جیسا کہ ناگزیر تھا۔ ایک پل میں زمین کی کشش سے نکل کر آسمان پر پہنچ گئے۔ اور جتنی دیر ہاتھ میں ہاتھ رہا یوں محسوس ہوا جیسے بے وزنی کے عالم میں خلا میں تیر رہے ہوں۔ ہم تو خیر ہاتھ چھوڑ کر جلد ہی زمین پر اُتر آئے لیکن جمال ایک مدّت تک خلانوردی کرتے رہے کہ ایک مدّت تک نہ انہوں نے ہاتھ چھوڑا، نہ اُسنے چھڑایا۔ یعنی جب تک کہ نقی نے ان کے ملے ہوئے ہاتھوں پر انگلی رکھ کر یہ یاد نہ دِلایا کہ مصافحہ دوامی نہیں ہوا کرتا۔۔۔ آخر جب ہمارے قدم مضبوطی سے زمین پر ٹک گئے تو ہم نے نظر بھر کر زہرہ اور نجمہ کو دیکھا اور ہمارے مُنہ سے اس قدر پر خضوع سبحان اللہ نکلی جیسے ہماری ٹھوڑی سے بالشت بھر ڈاڑھی بھی لٹک رہی ہو، بلکہ اس پر ہم نے غالباً فرضی ہاتھ بھی پھیرا۔ اتنے میں نقی کے اشارے پر زہرہ اپنی نشست سے اُٹھی اور بار کے پیچھے جانے لگی۔ ہمیں زہرہ کا سراپا نظر آیا تو ساتھ ہی احمد ندیم قاسمی کا شعر بھی یاد آیا:

یاد آئے تیرے پیکر کے خطوط

اپنی کوتاہئ فن یاس آئی!

اور ہمیں پیکر زہرہ دیکھ کر نہ صرف اپنی کوتاہئ فن یاد آئی بلکہ درہ خیبر کی ریلوے لائن بھی یاد آئی گو اس کے موڑ تعداد میں کسی قدر کم ہیں۔ زہرہ کیا تھی؟ چند حسین دائروں اور رنگین قوسوں کی پیچاں و لرزاں موج! اور زہرہ کا اپنی جگہ سے اُٹھ کر بار کے پیچھے جانا کیا تھا؟ اس لرزان و پیچاں موج کا بے پرواخرام! لیکن یہ سب بڑی ناکام تشبیہیں ہیں۔ جہاں شاعر فیل ہو گیا، ہم کیا تیر مار لیں گے۔ بہر حال یہ شاعری کا نہیں، شیدا ہونے کا مقام تھا۔ لیکن ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش رہنے اور زہرہ کو دیکھتے رہنے کا۔

زہرہ بار کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور پھر اس نے وُہی کُچھ کیا جس کے لئے مشیعت نے اسے وضع کیا تھا، ساقی گری۔ حاضرینِ مجلس سے پوچھے بغیر ساقی نے اپنی پسند کے مشروبوں سے پانچ جام بھرے اور اس انداز سے کہ ساغر کو رنگِ بادہ سے پُرنور کر دیا۔ پھر جملہ شرکائے مجلس کو۔۔۔ جو بار کے گرد کھڑے تھے۔۔۔ یکے بعد دیگرے پیش کئے۔ ہماری سمت بھی زہرہ نے ایک کف بلَب پیالہ بڑھایا۔ ہم جھجھکے تو ساقی نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ شے بے شک حرام ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ چشمِ ساقی کا اشارہ پانے کے بعد بھی حرام تھی؟ مفتی صاحب تو وہاں تھے نہیں۔ اپنے دِل سے پوچھا۔ دِل نے کہا مباح ہے۔ چنانچہ ہاتھ بڑھا کر جام تھام لیا۔ باقی ساتھیوں نے

دِل سے فتویٰ لئے بغیر ہی جام اُٹھا رکھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ ہم اپنا جام ہاتھ میں لے کر بلند کریں کہ پانچوں ساغر باہم کھنکھنا کر لبوں تک لے جائے جائیں۔ ہم نے ناظرین کی بے تابی دیکھی تو اپنا جام ان کے جاموں سے کھنکھنایا۔ معاً ہمارے ساتھی ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے پینے لگے لیکن ہم سوچ میں پڑ گئے۔ ہم نے انگریزی میسوں میں ہزار طعنوں اور تحریصوں کے باوجود مَے کو مُنہ نہ لگایا تھا لیکن آج کی رات کے تقاضے مختلف تھے۔ برٹش میسوں میں ہمیں کسی زہرہ نے جام بھی تو پیش نہیں کیا تھا اور آج جب ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا تو ہمارے اندر کا جگر بیدار ہوا اور پھر جیسا کہ جگر کا دستور تھا، رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا، لیکن معاً کھلا کہ رحمت کو بہلانا غیر ضروری تھا: ہمارے ساغر میں کوکا کولا ہی تھا! اتنے میں ایک چہار دہ سالہ لڑکا گلے میں وائلن لٹکائے اور ایک دِلآویز دُھن بجاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ نجمہ کے پاس آیا اور وائلن کو بجاتے بجاتے جھُک کر اسے سلام کیا۔ جواب میں نجمہ نے ایک لمحہ کے لئے وائلن کے تاروں کے ساتھ اپنے دِل اور گلے کے تار ملائے، پھر ذرا گُنگنائی اور آخر میں ایک دِلربا سی لَے میں نغمہ پیرا ہوئی:

بازبہ سرمہ تاب دہ چشمِ کرشمہ زائے را

ذوقِ جنوں دوچند کن شوقِ غزل سرائے را

ہم مطلع سے ہی پہچان گئے کہ غزل اقبال کی ہے۔ اور ہمارے میزبانوں کی طرف سے خاص تحفے کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ اقبال کا کلام اور نجمہ کی آواز، ہم پر دوہری مستی چھانے لگی اور جب نجمہ نے یہ شعر دہرایا:

بزم بہ باغ و راغ کش زخمہ بہ تارِ چنگ زن

بادہ بخور، غزل سرا، بندِ کشا قبائے را

تو جملہ حاضرین نہ صرف شریکِ غزل سرائی ہو گئے بلکہ شریکِ بند کشائی بھی ہو گئے۔۔۔ الغرض غزل کے ختم ہونے تک حال و قال کی کوئی ایسی کیفیت نہ تھی جو اہلِ مجلس پر نہ گزری ہو۔ وُہ ابتدائے سفر کی آرزو کہ ہمارے سفر کی انتہا کسی ترک شیرازی کے اس دِل نشیں کلمے پر ہو کہ "بوہے وچ تاں کھلی آں مت ماہیا آ نکلے۔" ضرورت سے بڑھ کر پوری ہو چکی تھی۔ ترک شیرازی نے گلی کی بجائے حریمِ ناز میں بازیابی بخشی تھی اور اس طرح علاقائی تعاون کو علاقائی وصال کی حد تک فروغ دے دیا تھا۔ غزل کے خاتمے پر نقی نے مغنیہ اور وائلن نواز کو مشروبِ خاص کے دو جام بطور انعام پیش کئے۔ وائلن نواز لونڈے نے اپنا جام نجمہ کے جام سے کھنکھنایا اور ایک ہی سانس میں پی کر دُوسرے کی امید پر پھر وائلن بجانے لگا۔ لڑکے کو دیکھ کر ہم حیران ہو رہے تھے۔ اس چھوٹی عمر میں مے و نغمہ کا یہ لپکا؟ ہم نے نقی سے پوچھا:

"یہ لڑکا کون ہے؟"

نقی بولا: "ایں حسن است۔ پسرِ خود من است۔ خیلے سعادت مند است[۱۳۵]۔"

"پسر؟" میں نے حیران ہو کر دِل میں کہا۔ پھر پسر سے آنکھ بچا کر پدر سے کہا:

"کرنل صاحب۔ اس محفل میں حسن کو شریک نہ کرتے تو بہتر نہ ہوتا؟"

بولے: "نہ۔ نہ۔ نہ۔ باہر جاتا تو کوئی بری بات سیکھ کر آتا۔"

چنانچہ حسن کے ساتھ ہم نے بھی اچھی اچھی باتیں سیکھنا شروع کیں۔ جب آخری سبق پر پہنچے تو حسن گریجوایٹ ہو چکے تھے اور ہم بھی اچھے خاصے منشی فاضل ہونے کو تھے۔ مگر اب رات ڈھلنے لگی تھی اور سحر کے آثار پیدا ہو رہے تھے یعنی رخصت کا وقت قریب تھا۔۔۔ ایرانی اپنے مہمان کو رخصت بھی بوسوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب پورے چھ نفر ایک دُوسرے کو دو بوسے فی رخسار فی سیکنڈ کے حساب سے الوداع کہہ رہے تھے۔ ہماری ریاضی کمزور ہے مگر غالباً بوسوں کی مجموعی تعداد کوئی ایک سو بیس بنتی تھی۔ قصّہ مختصر بوسوں کے نزول کا یہ عالم تھا گویا ڈاک خانے میں مہریں لگ رہی ہوں۔

---

[۱۳۵] یہ حسن ہے۔ میرا اپنا بیٹا۔ بڑا سعادت مند بچّہ ہے۔

سوہنی دھرتی

اگلی صُبح پی آئی اے کا بوئنگ ہمیں تہران سے اُڑا کر کراچی لا رہا تھا۔ مسافر کو سفر میں نشیب و فراز سے دوچار ہونا لازم ہے لیکن جیسا کہ شروع میں کہیں کہا ہے، ہمارے تمام تر نشیب ہمیں پاکستان ہی میں پیش آ گئے تھے اور بیرون پاکستان ہم نے فرازوں کے سوا کُچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن آج نشیبوں والی سرزمین کو لوٹتے ہوئے ہمارا دِل وُہ فرحت محسوس کر رہا تھا جو لندن، پیرس اور تہران کے جملہ فراز پیدا نہ کر سکے تھے۔۔۔۔ وطن سے ٹوٹ کر پیار پردیس ہی میں آتا ہے۔ سو ایک عالمِ شوق میں اُڑتے رہے ،اُڑتے رہے تا آنکہ وُہ لمحہ آیا جب ارضِ پاکستان پر ہماری پہلی نگاہ پڑی اور بے اختیار ہمارے مُنہ سے اسی مفہوم کی دُعا نکلی جسے بعد میں شاعر نے الفاظ اور مغنّی نے آواز بخش کر پاکستانی دِلوں کی دھڑکن بنا دیا:

سوُہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے[١٣٦]

---

[١٣٦] ١٩٧٣ء کا مقبولِ عام نغمہ